فرقت کاکوروی
غالب خستہ کے بغیر
مکتبہ شاہراہ دہلی

غالبِ خستہ کے بغیر

غلام احمد فرقتؔ کاکوروی

ناشر

مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی ۶

بار اوّل : ایک ہزار
قیمت : سات روپے
تاریخ اشاعت: ۲۲ر فروری ۱۹۶۹ء
سے ۲۲ر فروری ۱۹۷۰ء تک

مطبوعہ: خواجہ پریس دہلی ۶

اُردو کے اُن مرحوم و معروف شعراء
اور ادباء کے نام
جو
مرزا غالب کے بعد اپنی اپنی قبروں میں
نمبر پر لگے ہوئے ہیں!

فہرست

مقدمہ

جب اپنی صدسالہ برسی کے سلسلے میں مرزا صاحب کو روسی سائنس دانوں نے دوبارہ زندہ کردیا تو مکتبۂ شاہراہ کے پروپرائٹر میاں شمیم احمد عرف بابو میاں کو شیطان نے انگلی دکھائی اور انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کیوں نہ غالب کی صدسالہ برسی کے سلسلے میں آپ کے ان تمام مضامین کو جو آپ نے مرزا صاحب پر لکھے ہیں، ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے اور اس میں وہ خطوط بھی شامل کر دیئے جائیں جو وقتاً فوقتاً مرزا صاحب آپ کو عالم برزخ سے بھیجتے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ کام تو بہرصورت مناسب ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ مضامین اور خطوط فراہم کیسے کئے جائیں کیونکہ نہ تو ان کی کوئی نقل میرے پاس موجود ہے اور نہ ہی مجھے یہ یاد ہے کہ وہ کن کن رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ یہ کام میں انجام دے لوں گا۔ اور اس سلسلے میں یہ بھی کہا کہ اس کتاب پر مقدمہ خود مرزا صاحب سے لکھوالیا جائے جو سرِ دست بقیدِ حیات ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر مرزا صاحب کی صدسالہ برسی کی کسی تقریب میں مرزا صاحب سے میری ملاقات ہوگئی تو بہرصورت میں ان کے سامنے آپ کی بتائی ہوئی تجویز ضرور پیش کر دوں گا۔ چنانچہ اتفاق سے جب وگیان بھون میں جس وقت مرزا صاحب کی

ڈاکو مینٹری فلم دکھائی جارہی تھی اس وقت مرزا صاحب بھی اسٹیج کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے فلم کو دیکھ دیکھ اپنا سر دُھن رہے تھے۔

چنانچہ جب یہ تماشہ ختم ہوا تو میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری کتاب پر مقدمہ لکھ دیں۔ اس پر مرزا صاحب بولے کہ آپ مقدمے بازی کے چکر میں نہ پڑیئے کیونکہ دو مرتبہ میں اسی مصیبت میں اپنے پچھلے جنم میں مبتلا رہ چکا ہوں۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے دِلّی سے کلکتے تک جانا پڑا! اور بجائے مقدمہ جیتنے کے رُسوائی میرے ہاتھ لگی کیونکہ کلکتے کے دوران قیام میں بہت سے لوگ میرے مخالف ہوگئے اور وہاں ایک اچھے بھلے ہنگامے کی شکل پیدا ہوگئی اور مجھے کلکتے سے دِلّی بیک بینی و دو گوش ہارے ہوئے مقدمے کی شکل لئے ہوئے دِلّی واپس آنا پڑا اور جب بیوی کو اِس کی خبر پہنچی کہ میں مقدمہ ہار کر واپس آیا ہوں تو گھر کے حالات نے ایسی بھیانک شکل اختیار کرلی تھی کہ تین مہینے تک میں گھر کے اندر قدم نہیں رکھ سکا تھا۔ چنانچہ باہر کی بیٹھک میں نشہ پانی سے فارغ التحصیل ہولیا کرتا تھا۔ لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ بھی اس مقدمے بازی کے چکر میں نہ پڑیں، ورنہ اس کے بعد آپ کی شکل بھی میری جیسی ہوکر رہ جائے گی اور آپ گھر سے نکال باہر کیئے جائیں گے۔ آپ ایسا کیجئے کہ میرے انتقال سے دو ایک گھنٹے قبل مجھ سے مل لیجئے تاکہ میں آپ کو اپنا مختصر سا سفرنامہ جو اس دو ماہ کی قلیل مدّت اور زندگی میں میں نے تیار کیا

ہے مجھ سے لے کر اس کتاب میں تقریظ کی شکل میں شایع کردیں
چناں چہ جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی کہ مرزا صاحب کے مرنے میں
چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں تو میں خود مرزا صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوگیا اور انھوں نے جو اپنا مختصر سفرنامہ مجھے دیا وہ ناظرین
کی خدمت میں بطور تقریظ کے پیش کررہا ہوں۔

غالب کا سفرنامہ

اس مختصر سی زندگی کا حال کیا لکھوں جس کی بساط کل سات ہفتے دو دن ہو۔ اور جس کا انجام پھر وہی قدیم مسکن و مدفن ہو، جس میں سو سال زندہ رہا ہوں، جہاں نہ ہوا کا گذر ا ور نہ کوئی شام و سحر۔ بدبختی اور سبز قدمی مہد سے لحد تک میری ہمدرد و دمساز ہے۔

فرقت نصیب ہوں میری تاریکی نصیب
ملتی ہے ایسی شب سے کہ جس کی سحر نہیں

پہلی بار، بارہ سو بارہ میں پیدا ہوا تھا۔ اب مرنے کے پورے سو برس بعد اسیر حیات ہوا ہوں۔ اُس مرتبہ برضائے الٰہی آیا تھا، اس مرتبہ سائنس دانوں کی کرم گستری قالب حیات میں لائی، پہلے جب بنڈے کو چھوتا تھا تو عطر و عنبر کی خوشبو آتی تھی اور اب جب جسم پر ہاتھ دھرتا ہوں تو کافور کی بو آتی ہے۔ پہلے معصوم پیدا ہو کر گنہگار مرا تھا۔ اِس مرتبہ سیاہ کار پیدا ہو کر معصوم جا رہا ہوں۔ معصوم نہ مرتا تو کیا کرتا۔ سات ماہ کے عرصے میں قوی ایسے لے کر پیدا ہوا جن میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی مفقود تھی۔ اگر پہلے جیسے قوی لے کر پیدا ہوتا تو اس دورِ سیاہ کاری میں کیا کچھ نہ کر گزرتا۔ نہ اپنے ناکردہ گناہوں کا صلہ چاہتا۔ نہ کئے ہوئے گناہوں پر اپنے کو مجرم گردانتا۔

جن سیاہ کاریوں اور بداعمالیوں کی جلو میں دوبارہ پیدا کیا گیا ہوں اُن میں کون سی سیاہ کاری ایسی حقیر ہے جس پر جوانیاں قربان کرنے کو دل نہ

چاہے گا۔ مگر حیف غالب مُرد۔

ضعف نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب دورِ حاضر کی نس بندی پر نگاہ کرتا ہوں تو مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہائے جوانیوں کی داد حاصل کرنے کے لئے کیسے کیسے گوشے نکالے گئے ہیں، جس ناند میں جی چاہے مُنہ ڈالیئے اور بے داغ نکل آیئے۔ نہ کوئی گرفت نہ داد و فریاد۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک سچی اور حقیقی آزادی کسے ملی ہے تو میں کہوں گا کہ میرے ملک میں نس بندی کرانے والوں کو جب پچھلے جنم میں صحیح معنوں میں جوان تھا اخلاقی قدروں کو کیا کیا چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ اور مادر زاد سیاہ کاروں پر کیسی کیسی شرافت کی بندشیں عائد تھیں کہ جوانیوں کو کوئی نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بات بات پر بداعمالیوں تک پر بندشیں تھیں جس کے سبب جوانیوں کو گھٹ گھٹ کر رہنا پڑتا تھا۔ اور بہتوں کو عین جوانی میں خودکشی کر کے حرام موت مرنا پڑتا تھا۔ تشدد کی یہ انتہا کہ حرام حلال تک میں فرق۔ بدی اور نیکی تک میں بُعد۔ ہائے جوانی یہ دَور مجھ کو نہ ملا جس میں ہر بداعمالی کو ویسی ہی چھوٹ حاصل ہے جیسی کہ میرے پچھلے جنم میں شرافت کو حاصل تھی۔ اب جب سیاہ کاریوں کی زرخیزی پہ نگاہ کرتا ہوں تو صفی لکھنوی کو یاد کرتا ہوں اور سر دھنتا ہوں

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

مگر...

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش بہ جانِ درویش

ہیں نے اپنے پچھلے جنم میں سیاہ کاریوں اور بداعمالیوں پر جو لیس بندی دیکھی تھی اسی سے گھبرا کر تو کہا تھا کہ:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

اس دور میں اگر اپنے بدلے قوٰی کے ساتھ پیدا کیا گیا ہوتا تو کیا مجال تھی جو اس قسم کی خواہش زبان پر لاتا۔ اور اس طرح کے لغو شعر کہہ کر اپنا وقت عزیز برباد کرتا۔ اس گل و گلزار بداعمالیوں کے عہد میں گوشہ نشین ہونا کفرانِ نعمت کے مترادف ہے اب جو ان بداعمالیوں، رشوت ستانیوں، ذخیرہ اندوزی کو پورے ملک میں کھیلیں بھرتے دیکھتا ہوں اور اپنے اعضا کی بے حسی پر نگاہ کرتا ہوں تو دل ہی دل میں کڑھتا ہوں، چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ ہائے پچھلے جنم میں کیسی کیسی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہوا ہے۔ خدا جہنم واصل کرے اِن اخلاقی قدروں کو جو ادنیٰ سے ادنیٰ گناہ کرنے میں مانع آتی تھیں، اور جوانی میں رچے بسے حوصلوں اور خواہشوں کو داغدار بناتی تھیں، چنانچہ اسی گھٹن کو دُور کرنے کے لئے تو کسی شاعر نے کہا ہے۔

کم سے کم سو دل تو ہوتے عشق میں
رفتہ رفتہ سب کو کھوتے عشق میں

دیکھئے کسی شاعر نے میرے پچھلے جنم اور اس جنم کی تصویر کشی ایک شعر کے دو مصرعوں میں کس خوبی سے کی ہے:

کنجِ قفس میں تھی یہ تمنا قید سے ہوں آزاد کہیں
خوف ہے یہ بے بال و پری میں چھوڑ نہ دے صیاد کہیں

اس شعر کے مصرعِ اولیٰ میں، شاعر نے میرے پچھلے جنم کا ذکر کیا ہے اور کہنا ہے کہ اخلاقی قدروں کی بندشوں میں میری زندگی حقیقتاً قفس کا ایک گوشہ بنی ہوئی تھی۔ اور اس قید و بند سے جوان جہان، تمنائیں اور آرزوئیں ہر

وقت آزاد ہونے کے لئے دستِ بدُعا تھیں تاکہ وہ کھیلیں۔ مگر پوری زندگی تمناؤں اور آرزوؤں پر اخلاقی قدروں کا پہرہ لگا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری آرزوئیں زندہ درگور ہو کر رہ گئیں۔ اور دوسرے جنم کے بارے میں مصرعۂ ثانی میں کہتا ہے کہ اب دوسرے جنم میں جبکہ بغیر سیٹھا ستلی بہتّر سال کا بڈھا پیدا ہوا ہوں۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں عارضی زندگی کو دوام دے کر مجھے روک نہ لیا جائے، کیوں کہ اس بے بال و پری یعنی از کار رفتہ قویٰ کے ساتھ ان پر کشش اور جاذبِ نظر بداعمالیوں کے دور میں کوئی رہ کر کیا کرے گا۔ موجودہ حالات میں میری حیثیت ایک بے بال و پر طائر کی سی ہے جسے صیّاد نے پنجرے سے نکال کر باہر پھینک دیا ہو۔ مقصد یہ کہ جب اعضاء میں ایک معمولی چٹکی اور بگوٹا تک لینے کی صلاحیت نہ ہو تو اس بداعمالی کے دور میں رہنے سے کیا فائدہ۔

حقیقتاً اس پُربہار سیاہ کاریوں کے دور میں بغیر قویٰ کے پیدا کرنا قہرِ خداوندی سے کم نہیں، یہ تو ایسا ہے کہ سیلاب زدہ دریا میں کسی تشنہ دہن کو یہ حکم دے کر کھڑا کر دیا جائے کہ خبردار ایک بُوند بھی حلق سے نہ اُترے

درمیانِ قصرِ دریا تختہ بندم کردئی
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

جس وقت سائنس داں مجھے مصنوعی طریقے پر زندہ کر رہے تھے اور مجھ میں تھوڑا تھوڑا دم بھر رہے تھے اُسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اور مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں میرے ساتھ کوئی سازش تو نہیں ہو رہی ہے اور میرے کندھے پر رکھ کر کسی مقصد کے تحت بندوق تو نہیں داغی جا رہی ہے۔ اس سازش کا انکشاف اس وقت ہوا جب میں نے اس زبان کو جس میں میں نے شاعری کی تھی۔ یوپی، بہار اور حیدرآباد میں تختۂ دار پر کھنچا دیکھا۔

غدر میں حریت پرستوں کو وطن دوستی کے جرم میں پھانسیاں دی جاتی تھیں۔ اور اسی دور میں اُردو زبان کو عوام میں مقبولیت کے جرم میں تختۂ دار پر کھینچا جا رہا ہے۔ اسی لئے اردو داں طبقہ ہمہ وقت گدی پہ ہاتھ دھرے پھرتا ہے کہ نہ جانے کس وقت گدی سے زبان کھینچ لی جائے۔ ایک طرف میری صد سالہ برسی کی دھوم ہے، دوسری طرف اُردو زبان کا چالیسواں اور سوم ہے۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ اکیس لاکھ دستخطوں کو سابق صدر کے پاس لے جانے والا خود صدر ہونے کے بعد بھی اس زبان کے ساتھ انصاف کرنے سے بے بس رہا۔ اور اس کے ساتھ معمولی رعایت کا اعلان کرنے میں بھی بے بس رہا۔ مگر چونکہ دوبارہ وجود میں آنے سے قبل میں اس چال سے ناواقف تھا اس لئے سوچا کہ پیدا ہولو کیا ہرج ہے۔ اسی بہانے دنیا کی دوسری بار سیر ہو جائے گی۔ اور ایک تفریح کی صورت نکل آئے گی۔ پھر جبکہ دوسری مرتبہ بجائے بطنِ مادر کے بطنِ لحد سے پیدا کیا جا رہا ہوں۔ اس لئے پیدا کرنے میں نہ کسی کو تکلیف ہو گی اور نہ اذیت۔ روا روی میں پیدا ہو لوں گا، پھر مرنے کے بعد بھی یہ خواہش دل میں کروٹیں لیتی رہی تھی۔ اور طبیعت یہ شعر گنگنانے لگی تھی:

الٰہی مر کے پھر یہ دیکھنے کو زندہ ہو جاؤں
مرے ماتم میں کس کس نے ہیں پہنے پیرہن کالے

چونکہ اپنی صد سالہ برسی کی تقاریب میں شرکت کا شوق تھا اس لئے پیدا ہوتے وقت نہ رویا اور نہ کسی کی تکلیف کا سبب بنا۔ جس عمر اور جس سن میں مرا تھا اسی طرح سید ھا سادہ پیدا ہو گیا۔ نہ عمر میں فرق آیا نہ قویٰ بدلے، ماں بھی وہی رہی اور باپ بھی نہیں بدلا، نہ حسب نسب میں ترمیم و تنسیخ ہوئی، اور نہ دادا پردادا میں کوئی اکھاڑ پچھاڑ، اسے علی مرتضیٰ کا صدقہ کہوں یا شانِ خداوندی کا کرشمہ کہ سلجھتی تھا سلجھتی رہا۔ شجرۂ نسب میں بھی کوئی فرق نہ آیا ترمیم

صرف اتنی ہوئی کہ میرا دادا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت ہندوستان آیا تھا۔ اور میں دوسرے جنم میں اندرا گاندھی کی عملداری میں حاضر ہوا۔ دادا مرد عکبر الدکے دور میں پیدا ہوا تھا اور میں جنس لطیف کی عملداری میں وارد ہوا۔ دادا نے ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔ اور میں صرف چند روز کے قیام و طعام کے معاوضہ پر تیغ تنہا چلا آیا۔ دادا کے وقت شاہ عالم کے بعد استقال طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا۔ اور اس مرتبہ اندرا کی زندگی میں جو پنڈت نہرو کی بیٹی اور موتی لال نہرو کی پوتی ہیں ہر طرف افراتفری کا دور اور طوائف الملوکی کا شور ہے۔ پہلے جنم میں گورے کالوں کو مارتے تھے اس مرتبہ کالے کالوں کو مار کر داد شجاعت حاصل کر رہے ہیں پہلے گورے کالوں کے خون میں لقمے ڈبو کر کھاتے تھے۔ اور بدیسی سرکار کی طرف سے انعام و اکرام سے نوازے جاتے تھے۔ اور اب کالے کالوں کے خون میں لقمے ڈبو کر کھا رہے ہیں۔ اور اپنی عملداری میں دیسیوں کے ساتھ بدیسیوں کا سا سلوک کر رہے ہیں پچھلے جنم میں عنفوان شباب سے جب شباب میں قدم رکھا تھا تو مرزا نوشہ کہلاتا تھا اب غالب سے آخر تک کچھ بھی بن نہ پایا۔ ہائے کیا بدمستی کا دور تھا جسم میں خرگوش کا خون تھا۔ ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا تھا۔ جوانی کڑی کمان کا ایک تیر تھی۔ سر اٹھا کر کے چلتا تھا۔ اور رہبر سیہ کاری کو عین ثواب تصور کرتا تھا۔ اس مرتبہ کمان بن کر مرا تو کمان ہی بن کر پیدا ہوا۔ اب نوجوانوں کو اخلاقی درس دیتا ہوں۔ بھلا اس طرح کسی نے شیطان کو آیات ربانی کی تلاوت کراتے کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ جب پہلے پیدا ہوا تھا تو فرنگیوں کو کالوں پر سوار دیکھا تھا مگر اب اقلیت کو اکثریت کی ران سواری میں دیکھتا ہوں۔ فرنگی اپنے اقتدار کی خاطر گرگٹ کا سا رنگ بدلتا تھا۔ اور کالوں کو گوروں کی سیاست کا آئینہ دکھاتا تھا۔ اب کانگریس انتخابات کا شو کرتی ہے اور عوام کے سرمایہ سے اپنی تجوریاں بھرتی ہے پہلے راجاؤں راجاؤں میں لڑائی

ہوتی تھی۔ اب اس کی جگہ ہندو مسلم فسادوں نے لی ہے۔ دھوتی یا جلسے پر سوا ہے۔ ہر طرف ایک شور ایک کوا آگو ہا رہے۔ میرے پچھلے جنم میں رذیل رذیل تھا۔ اب شریف رذیل ہے۔ اور رذیل کو رذیل کہنا قانوناً جرم ہے۔ دیکھو تو اس سو برس کے عرصہ میں کیسے زمین و آسماں بدلے ہیں۔

پچھلے جنم میں میں نے جن باتوں کو قصے کہانیوں میں سنا تھا انکو دوسرے جنم میں عملی شکل میں دیکھا۔ سنا تھا کہ ایک اڑن کھٹولا ہوتا ہے جس پر انسان اڑا اڑا پھرتا ہے۔ میں اسکو محض ایک طلسم سمجھتا تھا۔ مگر اس مرتبہ خود اپنی آنکھوں سے اپنی صد سالہ برسی میں باہر کے ملکوں سے لوگوں کو اڑن کھٹولوں پر آتے دیکھ لیا۔ اس اڑن کھٹولے کا نام یاراں طریقت نے ہوائی جہاز رکھ چھوڑا ہے۔ اسکی وضع قطع دہیل مچھلی جیسی ہے جس میں مسافروں کو مال کی طرح مال گودام میں بھر دیا جاتا ہے۔ اور جو جہاں کا مسافر ہوتا ہے وہاں اتار لیا جاتا ہے۔

دوسری بار دنیا میں آ کر جب ادبی دنیا پر نگاہ کرتا ہوں تو سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔ دور دور تک نہ تو کوئی مجروح نظر آتا ہے اور نہ شیفتہ و آزردہ میلوں تک کوئی اس پایہ کا نظر نہیں آتا۔ البتہ کچھ سالک کچھ قہر کچھ اکرام و عرشی اور کچھ سردار جعفری دور پہ غالبیات کا دیا جلائے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ البتہ ہر طرف جو ہے وہ ادب کے مالک و مختار ہیں۔ اس رام غلامی کے دور میں مالک رام کا مجھ پر احسان ملاحظہ ہو کہ اس دور میں بھی انھوں نے قلم کے زور سے میری ذات اور میرے نثر و نظم کے کلام پر وہ غلبہ حاصل کیا ہے کہ لوگ انھیں غالبیات کا امیر المومنین سمجھنے لگے ہیں۔ جب میں عالم برزخ میں تھا تو مجھے میاں عبدالمجید سالک نے میرے کلام کا ایک نسخہ دیا تھا جسے مالک رام نے مرتب کیا تھا۔ اس میں میرے شجرۂ نسب سے لیکر میرے آبا و اجداد تک کئی پشتوں کا حال درج تھا۔ دادا کے نام کے بعد حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو شاید نہ بتا پاؤں میں

صرف اتنا جانتا ہوں کہ علی مرتضیٰ شیر خدا تک میرا سلسلہ نسب گیا ہے۔ اب روزِ قیامت
اگر داورِ محشر کے سامنے میرے آبا و اجداد کے نام دریافت کیے گئے تو میں میدانِ حشر میں
مالک رام کی تلاش کرونگا۔ کیونکہ اگر ایک طرف مالک رام نے مجھ پر احسان عظیم کیا ہے
تو دوسری طرف میں بھی ان سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمکو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا۔"

اپنی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں سوچا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں سے
شاید ملاقات ہو جائے۔ مگر دونوں فریق کی آپس کی سیاسی شکر رنجی کو دعائیں دیجئے کہ
اُن سب سے نہ مل سکا۔ حالانکہ دونوں طرف میرے پرستار اور میرے کلام کے عاشق
زار بستے ہیں۔ وہ جو آپ نے ایک چھوٹی سی نقل سنی ہوگی کہ "لکھ لٹے کوئلوں پر مہر"
سو یہ نقل بھرپور میری صد سالہ برسی پر صادق آتی ہے۔ جس میں لاکھوں روپیہ جمع کر کے
ایک جگہ محفوظ کر لیا گیا۔ اور کسی کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ میری اس عارضی حیات
میں ان تمام اُردو کے ادیبوں سے ملاقات کرا دیتا جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ
میں بکھرے پڑے ہیں۔ کیونکہ اس میں ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو زادِ سفر
دینے کا سوال تھا۔ ظاہر ہے کہ ان مصارف کو کیسے برداشت کیا جاتا۔ میری صد سالہ
برسی میں جتنے عرصے میں دلی میں رہا یہ خبریں سنتا رہا کہ پاکستان والے بھی میری برسی
باقاعدہ طور پر منا رہے ہیں۔ عشق اور جنگ میں سنا کرتا تھا کہ ہر شے جائز سمجھی جاتی
ہے۔ مگر اس کے باوجود پاکستان اور ہندوستان کے معاملے میں یہ بات بھی غلط ثابت
ہوئی۔ ورنہ اگر فریقین کے درمیان رنجشیں تھیں تو میری صد سالہ برسی کے سلسلے میں
دونوں پر کون سے پہاڑ ٹوٹ پڑتے جو دونوں ایک دوسرے سے متفق ہو کر قاعدہ اور قانون
سے دست کش ہو جاتے۔ ہائے کیسا ناخون سے گوشت جدا کیا ہے اس تقسیم نے۔

دلّی میں آکر میں نے یہ بھی سنا کہ پاکستان کے اکثر و بیشتر جرائد نے میرے نمبر نکالے ہیں۔ ہندوستان میں سے کسی نمبری کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ میرے دلی کے قیام میں مجھے اپنا ایک نمبر نذر کرتا۔ غالبیات کے مخلص کارکنوں میں چند ایسے مخلص کارکن بھی نظر آئے جو اگر میں تسلسل کے ساتھ زندہ رہتا تو عارف کے مرنے کے بعد ان کو گود لے لیتا۔ یہاں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ان کے عملہ والے اس سلسلے میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے پیسے سے دست کش ہو کر میرے اخلاص پر تکیہ کیا۔ اور میری ایک مستند ببلوگرافی تیار کر دی۔ جو مدتوں میرے پرستاروں میں ایک صحیفہ سمجھی جائیگی۔ یوں تو میاں امتیاز علی عرشی غلام رسول مہر بھی اس سلسلے میں ہیرے اور جواہرات میں تولے جانے کے قابل ہیں۔ مگر مجھے اس بات کا فرد شکوہ ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ اس زبان کے بولنے والے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں مگر عملاً اردو کی ایسی نس بندی کی جا رہی ہے کہ عجب نہیں جو پچاس سال بعد صرف اس کے بولنے والے رہ جائیں۔ اور لکھنے والے دوا کو بھی میسّر نہ آئیں۔ میری صد سالہ برسی کے سلسلے میں ساری دنیا میں جو تقریبیں اور تجاویز ضبط تحریر میں لائی جا چکی ہیں۔ اب غالبیات کے نام نہاد کارکن جن کا میری ذات سے کم اور میری برسی کے چندے سے زیادہ تعلق رہا ہے اگر چاہیں تو اردو زبان کی لق و دق قبر پر اس کی چادریں بنوا کر چڑھائیں۔ اور قوالوں سے اردو کے مزار پر یہ ٹھمریاں گوائیں جسکے شروع کے بول ہیں:-

بڑے لمبے سفر کو سیّاں گئے رے ۔

فقیر اسد اللہ خاں غالب۔

خطبۂ صدارت

نوٹ۔ (یہ خطبہ اُس وقت پڑھا گیا تھا جب سرزمین احمد آباد میدانِ کربلا نہیں بنا تھا اور یہاں کبھی فساد نہیں ہوا تھا)

جب یہ حبیب الرحمٰن صاحب غزنوی کا خط میرے پاس پہنچا کہ مجھے اُس مزاحیہ مشاعرہ کی صدارت کرنا ہے جو احمد آباد کے لوگ فلسطین کے عرب شہدار کے پسماندگان کی مالی امداد کے لئے کر رہے ہیں تو یقین مانئے کہ میرا بے اختیار دل چاہا کہ امام جامع مسجد سے بقرعید کا خطبہ لے کر پڑھ دوں اور صدارت کی جملہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاؤں بقرعید کا خطبہ میں نے اس لئے پسند کیا کہ ؎

رسمِ دُنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

اور وہ یوں کہ اول تو یہ خطبہ عربی زبان میں ہوگا جو عربوں کی مقدس ترین زبان ہے دوسرے بقرعید سے متعلق ہوگا اور اسرائیلیوں نے عربوں کے ساتھ بھیڑ بکری جیسا سلوک بھی کیا ہے، تیسرے ہندوستان میں ہم بھی ماشاء اللہ فسادات کے ناتے بقرعید والی منزل سے دوچار ہیں اور چوتھے یہ کہ سامعین کچھ نہیں تو احتراماً ہی اُسے سُننے کے لئے بیٹھے رہیں گے۔

پھر اپنے ملک کی سیاست کے پیشِ نظر مجھے یہ خیال آیا کہ دیکھو تو کتنا خراب وقت آلگا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ مارنے پر اُتر آئے ہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کس طرح مستحق کو غیر مستحق اور غیر مستحق کو مستحق قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں ورنہ جنگ کی تباہ کاریوں سے احمد آباد والوں کو کیا واسطہ۔ وہ بیچارے تو ان مظالم کا تصوّر بھی نہ کرسکے تھے جو افسوس کہ اب ہم میں نہیں اور اُنہیں موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا ہے۔

نہیں کر سکتے جو غریبوں پر توڑے گئے ہیں اور تصور کر رہی تھی تو کیسے جب کہ یہ بیچارے آج تک نہ کسی
لڑائی دنگے میں پڑے نہ انہیں فسادات سے کبھی دور کا واسطہ پڑا اور نہ گذشتہ بیس سال سے
انہیں کسی بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کرنے کی توفیق ہوئی لہذا یہ جنگ کے مصیبت
زدگان یا فسادات میں مرنے والوں کے پسماندگان کی مدد کرنا کیا جانیں۔ اس لیے ان کے
سامنے جب امدادی مشاعرے کی تجویز پیش کی گئی تھی تو ان کو چاہیے تھا کہ صاف صاف
کہہ دیتے۔

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں !!

پسماندگان اور مظلومین کی امداد کے سلسلے میں مشاعرہ کرنے کا حق تو انہیں لوگوں کو
پہنچتا ہے جنہوں نے جنگ یا فسادات کی تباہ کاریاں دیکھی ہوں مرنے والوں کی چیخیں
سنی ہوں بے گناہ اور معصوم بچوں کو دم توڑتے دیکھا ہو یا باعزت عورتوں کی عصمت
دری کا مشاہدہ کیا ہو۔ بھلا انہیں سینہ تان کر جلوسوں میں شامل ہونے کا حق کہاں سے
پہنچتا ہے۔ ایسے امدادی مشاعرے کرنے کا حق تو کلکتہ، جبل پور، رانچی، مالیگاؤں،
سری نگر اور گوونڈی، کھمبھات وغیرہ کو پہنچتا ہے جو ماشاء اللہ اس قسم کے مظالم برداشت کیے بیٹھے ہیں
یا پھر اس کا حق ان ہزاروں شہروں، قصبوں اور بستیوں کو پہنچتا ہے جو گذشتہ بیس
سال سے ان مقدس تجربات سے گذر چکی ہیں۔ آپ کون ہوتے ہیں اس قسم کے امدادی
مشاعرے کرنے والے جب کہ آپ نہ تو ظالموں میں ہیں اور نہ ان کے اونٹوں میں۔ ہاں!
رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، جنتا کا پیٹ کاٹ کے اپنے پیٹ بھرنے کے سلسلے میں
اگر آپ کوئی مشاعرہ کرتے تو وہ کسی حد تک آپ کے شایان شان ضرور ہو سکتا تھا کیونکہ
اس میں ماشاء اللہ ہمارے ملک کا گوشہ گوشہ برابر کا شریک ہے اور اس سلسلے میں بلیک
کرنے والے دامے درمے سخنے آپ کی مدد کرتے اور آپ کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی
کرتے۔ اب اگر آپ یہ کہیں کہ صاحب! ہم تو انسانی ہمدردی کے ناتے غریبوں کی مدد

کر رہے ہیں۔ تو یہ بات بھی اصولاً غلط ہوگی کیونکہ اس دورِ ابتلا میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہمدردی کرنا کیا معنی؟ جب کہ اس درخشندہ دور میں انسانیت اور شرافت ایک سنگین جرم بن چکی ہے۔ اور آپ ہیں کہ اخلاق ہمدردی انسانیت اور بھائی چارے کا درس دے رہے ہیں جب کہ چاہت کا چلن دنیا سے اُٹھ چکا ہے۔

چاہ مت ڈھونڈ۔ چاہ کے بدلے
یہ چلن اُٹھ گیا زمانے سے

آپ کو نہیں معلوم کہ پرانی قدروں کی جگہ اب نئی قدروں نے لے لی ہے۔ اب اہنسا کا نام جبر و تشدد اور قتل و غارت گری پڑ گیا ہے۔ ہمارے ملک کا نظام بھی اب شروع سے آخر تک خالص سیکولر بن چکا ہے جس کا دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا اگر خدانخواستہ آپ کے اس مشاعرے میں کسی دینی نیت کو دخل ہے تو آپ تالاب میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کر رہے ہیں اور لادینیت کے ڈانڈے دین سے ملانے دے رہے ہیں آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ

رپٹ لکھوائی ہے اغیار نے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مجھے حد درجہ رونا تو آپ کی لاعلمی کا ہے کہ آپ گذشتہ بیس سال سے آزاد چلے آرہے ہیں مگر آج تک آپ اپنی آزادی کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکے۔ درحقیقت آپ کی آزادی دنیا کی تمام آزادیوں سے مختلف ہے اور سچ پوچھیئے تو آپ کو صرف بلیک مارکیٹنگ کی آزادی ملی ہے، گرانی اور رشوت ستانی کی آزادی ملی ہے، ذخیرہ اندوزی اور ملت فروشی کی آزادی ملی ہے۔ اخلاقی قدروں سے بے نیازی فسادات اور عہدہ پرستی کی آزادی ملی ہے۔ لہٰذا آپ کو کوئی ایسی حرکت نہ کرنا چاہیئے جس پر دنیا ہنسے۔ آپ اس ملک میں آل انڈیا پیمانے پر مزاحیہ مشاعرہ کرنے چلے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں بیس سال سی خوشی اور

مسرت کی نس بندی کی جا چکی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارا ملک ایک حسین اور سنجیدہ ملک ہے۔ ہم ہر چیز کو اس کی حدود میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ آزادی پاتے ہی جب جنتا مارے خوشی کے اپنے سے باہر ہونے لگی تو ہم نے اُن تمام چیزوں کی نس بندی کردی جو خوشی کا سرچشمہ بنی ہوئی تھیں۔ تاکہ دنیا والے ہم کو پھکڑباز نہ کہہ سکیں۔ لہذا سب سے پہلے ہم نے ارزانی کی نس بندی کی اور جب خوشی اور مسرت سے دست کش ہو کر جنتا آبادی بڑھانے پر اُتر آئی اور اس نے ایک نیا دھندا شروع کر دیا تو ہم نے آبادی کی نس بندی شروع کردی اور چونکہ بڑھتی ہوئی آبادی کا تعلق پرانی اور فرسودہ قدروں یعنی آداب و اخلاق دیانت داری اور ثقافت سے تھا۔ اس لئے ہم کو سب سے پہلے اُس زبان کی نس بندی کرنا پڑی جس کی آغوش میں یہ ساری قدریں پروان چڑھ رہی تھیں۔

دوستو! آج کچھ لوگ ہم پر یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ ہم یا ہماری حکومت خدا ناکردہ اُردو کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کر رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ ہماری سیاسی مجبوریوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہماری باپ دادا کی تہذیب کو آوارہ گردی پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی۔ بھلا ہم ایک ایسی جوان جہان زبان کو اپنے سینے سے کیسے لگا لیتے؟ جس کی ولدیت تک مشکوک ہو مگر اس کے بعد بھی ہماری رواداری اور شرافت ملاحظہ ہو کہ ہم نے اسے آپ برابر کی چودہ زبانوں میں جگہ دیدی اور چودھواں نمبر اس لئے دیا کہ وہ عوام میں چودہ سالہ قتالہ معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس نے سماشما میں جوانی کی راتیں گذارنا شروع کر دیں اور حبنلنے چلانا شروع کر دیا ہے

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

بھلا ایک میلہ گھمی زبان جس کو کسی ایک گھر میں قرار نہ ہو جس کی حرکات و سکنات سے دیس کا بچہ بچہ واقف ہو اور جس کی یاد اللہ بیرونی ممالک کے رہنے والوں سے ہو اسے

ہم اپنی بہو بیٹی کیسے بنا لیتے اگر بٹھاتے بھی تو وہ پچھلی پیری کب بیٹھنے والی تھی لہذا ہم نے اسے نکال باہر کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ہم کو تو اپنے آزاد دیس کے لئے ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو صرف ہماری گود میں پلی بڑھی صرف ہمارے رسم و رواج سے واقف ہو شریف زادیوں کی طرح اپنے کنبے ناتے والوں ہی کو جانے اور اس کی آواز اگر ہمارے ملک کے مکان کی چار دیواری سے باہر جائے بھی تو باہر والا کچھ نہ سمجھ سکے۔ پھر اس سبز قدم کی نحوست دیکھئے کہ اس نے کم سنی ہی میں ایسے ہاتھ پاؤں نکالے اور آوارہ گرد اور اوباش شاعروں سے اپنے تعلقات پیدا کیے جس کے سبب ہماری گردنیں شرم و حیا سے جھک گئیں۔ کم سنی کے زمانے میں ایک آبرو باختہ شاعر نظیر اکبر آبادی نے اسے ننگا کیا، جس نے ہمارے سماج اور ہمارے دیس کے سارے رسم و رواج، سارے تہوار، ساری مذہبی تقریبات اور سارے رشیوں منیوں کے کارنامے اور دلیروں کی بہادری سمو کر اس کے چہرے پر ایسا ہندوستانی سماج کا غازہ ملا اور اس کی مانگ میں ایسا سیندور بھرا کہ عوام میں اس کا طوطی بولنے لگا۔

اس کے بعد انشاء، آرزو لکھنوی اور علی عباس حسینی نے تو حد ہی کر دی کہ اس کو خالص ہندوستانی کا لباس پہنا کر اور دیس کے گیت اور بھجن لفظوں کی اوڑھنی اڑھا کر جنتا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ گاندھی جی جیسے جہاندیدہ بزرگ بھی اس کے گرویدہ ہو گئے اور آزادی سے قبل انہوں نے اعلان کر دیا کہ آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان بننے کی صلاحیت صرف ہندوستانی یعنی خالص اردو ہی میں ہے۔

کہیے اگر آپ اسے چھوٹا منہ اور بڑی بات نہ کہیں تو میں کہوں گا کہ بھلا یہ بات منہ سے نکلنے والی تھی چنانچہ آزادی کے بعد بہار، یوپی، راجستھان کو تو چھوڑئیے یہ جیتی مکھی آل انڈیا کانگریس سے بھی نہ نگلی گئی اور اس نے مہاتما جی کی اس تجویز کو ایک بوڑھے کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور یوپی اور بہار والوں میں وہ تھڑی تھڑی مچی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ جو اخبارات اور رسالے خود اس زبان کا دیا کھاتے تھے۔ انہوں نے زمین اور آسمان

سر پہ اٹھا لیا ــــ اسی زبان میں اشتہارات، پوسٹر اور پمفلٹ چھاپ چھاپ کر اس کی ایسی آبرو ریزی شروع کر دی کہ اس کے حمایتیوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے مگر واہ ری بے غیرت اس کے ماتھے پر کسی نے آج تک بل آتے نہیں دیکھا۔ گونگی بہری بنی سب کی سنتی رہی اور زبان سے ایک حرف نہ بولی۔ مگر نہ جانے کس سے کہتی تھی کہ میں اپنی فریاد داور محشر کے سامنے لے جاؤں گی اور فلاں وزیر، فلاں صدر اور فلاں پردھان منتری کی شکایت کروں گی اور ان کی بخشش میں روڑے اٹکاؤں گی۔

ارے جا جا مقدر پیٹی ہم نے بڑوں بڑوں کو دیکھ لیا۔ جب اپنے گھر اور اپنی زبان کے معاملے میں ہم نے مہاتما جی جیسے دیش بھگت کو نہیں بخشا تو تو کس کھیت کی مولی ہے۔ اسی لئے آزادی ملتے ہی ہم نے اس کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے اور اتنا گہرا دفن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ پھر یہ کروٹ بھی نہ لے سکے۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔ اگر ہم کسی نجیب الطرفین زبان کے ساتھ بد سلوکی کرتے جس کا حسب نسب ٹھیک ہوتا جو کسی ایک کے گھر بیٹھ کر شریف زادیوں جیسی زندگی گذارتی تو بے شک دنیا ہم پر انگشت نمائی کرنے میں حق بجانب ہوتی ہم تو اس زبان کو دیس نکالا دے رہے ہیں جو لم یلد ولم یولد قسم کی زبان ہے۔ جس کے نہ باپ کا پتہ نہ ماں کا۔ جس کے بارے میں یہ تک نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں اور کب پیدا ہوئی؟ کس نے اس کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا کس نے اس کو قوس قزح کی رنگینی اور دلوں کو موہ لینے کی شان عطا کی۔ کس نے اس میں کشش اور جاذبیت پیدا کی؟ کس نے اس کو دلربائی اور دل نشینی بخشی؟ آپ اگر اس کے بڑے سے بڑے عالم اور بڑے سے بڑے محقق سے پوچھیں کہ اس کو کس نے بنایا تو وہ ہما شما کی طرف دیکھنا شروع کر دے گا اور عوام پر اس کی نظریں گڑ جائیں گی۔ اس کی نہ تو کوئی ولدیت ہے اور نہ گھر بار۔ نہ کوئی علاقہ ہے نہ جاگیر۔ چھچھوری اس بلا کی کہ آج اس کا گھاٹ، کل اس کا گھاٹ۔ آج اس ناند میں منہ ڈالا کل اس ناند میں۔ نہ اپنے تن بدن

کاموش نہ کپڑوں لتوں کی پروا پاؤں میں سنیچر۔ آج یہاں کل وہاں جدھر دیکھو موجود۔ مان
نہ مان میں تیرا مہمان نہ دوست دشمن کی تمیز آئے گئے کا پاس لحاظ۔ بے غیرت ایسی
کہ ایک چار چوٹ کی مار دیجئے پر چپ نہ منہ نہ لیوے نہ سر سے کھیلے۔ ظالم اور مظلوم دونوں
کی زبانوں پر چڑھی اور پھر اس بلا کی چٹکارن کہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے آگے اپنا کاسہ
لئے کھڑی اللہ کی راہ میں اور اپنی جوانی کے صدقے میں کچھ دے دو جیسی گھر جس زبان اور
جس تہذیب کے سامنے اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اُس نے اس کے کاسے میں کچھ نہ کچھ ڈال دیا
اور صدقہ خیرات اور فطرہ میں لیتی رہی۔

دیکھئے تو بات اردو کی میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور سرزمین احمدآباد کا تقدس
ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا یہ وہی سرزمین ہے جس کے رہنے والوں نے آزادی وطن کی راہ میں
اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ یہ وہی سرزمین ہے جس کے ذرات نے شہید النساء
دیا تھا گاندھی اور سردار سرے محبان وطن کی تقریریں دیکھیں جس کی فضاؤں میں برطانوی شہنشاہیت
کے خلاف آج بھی وہ نعرے محفوظ ہیں جس کی پاداش میں انہیں دار و رسن سے دوچار ہونا
پڑا۔ آج اسی مقدس سرزمین پر ہم آپ ان عرب شہداء کے پسماندگان کی امداد کے لئے
جمع ہوئے ہیں جن پر امریکی اور برطانوی حکومتوں نے اسرائیلیوں کی آڑ لیکر ایسے مظالم
کئے ہیں کہ دنیائے انسانیت کانپ اٹھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرزمین احمدآباد کے
رہنے والے اس امدادی فنڈ میں زیادہ سے زیادہ چندہ دیکر ایک ایسی تاریخی روایت
قائم کریں گے جو اس تاریخی شہر کے شایان شان ہوگی اور اس سلسلے میں ہونے والے
مشاعرہ میں شریک ہونے والے شعرا آپ کو ایسے تاریخی قہقہے لگانے پر مجبور کریں گے
جنہیں گذشتہ بیس سال سے آپ بھولے ہوئے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اس مشاعرے کے افتتاح کی دعوت دیتا ہوں اور اس
قطعہ پر اپنا خطبہ ختم کرتا ہوں جو برطانیہ کے بی بی سی ریڈیو کی شان میں میں نے

کہا ہے ؎

رانڈ ہونے پہ بھی مسند پہ جمی بیٹھی ہیں
تلملاتی ہوئی کھٹّے سے تنی بیٹھی ہیں
ڈپلومیسی کا یہ صدقہ ہے کہ جس کے بل پر
آج لندن میں یہ بی بی سی بنی بیٹھی ہیں

اُردو اور مرزا غالبؔ

کفن کھسوٹوں کے نرغے میں

مرزا صاحب : اماں میر صاحب ! آج تو تمہارے قہقہوں کی آوازیں قسم قرآن کی رکاب گنج کے چوراہے تک سُنائی پڑ رہی ہیں۔ ایسی خیریت تو ہے"

میر صاحب : اماں ہنسی مجھے اس بات پر آرہی ہے کہ ایک طرف نسل بندی ترقی کر رہی ہے۔ دوسری طرف گرانی اور تیسری طرف چندے بازی کا زور ہے۔

مرزا صاحب : اماں میر صاحب چندے بازی کی نہ کہو، گلی گلی اور کوچے کوچے مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھڑائی جارہی ہے۔

میر صاحب : ہاں غالبؔ کو مرے ہوئے لگ بھگ کوئی سو سال ہونے کو آتے ہیں مگر............

مرزا صاحب : مگر کیا بھائی ! بات یہ ہے کہ اب ان کو سو سال کے بعد قبر کھود کر نکالا بھی تو گیا ہے۔ الیکشن لڑنا ، کوئی مذاق تھوڑے ہے۔

میر صاحب : بھئی سنو ! ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد آزادی کے نام پر ووٹوں کی بھیک مانگی گئی۔

اس کے بعد گاندھی جی شہید کر کے ان کے نام پر جلیبیں بھری گئیں اس کے بعد جواہر لال، اور پھر لال بہادر شاستری کے نام پر ووٹ حاصل کیے گئے اور اب قبر پہ کھود کھود کر گڑے

مُردے اکھاڑے جائیں گے۔ اسی واسطے درمیانی مدت کے الیکشن سے پہلے مرزا صاحب کا کفن کھسوٹا جا رہا ہے۔

مرزا صاحب: اماں میر صاحب! ہندوستان میں ایک بادشاہ محمد بن تغلق گذرا ہے۔ اس کے یہاں محل کے ایک دروازے پر لوگوں کے سر قلم کئے جاتے تھے اور دوسرے پھاٹک پر خلعتیں اور انعامات تقسیم ہوتے تھے۔ وہی کام آج بھارت میں اُردو زبان کے ساتھ ہو رہا ہے۔

میر صاحب: یہ کیسے؟

مرزا صاحب: ارے بھئی وہ ایسے کہ اُردو زبان کو تو جگہ جگہ ذبح کیا جا رہا ہے اور اس کے ایک شاعر کو ٹکٹکی پر چڑھا کر اُس کی ۲۰۰ سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔

میر صاحب: یعنی کہ ؎

خود قتل بھی کرے ہے خود لے ثواب اُلٹا

مرزا صاحب: اور کیا۔ مجھے ہنسی اسی بات پر تو آ رہی تھی کہ ایک طرف اُردو بولنے والوں کو تو ختم کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اس کے ایک شاعر کو پکڑ کر اس کے نام پر ایک ہال تعمیر ہو رہا ہے اور دہلی میں اس کے نام پر ایک بین الاقوامی لائبریری بنائی جا رہی ہے۔ جب زبان ہی نہ ہوگی تو اس پر تحقیق کرنے والے کہاں سے آئیں گے؟

میر صاحب: بھئی دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے ایک شو روم کیا بُرا ہے؟ اماں میں کہتا ہوں کہ یہ لاکھوں روپیہ جو مرزا صاحب کے نام پر وصول کیا جا رہا ہے وہ سب جائے گا کہاں؟

مرزا صاحب: وہیں جائے گا جہاں اس ملک میں جو غلے کی زبردست فصل ہوئی تھی اس کا غلہ گیا یہاں تو قدم قدم پر ڈنڈی ماری جا رہی ہے۔ اور اب جو تم نے کہا کہ یہ روپیہ کہاں جائے گا تو اس کا یہ حشر ہونے والا ہے کہ دلّی میں ایک گلی قاسم جان ہے اس کے گرد و پیش جو مکانات ہیں۔ انھیں مکانوں میں سے ایک مکان میں مرزا غالب رہتے تھے اب ہوگا کہ یہ کچھ روپیہ لگا کر اس کے گرد و پیش کے علاقے اور اس مکان کی جس میں مرزا غالب رہتے تھے

مرمت ہو گی۔ اور اس کے مختلف گوشوں کے نام مرزا صاحب کے نام پر رکھے جائیں گے۔ مثلاً مرزا صاحب جس مقام پر نہاتے تھے اس کا نام "غالب حمام" قرار دیا جائے گا۔ جس مقام پر وہ تہمد باندھتے تھے اس کا نام غالب ڈریسنگ روم رکھا جائے گا۔ جس جگہ وہ شراب پیتے تھے اس کا نام "غالب بار" یا "میکدۂ غالب" رکھا جائے گا کہو قسم خرچ ہو رہی ہے یا نہیں اور پھر یہ تمام خرچہ لاکھوں میں دکھایا جائے گا اور اسی طرح اکبرآباد میں جس مقام پر مرزا رہتے تھے اس مکان پر بھی کچھ پیسہ خرچ کیا جائے گا۔ یار اگر اتنا بھی ہو جائے تو بہت ہو۔ ذرہ بیماری نمیرہ ختم ہو جائیگی۔

میر صاحب: یار اتنا روپیہ جو فروری ۱۹۶۹ء تک جوڑا جائے گا۔ اس سے تو ایک اچھی بھلی اُردو یونیورسٹی قائم ہو سکتی ہے۔ تو ان سے کوئی کہے کہ اگر راجدھانی میں نہیں تو اکبرآباد ہی میں جہاں غالب پیدا ہوئے تھے ایک یونیورسٹی بنوا دو تاکہ اُردو میں بی۔ ایچ۔ ڈی کئے ہوئے نوجوان جو ادھر اُدھر پڑے سڑا ہوا ئی جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں وہ کہیں روزیوں سے لگ جائیں۔

مرزا صاحب: اماں جاکر کلّی کرو۔ کیسی بے ہودہ بات زبان سے نکال رہے ہو اماں عثمانیہ یونیورسٹی کی شدھی ہو گئی۔ جو اُردو کی خاص الخاص یونیورسٹی تھی۔ حال ہی میں اس کی جوبلی منائی گئی اور اس موقعہ پر ہندی اور انگریزی میں ٹکٹ جاری کئے گئے اور اب تم چاہتے ہو کہ اس کی جگہ کوئی اُردو یونیورسٹی قائم کی جائے اور اس سے اُردو کا کلمہ پڑھوایا جائے۔ اماں میر صاحب گھاس تو نہیں کھا گئے ہو۔ خدا خدا کرو۔ اب کہہ دی ایسی بات زبان سے نکالی لیکن آئندہ کسی چندہ بٹورنے والے کانگریسی لیڈر سے ایسی بات نہ کہہ دینا۔ ورنہ قسم قرآن کی جس طرح اُردو والوں کی گدّی سے زبان کھینچی جا رہی ہے تمہاری زبان بھی کھینچ لی جائے گی۔

میر صاحب: مگر مرزا صاحب میں نے تو سنا ہے کہ یوپی میں اُردو زبان کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہاں کوئی لاٹ صاحب ایسے آئے ہیں جو اُردو زبان کے عاشقوں میں ہیں اور اُردو والوں کو بڑی تسلیاں اور دلاسے دیتے رہتے ہیں بلکہ انہوں نے پچھلے ستمبر کے انگریزی اور ہندی گزٹ کے ساتھ ساتھ اُردو کا گزٹ بھی نکلوا دیا ہے۔

مرزا صاحب: ابھی فروری اور مارچ تک جب تک درمیانی مدت کا الیکشن نہ ہو جائے دیکھو اُردو والوں کو کیسے کیسے سبز باغ دکھائے جاتے ہیں تم گرمٹ کہتے ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ خبر ہے کہ اب وہاں کی عدالتیں ہندی اور انگریزی کے ساتھ اُردو کی درخواستیں بھی لیا کریں گی اور یہ سب الیکشن جیتنے اور اُردو زبان والوں سے کانگریس کو ووٹ دلانے کی باتیں ہیں۔ تیل دیکھو تیل کی دھار۔ ہم تب جانیں جب اُردو وال طبقے کے ممبروں کو یہ اُردو میں حلف لینے دیں۔

میر صاحب: ہاں مرزا کچھ مجھے بھی دال میں کالا نظر آ رہا ہے ورنہ لکھنؤ میں جو خاص الخاص اُردو بولنے والا شہر ہے۔ وہاں کوئی لڑکیوں کا بی۔ اے تک کا کالج ہے۔ جس کا نام نگر گت شکشا ہے اس میں ساٹھ ستر مسلمان لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہاں کی مسلمان لڑکیوں نے جب وہاں کی ہیڈ مسٹرس کو درخواست دی کہ ہم کو اُردو کا مضمون لینے کی اجازت دی جائے تو وہاں کی ہیڈ مسٹرس صاحبہ نے جواب دیا کہ اگر اُردو لینا ہو تو کوئی دوسرا کالج تلاش کرو یہاں نہ تو اس نام کا کوئی مضمون لیا جا سکتا ہے نہ اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اس پر سنا ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک اُردو کے معلم نے ہیڈ مسٹرس صاحبہ سے کہا کہ میں بلا کسی معاوضہ کے کالج ختم ہونے کے بعد لڑکیوں کو اُردو پڑھا دوں گا تو اس کے لئے بھی انکار کر دیا گیا۔ کہو مرزا صاحب وہ دعوے کہاں گئے کہ دس طلبا سے زائد لڑکے جس اسکول یا کالج میں اُردو پڑھنے والے ہوں گے وہاں اُردو کے معلم کا انتظام کر دیا جائے گا؟ اماں جھوٹے کو گھر تک پہنچانا اسے نہیں کہتے تو پھر کسے کہتے ہیں؟

مرزا صاحب: اماں اس سے زیادہ مزیدار اور ڈال کی ٹوٹی خبر مجھ سے سنو۔ یہ جو غالب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑائی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سنا ہے کہ اُردو زبان کو ترقی دینے کے لئے ایک کروڑ روپیہ کی منظوری ہوئی ہے۔ اور اس ایک کروڑ دینے کا ٹھیکیدار کشمیر کی حکومت کو بنایا گیا ہے۔ کیوں کہ وہاں سرکاری زبان اُردو ہے۔ اور اس کو سننے میں کہ یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی جس یونیورسٹی یا ادارے کو مناسب سمجھے اس رد دیئے

میں سے جتنی رقم چاہے دے۔ اور وہاں باوجود سرکاری زبان ہونے کے ایم۔ اے کے دو جموں میں دو چار طالب علم جموں میں اور چار چھ سری نگر میں ہیں۔ بقیہ وہاں کے لوگ کشمیری بولتے ہیں اور اُردو کے مقابلے میں کشمیری زبان پسند کرتے ہیں لہٰذا یہ ایک کروڑ روپیہ بھی نہ ملنے کے برابر سمجھو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کانگریس کو حقیقتاً اردو سے دوستی کا دعویٰ تھا تو اسے چاہئے تھا کہ یہ رقم اُردو کی سجادہ نشین انجمن ترقی اُردو کو دیتی تاکہ اس رقم کا کوئی جائز صرف ہوتا۔ مگر وہاں تو مقصد یہ ہے کہ اس رقم کا کوئی جائز صرف نہ ہوئے اور اگر اس بدنصیب اُردو زبان کو زہر دیکر نہیں مارا جاسکتا تو گڑ دیکر مارا جائے۔ اسے کہتے ہیں، حجامی نمائی حجامی زنی۔

میر صاحب: حضور والا یہ سارے پاپڑ اُردو داں طبقے کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے بیلے جا رہے ہیں۔ اس کا اُردو سے کیا تعلق! اگر اس کے بعد یو۔ پی میں درمیانی مدت کا الیکشن لڑنا نہ ہوتا تو بھلا اس طرح ایک کروڑ روپیہ اس کے نام پر نکلتا۔

مرزا صاحب: اماں میر صاحب! واللہ اُردو کے معاملہ میں ہم نے تو جس کی دُم اُٹھا کر دیکھی وہ ہم کو مادہ ہی دکھائی پڑا۔ چنانچہ یہ نئی پارٹی اچھوتوں نے ابھی پچھلے الیکشن کے وقت بنائی تھی اور جس کے لیڈر اُردو داں طبقے کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے "اُردو کا حق" "اُردو کا حق" چِلّاتے پھرتے تھے۔ اس کے متعلق ایک اخبار نے لکھا ہے کہ یو۔ پی میں جو درمیانی مدت کا الیکشن ہونے جا رہا ہے اس کے ممبروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں جتانے کے لئے اس نے کانگریس سے جوڑ توڑ شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ جن بارہ شرائط کو اس نے کانگریس کے سامنے رکھا تھا اُس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اُردو کو یو۔ پی کی ثانوی زبان بنایا جائے۔ چنانچہ سُنتے ہیں کہ کانگریس نے اُردو کو یو۔ پی کی ثانوی زبان بنانے والی شرط کو نکلوا کر بقیہ گیارہ شرطیں مان لیں۔ اور اب سنتے ہیں کہ یو۔ پی کا درمیانی مدت کا الیکشن یہ دونوں جماعتیں مل کر لڑیں گی تاکہ گدیاں ہاتھ سے نہ نکلنے پائیں، اور ری پبلکن پارٹی نے بھی کانگریس کے دوش بدوش الکشن لڑنے کا معاہدہ کر لیا ہے۔ اور یہ تحریک بنارس کے اُن صاحب نے پیش کی تھی جو

لکھنوی اُردو دستہ والوں کی اُردو کو ثانوی زبان بنوانے کی تحریک میں پیش پیش تھے، بلکہ اس کی ستیہ گرہ میں بھی شریک تھے۔

میر صاحب: بھئی مرزا صاحب! یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری کانگریس نس بندی کے تمام گرُوں سے واقف ہے۔ مگر یار ابھی تک یہ اچھی طرح گرہ باندھ نہیں پا رہی ہے۔ اسی وجہ سے گرہ کھُل کھُل جاتی ہے۔

مرزا صاحب: تو میر صاحب، یہ جو ہماری کانگریس کی طرف سے اُردو سے متعلق صوبوں کے نام سرکلر جاری ہوتے ہیں وہ کہاں جاتے ہیں؟

میر صاحب: بھئی ان احکامات کو سال بھر تک جمع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یاران طریقت ردّی میں بیچ کر دام کھرے کر لیتے ہیں۔ اور بنئے سب سے کم دام اسی ردّی کے دیتے ہیں۔

مرزا صاحب: بھئی میر صاحب، ایسے ہی اوقات میں تو دل چاہتا ہے کہ کاش بنئے پیدا ہوتے۔ واللہ میر صاحب، اگر اس وقت کسی تکڑم سے غالب کو پیدا کرا دو تو مزہ آجائے۔

میر صاحب: اماں پیدا ہوتے ہی دوسرے دن گھی اور شکر کا بھاؤ سنکر ان کا انتقال ہو جائے اور جس دن اُن کو یہ معلوم ہو کہ اُردو زبان کی نس بندی اس طرح سے کی گئی ہے کہ یو۔ پی میں مسلمان گھرانوں میں لڑکے اور لڑکیاں خدا اور رسول کو بھول کر اب بھگوان اور رام کی قسمیں کھانے لگی ہیں، اسی روز ان کو لقوئی مار جائے گا اور ساری زبان دانی دھری کی دھری رہ جائے گی۔

مرزا صاحب: اور میر صاحب، تم نے یہ نہیں دیکھا کہ سوائے رشوت ستانی، بے ایمانی اور ذخیرہ اندوزی کے تمام چیزوں میں وہ چھوت چھات ہے کہ خدا کی پناہ۔ ابھی پرسوں ایک حلوائی کی دوکان سے میں مٹھائی خرید رہا تھا۔ گرم گرم گلاب جامنیں بن رہی

تھیں۔ چنانچہ گلاب جامنوں کے قریب ہاتھ لیجا کر میں نے اُنگلی سے اشارہ کیا کہ یہ دو تین گلاب جامنیں بھی رکھ دو۔۔۔ اس پر حلوائی آپے سے باہر ہو کر بولا۔ ہٹ کر کھڑے ہو میاں جی، اگر ہاتھ لگ گیا تو ساری مٹھائی کے دام دینا پڑیں گے۔ میں نے کہا یار! کیسی باتیں کر رہا ہے۔ ملک میں چھوت چھات کے خلاف قانون بنا ہوا ہے اور تو اس کے خلاف باتیں کر رہا ہے۔ بولا جس نے قانون بنایا ہے اس کی مٹھائی میں جا کر ہاتھ لگاؤ۔ ہم قانون والوں کو نہیں مانتے۔ اب تو لاقانونیت کا زمانہ ہے۔ وہ قانون والوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔

میر صاحب: بھئی عجیب اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ میرزا صاحب، وہ عورتوں میں جو مثل ہے نہیں: چوہی گنتیا جلیبیوں کی رکھوالی۔ اب اُسی مثل پر عمل ہو رہا ہے چنانچہ سُنا ہے کہ طلبا کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ریلوں میں مسافروں کے ٹکٹ چیک کیا کریں۔ تو اب طلبا کے مزے ہی مزے ہیں۔ وہ ٹھاٹھ سے بلا ٹکٹ ریل کا سفر کریں گے اور جب اُن سے کوئی ٹکٹ طلب کرے گا تو اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹنا شروع کر دے گا۔

مرزا صاحب: جزاک اللہ، بھئی کیسے کیسے انتظامی گوشے نکل رہے ہیں۔

میر صاحب۔

میر صاحب: اُس سے زیادہ دلچسپ بات مرزا صاحب یہ ہے کہ فرض کرو، میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہوں اور خُدا، رسولؐ اور قرآن پر میرا ایمان ہے لہٰذا جب میں کسی بات کی قسم کھاؤں گا تو اپنے ہی مذہب کی رُو سے اپنی ہی زبان میں تو کھاؤں گا۔ مگر اب اگر تم چاہو کہ کسی بات پر حلف اُٹھاؤ یا قسم کھاؤ تو اُردو زبان میں نہ تو حلف اُٹھا سکتے ہو اور نہ قسم کھا سکتے ہو، چنانچہ تم نے اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ بنارس کارپوریشن میں جب مسلمان ممبروں نے اُردو میں حلف اُٹھانا چاہا تو انھیں اس کی اجازت نہیں دی گئی اور اُن سے کہا گیا کہ آپ ہندی زبان میں حلف اُٹھا سکتے ہیں۔

مرزا صاحب: اور اس کا نام سیکولر اسٹیٹ ہے۔ اے قربانت شوم۔

وجوہات کی خدا کی قسم لاجواب کی"!

میر صاحب: اب میری سنو۔ تم کو یاد ہوگا کہ جس زمانے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب صدر تھے۔ اس زمانے میں جب اردو داں طبقہ کو شیطان نے انگلی دکھائی تو انھوں نے اردو دستخطوں والی مہم پھر شروع کر کے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو کو یوپی، بہار، دلی اور ان علاقوں میں جہاں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے، اُسے وہاں کی دوسری سرکاری زبان بنایا جائے چنانچہ اردو بولنے والوں نے ۲۱ لاکھ دستخطیں کروا کے ہمارے ملک کے موجودہ صدر صاحب اور اس زمانے کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضور اتنے اردو زبان کے بولنے والے تو یوپی ہی میں بستے ہیں جو اردو میں دستخط بھی کر سکتے ہیں لہذا اردو زبان کو کم از کم وہی سہولتیں دی جائیں جو آزاد ہندوستان میں ہر زبان کو حاصل ہیں۔ اس پر صدر صاحب نے اُن دستخطوں کے پلندوں کو رکھ کر کہا کہ اچھا، دیدہ خواہد شد۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک وہ دستخطیں کھٹائی میں پڑی ہیں۔ نہ ہاں میں جواب ملتا ہے نہ نہیں میں۔

مرزا صاحب: اے نواب غالب صاحب کی صد سالہ برسی کے موقع پر موجودہ صدر صاحب سے کہا جائے کہ قبلہ اب تو آپ خود صدر ہیں۔ لہذا اپنے اختیارات خصوصی کو آپ ہی عمل میں لا کر اسے یوپی کی علاقائی زبان بنا دیں۔

میر صاحب: واہ مرزا صاحب، اماں! میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا دماغ بھی تخریبی باتوں میں خوب چلتا ہے۔ وہ بیچارے خود پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے ہیں، اللہ ان کے عہدے کو سلامت رکھے اور ان کو دوبارہ صدر ہونا نصیب کرے، وہ باون کروڑ کی بات کے مقابلے میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کی بات کیوں سنیں۔ میں کہتا ہوں مرزا تم آدمی ہو یا راجہ پورس کے ہاتھی، جب دیکھو تب اپنی ہی فوج کو مارتے ہو۔ اب کیا چاہتے ہو کہ زبان اور قوم کے پیچھے وہ اپنا عہدہ چھوڑ دیں؟

مرزا صاحب: کیا مطلب ہے میر صاحب تم اور تمہارے آبا و اجداد نے کبھی کسی کالج اور یونیورسٹی میں تو پڑھا نہیں، اس لئے تم کو کیا معلوم کہ دیس میں اُردو کے ساتھ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کیا سلوک ہو رہا ہے؟

میر صاحب: تو بتا دینا؟

مرزا صاحب: یونیورسٹیوں میں بی۔اے اور ایم۔اے میں طلبا و طالبات کو صرف ہندی اور انگریزی زبان میں جواب لکھنے کی اجازت ہے۔ اگر کوئی طالب علم یہ چاہے کہ وہ ہندی کے بجائے اُردو میں جواب لکھے تو اس کو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں بھی اجازت نہیں ہے۔ اور یہ اُس وقت ہے جب کہ اُردو زبان کا دنیا کی تمام زبانوں میں پانچواں نمبر ہے، اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں تیسرا نمبر ہے۔

میر صاحب: بھائی تو اُردو نے آخر کس کا باپ مارا ہے جو اس پر یہ بندش عائد کی گئی ہے۔ اماں، مرزا حد ہو گئی۔ یعنی انگریزی جو ایک غیر ملکی زبان ہے اس میں تو جواب دینا منظور، مگر اُردو جو اسی ملک کی ایک جیتی جاگتی زبان ہے اور جسے کروڑوں آدمی دن رات بولتے ہیں، اس پر یہ پابندی۔

مرزا صاحب: تو کیا صدر صاحب کو ابھی تک اس طرف کسی نے توجہ نہیں دلائی؟

میر صاحب: اماں، توجہ دلانے کی خوب کہی۔ کیا وہ اس سے واقف نہیں، اگر خاموش اس لئے ہیں کہ کچھ کر نہیں سکتے۔ تو پھر کانگریسی غالب کی جان کو رونے کیوں بیٹھے ہیں؟

مرزا صاحب: دنیا کو یہ دکھانے کے لئے کہ ہمارے یہاں کسی زبان سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا۔ ہمارا ملک ایک سیکولر اسٹیٹ ہے اماں کیا کہنے ہیں تمہاری ڈھٹائی کے بہادر و اُردو اس طوفان سے جو جنوبی ہندوستان سے اُٹھ رہا ہے۔

میر صاحب: بھئی مرزا، مزہ تو اُس وقت آتا ہے جب کوئی کانگریسی یا جن سنگھی

نیتا کسی اُردو مشاعرے یا کانفرنس کی صدارت کرتے وقت اٹھلا اٹھلا کر اُردو کے گُن گاتا ہے اور ساری زبانوں کے درمیان میل ملاپ کی باتیں کرتا ہے۔ قسم قرآن کی ہیں تو اس کے چہرے پہ نگاہیں گڑھو کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ آواز نکل کدھر سے رہی ہے؟ اس کے بعد جب اُردو داں سامعین اس کی تقریر پر تالیاں بجا کر صدر صاحب کے حوصلے بڑھاتے ہیں اور مقرر دانت نکال دیتا ہے تو قسم ہے تمہارے سرِ عزیز کی میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہوں:

"چنڈری سنبھال گوری اُڑی چلی جائے رے"

مرزا صاحب: بھائی غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں کانگریس جو مرزا غالب کو اس طرح سر پر لیئے پھر رہی ہے۔ اسکی اس ڈھٹائی پر جناب اُوک صاحب کو بھی جھرجھری آنے لگی ہوگی جو بیچارے ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کو نئے سے مادہ بنا رہے ہیں۔

میر صاحب: واللہ اس نس بندی کا کام اگر مجھ سے لیا جائے اور اس کی چوتھائی رقم جتنی اُوک صاحب کو مل رہی ہے، مجھے دی جائے تو میں ان سالے اُردو شاعروں کی ہندی سے چنڈی نکال کر رکھ دوں، اور سارے ہندی والے لپک لپک کر میرے پیار جھاڑنا شروع کر دیں۔

مرزا صاحب: وہ کیسے؟

میر صاحب: وہ ایسے کہ میں ولی دکنی سے لیکر اب تک کے تمام شاعروں کے نام اور تخلص کو ہندی میں بدل کر خود ان کی تصنیفات سے ثابت کر دوں کہ یہ سب کے سب ہندی کے شاعر ہیں۔

مرزا صاحب: یار، تو اس سلسلے میں کانگریس والوں سے بات کر دا اور اگر وہ راضی ہو جائیں تو تم اُردو شاعروں پر سوار ہو جاؤ اور میں اُردو کے نثر نگاروں پر چڑھی گانٹھ دوں۔

میر صاحب: اچھا مرزا! معاف کرنا اس وقت میں غالب کی صد سالہ برسی کی جو کمیٹی بنی ہے اُس میں جا رہا ہوں۔ اگر وہاں کوئی گوشہ نکلا تو تم کو بھی اُس کے جھنڈے کے جھگڑوں میں شریک کر لوں گا۔

مرزا صاحب: تری آواز مکّے اور مدینے!

غالبؔ کا استعمال

فرقہ پرستی اور اُردو کُشی کا ٹھیکہ لینے کے بعد جب دیس آزاد ہوا اور ملک کی قومی زبان پر اُردو زبان کا بکرا صدقے کر کے اس کا گوشت چیل کوؤں کو دیا جا چکا تاکہ قومی زبان نظرِ بد سے بچی رہے تو کچھ ستم ظریفوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ حضور اس کی ہڈیوں کو دیکھ لیا جائے کہ کوئی بوٹی ایسی تو لگی نہیں رہ گئی ہے جس میں جان باقی ہو اور چھپکلی کی دُم کی طرح جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی وہ زمین پر رقصاں رہے۔ اس پر ایک اُردو کُش اور ماہر لوٹ کھسوٹ بولا کہ بھائیو! اب مزید فکر و تردد کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس زبان کی جو ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں اُن کی کھپت کا بھی ہماری کانگریس نے پورے طور پر انتظام کر لیا ہے۔ اور اس کی ہڈیوں کی شکر بنانے والوں سے ٹنڈر طلب کر لیئے گئے ہیں اور اب اس کی شیرینی اور لطافت کے مزے اس شکر کی گرانی میں چار روپے سیر شکر کھانے والے لوٹیں گے۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ اس زبان کے شعراء کے پنڈوں کو ٹٹول کر دیکھا جائے کہ ان شعراء میں کس کے کاندھے اتنے مضبوط ہیں جن پر رکھ کر سیاسی بندوق چلائی جا سکتی ہے۔ اس لئے اُردو کے تمام شعراء کے کاندھے ٹٹولتے ٹٹولتے جب ہماری کانگریس کا ہاتھ مرزا غالب کے کاندھے پر پڑا تو قاتلانِ اُردو کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ صرف مرزا صاحب کے کاندھے اتنے مضبوط ہیں جن پر سیاست کی بھاری بندوق رکھ کر چلائی جا سکتی ہے۔ اور اُردو داں طبقے کا تھوڑا

بہت خون جو بچ رہا ہے اُسے بھی چوسا جا سکتا ہے۔ اتفاق سے مرزا صاحب مرے بھی ایسے موقعے
سے تھے کہ اب سال ڈیڑھ سال بعد انہیں مرے پورے سو سال ہو جائیں گے۔ اس لئے متفقہ طور
پر طے پایا کہ مرزا صاحب کے کاندھے تمام شعراء میں زیادہ جاندار اور مضبوط ہیں انہیں کو استعمال
کیا جائے۔ اس پر مرکزی کانگریس نے کہا بھائیو! ہم پر اور ہمارے ساتھیوں پر براہ راست
اُردو کشی کا الزام ہے اور ہم نے اُسے شجر ممنوعہ قرار دیا ہے اس لئے از راہ ہمدردی سب سے
پہلے ہمیں مرزا صاحب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑنے کی اجازت دی جائے۔ اس پر
قاتلان اُردو کی طرف سے لبیک لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں اور مرکزی سرکار کی طرف سے
ایک سنٹرل غالب کمیٹی کی تشکیل عمل میں آگئی اور قاتلان اُردو کے چودھری کی طرف سے
ایسے عہدے دار اس کمیٹی میں مقرر کیے گئے جن میں بیشتر حضرات وہ تھے جنہیں اس کی بھی
اطلاع نہ تھی کہ مرزا غالب ابھی حیات ہیں یا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اس کمیٹی کے سکریٹری
نے عہدہ قبول کرنے سے پہلے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرات! عام کانگریسیوں کی طرح یوں تو ہر
عہدہ مجھے جان و دل سے قبول ہے مگر میں کیا عرض کروں تمام مشاعروں میں اگرچہ میں پابندی
سے شریک ہوتا رہتا ہوں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ مشاعروں میں ہر بڑے سے بڑا شاعر تو مجھے
دکھائی پڑا مگر مرزا صاحب آج تک کسی مشاعرے میں نظر نہ آئے۔ اس پر اس کمیٹی کے ایک
دوسرے عہدیدار نے کہا کہ میاں! وہ بوڑھے آدمی ہیں اور اب ان کی عمر سو سال ہونے کو
آئی ہے اس لئے وہ زیادہ تر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ اس پر ایک تیسرے عہدیدار نے کہا جناب
اس جشن کی تیاریاں تو بڑے زور شور سے ہو رہی ہیں لیکن کسی نے مرزا صاحب سے بھی اُن
کی برسی منانے کی اجازت حاصل کرلی ہے؟ اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ سب سے پہلے کیوں
نہ مرزا صاحب کے خدمت میں حاضر ہو کر پوچھ لیا جائے کہ وہ اپنی برسی منانے کو تیار بھی ہیں؟
ایسا نہ ہو کہ جب چندہ وندہ جمع ہو جائے تو عین موقعے پر مرزا صاحب اور ان کی بیوی
جھاڑو پنجہ لیکر کھڑی ہو جائیں اور آدھوں آدھ کا مطالبہ کریں اور بیگم صاحبہ حق زوجیت کے لئے

ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو جائیں: ؎

ڈکھ سہیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں

اس پر ایک نیتا نے گرم ہو کر کہا - اگر یہ صورت ہوئی تو چندہ جمع کرنے والوں کا محنتانہ نکال کر سارا چندہ ہندی پرچار سبھا کو دے دیا جائے گا - ایک صاحب بولے - کیوں نہ مرزا صاحب کے لڑکوں سے چل کر منظوری حاصل کر لی جائے - اس پر سکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ صرف بڑے صاحبزادے کی منظوری حاصل کر لی جائے اور اُن سے کہا جائے کہ وہ اپنے باپ کے کانوں تک یہ بات پہونچا دیں کہ انہوں نے صد سالہ برسی کی منظوری دیدی ہے - بلکہ اگر ممکن ہو اور مرزا صاحب دستخط کر سکیں تو ان سے دستخط بھی لے لئے جائیں - ورنہ اُن کی بیوی سُنا ہے اتنی بکٹ ہیں کہ مُصلّے پر کوس کوس کر سارے چندہ جمع کرنے والوں کو کھا جائیں گی دوسرے صاحب بولے - اسی لئے تو مرزا صاحب کی گھر میں قدم رکھتے جان نکلتی ہے - ادھر ڈیوڑھی سے گھر میں انہوں نے قدم رکھا اُدھر وہ جھاڑو لے کر دوڑیں اس پر سکریٹری صاحب سے لکھنؤ کے ایک صاحب نے آنکھ مار کر کہا کہ حضّت ! اگر جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں - ہر طرف سے ضرور ضرور ! کی آوازیں بلند ہوئیں، اس پر انہوں نے فرمایا قبلہ آخر مقام آپ کے سرِ اقدس کی، ایک دن تو جب میں مرزا صاحب سے ملنے گیا ہوں تو میں نے خود مرزا صاحب کی شان میں بیوی کو ناپسندیدہ الفاظ استعمال کرتے سُنا ہے - قسم قرآن پاک کی کیا زبان کی مار دے رہی تھی یہ جلے تن عورت اتنے بڑے شاعر کو - اُس پر اُن کے ایک ساتھی نے اپنے دوست سے آنکھ مار کر کہا - مگر قسم جناب امیر کی ! مرزا صاحب نے بھی تو بیوی کو تپانے میں کوئی تسمہ باقی نہیں رکھا اور ایک ٹکہئی ڈومنی سے عشق کر کے گھر والی کے سینے پر پوری زندگی مونگ دلی ہے - اس پر ایک نیتا نے کہا - مگر مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں - پھر اگر انہوں نے ایک ڈومنی ڈال لی تو کون سا بڑا گناہ کیا ؟ اس پر لکھنؤ والے صاحب بولے - حضّت وہ شیعہ مذہب تھے اس لئے انھوں نے ڈومنی کو

حلال کرنے کے لئے مشتعر ضرور رہا ہوگا - اور اگر نہ ڈالتے تو کیا کرتے۔ ترکی النسل تھے۔ کب تک سوالیہ جملے کا نشان بنے بنے پھرتے پھر جب گھروالی رخ ہی نہ کرے تو شوہر کیا کرے اس پر نیتاجی نے کہا اس سے تو اچھا تھا کہ نس بندی کرا لیتے تاکہ جیسی ہیں سے تو نجات ملتی اس پر سکریٹری صاحب بولے - جناب ہنسی مذاق برطرف ۔ پہلے اس کی تحقیق تو کرلی جائے کہ ان کے لڑکوں میں کتنے پاکستان میں ہیں - ایسا تو نہیں کہ انہوں نے وہاں کی شہریت اختیار کرلی ہو کیونکہ اس صورت میں جو لڑکے پاکستانی شہریت اختیار کئے ہوں گے وہ بھارت دشمنی میں کسی قیمت پر بیہ تقریب منانے کی منظوری نہ دیں گے اور اگر یہاں باپ کی تقریب منائی گئی تو وہاں پاکستانی حکومت انھیں دھرلے گی - ایک صاحب بولے یہ سیاسی گلی ڈنڈے کی بھی خوب رہی -!

نشانہ تاکنا دل پر جگر کے پار ہوجانا

بھلا اس سیاسی بھنگے پن کا بھی کوئی علاج ہے - وہاں باپ چوری کرے اور یہاں بیٹا پکڑا جاتے - کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا! اس پر یو۔ پی کی غالب کمیٹی کے ایک رکن بولے - صاحب! ان سب سیاسی جھگڑوں سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ اُن کی صد سالہ برسی ہندی میں منائی جائے کیونکہ ہندی کی جدید تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جتنے اُردو کے بڑے بڑے شاعر گذرے ہیں وہ دراصل ہندی کے شاعر تھے اور جتنی تاریخی عمارتیں مسلمان بادشاہوں کے نام سے منسوب ہیں وہ سب ہندوؤں کی بنوائی ہوئی ہیں ـــ اوک صاحب کے کوئی دور کے رشتہ دار جو ہندی شعرا پر تحقیق کر رہے ہیں اوک صاحب کی طرح ان کی ذاتی تحقیق یہ ہے کہ اُن کی ساری کویتائیں ہندی میں تھیں لیکن کسی میاں بھائی نے اُن سب کا اُردو میں ترجمہ کرکے اُنہیں اُردو کا شاعر مشہور کردیا - بلکہ ایک ہندی کے محقق نے تو یہاں تک دریافت کرلیا ہے کہ اُن کا اصلی نام پرشوتم داس لیپ تھا اور انہوں نے چار کتابیں ہندی میں لکھی تھیں - اوّل "عودِ ہندی" دوسرے "بھودان تحریک" تیسرے "شبد بین" اور چوتھے "کہاں تھے بھگوان" اُردو والوں نے

سودہندی کو بجائے "الف" کے "عین" سے بدل دیا۔ بقیہ نام "برہان قاطع" "سبد چیں" اور
قاطع برہان رکھ کر ساری کتابوں کو اپنا لیا۔ ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خالص برہمن
تھے۔ چنانچہ ان کا یہ شعر تو براہ راست اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ برہمن تھے ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اسا پراتی سندر راتی سندر اکی آوازیں بلند ہوئیں۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے
ہوئے انہوں نے فرمایا۔ ان حالات میں ہماری یہ تقریب قومی یکجہتی کی ایک جیتی جاگتی
مثال بن جائے گی اور ہم بہت آسانی سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملے ملے چندے
اور ڈونیشن لے سکیں گے۔ ایک صاحب جو ابھی تک خاموشی سے ان سب باتوں کو سن
رہے تھے، بولے۔ بھائیو! میں نے مرزا غالب کو جتنا پڑھا ہے اتنا آپ حضرات میں سے
شاید ہی کسی نے پڑھا ہوگا۔ مگر مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے جیسے مرزا غالب مر چکے ہیں۔
اس پر ایک لکھنؤ والے نے اپنا سینہ پیٹ کر کہا۔ ہے ہے!

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ارے سچ سچ بتائیے یہ شُدنی خبر آپ نے کس اخبار میں پڑھی۔ ابھی پرسوں تو وہ
اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھے شوربہ روٹی بھگو کر کھا رہے تھے۔ وہ تو کہیے قسمت میں آخری دیدار
لکھا تھا جو ہو گیا ورنہ میں بالکل خالی الذہن اُن کے دروازے کے پاس سے چلا جا رہا تھا
کہ ایک دم کسی کے کھانے کی آواز کانوں میں پڑی۔ مُڑ کر دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب بیٹھے
شوربہ پھلکا کھا رہے تھے۔ بوڑھے آدمی دانت جوانی ہی میں گر چکے تھے۔ اس لئے روٹی
شوربہ میں بھگو کر کھاتے تھے۔ ایک تیسرے صاحب نے کہا کہ صاحب جہاں تک اس منحوس
خبر کا تعلق ہے مجھے بھی اس میں کچھ صداقت معلوم ہوتی ہے کیونکہ سویرے ایک صاحب
کہتے جا رہے تھے ع حیف غالب مُرد!

کوئی فارسی داں معلوم پڑتے تھے اِس پر کانسٹی ٹیوشن کلب کے ایک رکن جو غالب سنٹرل کمیٹی میں اس وجہ سے شامل کئے گئے تھے کہ وہ ذرا پیسے والے تھے اور اُن سے ڈٹ کر چندہ وصول ہوا تھا، بولے۔ ابھی گذشتہ ہفتے نہ جانے کہاں مشاعرہ تھا جس کی انہوں نے صدارت فرمائی تھی۔ اس پر ایک صاحب نے اُن کے بیان کی تردید فرماتے ہوئے کہا۔ جناب! وہ مرزا صاحب نہیں، جوش ملسیانی صاحب تھے جن کی شکل اب کثرت استعمال سے غالب جیسی ہوگئی ہے اور وہ ماشاء اللہ ابھی بقید حیات ہیں۔ اتنے میں ایک محترمہ جو ابھی ابھی آئی تھیں غصے میں نتھنے پھلا کر بولیں۔ آپ حضرات یہ کیا جہالت کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں مرزا صاحب کی پرنواسی ہوں۔ انہیں مرے ننانوے سال ہو چکے ہیں۔ اس پر ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں تو پھر عورتوں کی جو کمیٹی زنانخانوں سے چندہ وصول کرنے کے لئے بنی ہے اُس کا صدر آپ کو بنا دیا جائے۔ آپ کی موجودگی میں چندہ بھی اچھا وصول ہوگا۔ اور مرزا صاحب کی عظمت کا رعب بھی عورتوں پر اچھا پڑے گا۔

جب غالب کی صد سالہ برسی کی خبریں دُنیا کے گوشے گوشے میں ہندوستان کی گرانی، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی اور قرض خواہی کی طرح پھیل گئیں تو ہندوستان کی عورتوں اور مردوں نے اپنا اپنا ولدیت تبدیل کرا اعلان کرنا شروع کر دیا کہ اُن کا سلسلۂ نسب غالب تک گیا ہوا ہے اور عوام نے مرزا صاحب کے کندھے پر اپنی اپنی بندوقیں رکھ رکھ کر چھوڑنا شروع کر دیا بازاروں میں غالب بیڑی، غالب سگریٹ، غالب قلفی، غالب قلفیوں کی آوازیں لگنے لگیں اور ریڈی میڈ کپڑے والوں نے غالب لنگوٹ، غالب جمپر، غالب شلوار، غالب شمیز، غالب سلیپر غالب انگوچھا، غالب نیکریں سی سی کر دوکانوں پر لٹکا دیں۔ کچھ لوگوں نے غالب ریستوران اور غالب ہوٹل کھول کر وزیروں سے اُن کا افتتاح کروانا شروع کر دیا۔ جب نواب اخون صاحب کو عالم نزع میں معلوم ہوا کہ ملک میں غالب کا طوطی بول رہا ہے تو انہوں نے اپنی لڑکی اور لڑکے کو جنہوں نے ہندی میں بورڈ سے ہائی اسکول اور انٹر تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا اپنے پاس بُلا کر وصیّت کی کہ بیٹا! میں تو دنیا سے جا رہا ہوں لیکن تم دونوں کو وصیّت

کرتا ہوں کہ تم دونوں غالب کی زندگی کے کسی پہلو کو لیکر اس پر تھیسس ضرور لکھنا ورنہ قبر میں میری پیٹھ نہ لگے گی اور میں میدانِ حشر میں تم دونوں کا دامن گیر ہوں گا۔ اس پر جو لوگ نواب اغن کی عیادت کو آئے تھے اُن میں بحث شروع ہو گئی۔ اغن صاحب کے چچازاد بھائی پیرن صاحب کہنے لگے کہ حضت اغالب پر تھیسس لکھنا صرف دست زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے کم نہیں! اس لئے انھوں نے الہ آباد سے آئی ہوئی ایک خبر کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں صرف غالب پر ریسرچ کئے ہوئے طلبا کی تعداد اس وقت تک دو ہزار سے اوپر تک پہنچ چکی ہے! اور اس سلسلے میں بتایا کہ ابھی حال میں الہ آباد یونیورسٹی میں مرزا غالب پر تحقیق اور تدقیق کا شعبہ قائم ہوا ہے اُس میں ایک ریسرچ اسکالر کی جگہ خالی ہوئی تھی جن میں تقریباً پانچ سو طلبا کو جو غالب پر پی۔ ایچ۔ ڈی کئے ہوئے تھے۔ پروفیسر احتشام حسین صدر شعبۂ اُردو نے انٹرویو کے لئے طلب کر لیا۔ انٹرویو والے دن امیدواروں کو جب کیو میں کھڑا کیا گیا تو یونیورسٹی کی سڑک پر ٹریفک جام ہو گئی۔ اس پر پولیس نے اعتراض کیا اور امیدواروں کو پہلے تو وارننگ دیکر ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب وہ کسی طرح ہٹنے کو تیار نہ ہوئے تو پولیس کو اُن پر اشک آور گیس چھوڑنا پڑی۔ اس کے بعد بھی جب وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تو پولیس نے اُن پر لاٹھی چارج کر دیا۔ چھوٹے بڑے تین پی۔ ایچ۔ ڈی زخموں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اس پر ایک صاحب سینہ پیٹ کر بولے۔ ہائے ہائے! کیسے کیسے جوان کام آئے ہوں گے۔ قبلہ! میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ الہ آباد میں جو حالیہ فساد ہوا ہے وہ اسی کا شاخسانہ تھا۔ ایک تیسرے صاحب بولے، جناب! میں تو اب جب کسی کالج کے سامنے طلبا پر لاٹھی چارج کی خبر سُنتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ ہو نہ ہو وہاں کوئی اُردو کی جگہ خالی ہوئی ہو گی اور زخمی ہونے والوں میں کچھ نہیں تو پی۔ ایچ۔ ڈی تو ضرور رہی ہوں گے۔

خیر اس قسم کی چہ میگوئیاں تو ہر مرنے والے پر ہوتی رہیں گی۔ لیکن ایک دن جب میں مرزا صاحب کی صد سالہ برسی پر ایک مضمون لکھ رہا تھا اور اُن کا اور اُن کے ہم عصر ذوق کا

دیوان دیکھ رہا تھا کہ مجھے اُن کے بعض اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ جس وقت مرزا کا انتقال ہوا ہے اُس وقت کچھ اس پھُرتی سے ان کی روح جسم سے پرواز کر گئی کہ اُنہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ جاں کندنی کسے کہتے ہیں؟ اور عالم سکرات میں کن کن اذیتوں سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ اب تک قبر میں لیٹے اِس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ اُنہیں احاطہ کالے خاں سے نظام الدین اولیاءؒ محض تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ لیٹے لیٹے اپنے موجودہ استعمال پر بدحواس ہو کر یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ کہیں اس صد سالہ برسی کے موقعے پر اُنہیں قبر سے نکال کر حکومت کے سپرد نہ کر دیا جائے اور ان کا ڈھانچہ جگہ جگہ جلسوں اور سرکاری تقریبوں میں اس طرح استعمال ہونا شروع ہو جائے جس طرح کسی لاوارث کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے میڈیکل کالج کے طلبا کو دے دی جاتی ہے۔!!

غالبؔ اور آم

حضرت آدم سے غالبؔ تک اور غالبؔ سے مابدولت تک، یقین مانیئے ہم سب حد درجہ احسان فراموش، ناخلف اور محسن کش رہے ہیں، الّا جناب عبداللطیف صدیقی اور جناب خنیر بھوروی کے، جن میں سے اوّل الذکر حضرت آدم کا فاتحہ دلواتے ہیں اور دوسرے نے ایک مرتبہ غالبؔ اکیڈمی کی طرف سے، آموں پر فاتحہ کر کے خوب ڈٹ کر آم یا تو خود کھائے یا اپنے دو چار پیٹ بھرے دوستوں اور ادیبوں کو کھلائے، نہ کسی بے روزگار ادیب کو مدعو کیا اور نہ کسی مفلوک الحال فقیر شاعر کو شریک کیا۔ ورنہ آج تک نہ تو کسی صاحب کو حضرت آدم علیہ السلام کا فاتحہ کرنے کی توفیق ... اور نہ مرزا صاحب کے مرنے کے بعد کسی نے دو روٹیاں مرزا صاحب کے نام پر فقیروں کو کھلائیں حالانکہ نہ تو حضرت آدم نے ہمارا، آپ کا باپ مارا تھا اور نہ مرزا غالبؔ سے کوئی ایسا قصور سرزد ہوا تھا جسکی پاداش میں ان کا فاتحہ، درود ہم سب بھیجتے ہیں، یہ بے انصافی ملاحظہ ہو کہ ہم میں، آپ میں کون ایسا ہے جو مرزا صاحب کے اشعار پڑھ کر سر نہ دھنتا ہو اور اُن کے اشعار گنگنا گنگنا کر ان سے مزے نہ لیتا ہو ؎

رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

عام طور پر مرحومین کا فاتحہ ان چیزوں پر کیا جاتا ہے جو مرنے والوں کو زندگی میں بہت مرغوب ہوتی ہیں۔ غالبؔ علیہ الرحمہ کے بارے میں سُنا ہے کہ انہیں صرف دو چیزیں دُنیا میں

مرغوب تھیں، اوّل شراب دوسرے آم، شراب سال بھر پیتے تھے اور آم پوری فصل کھاتے تھے
چنانچہ آموں کا ذکر ان کے کلام اور مکتوبات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ حضرت آدم
کے بارے میں جو یہ مشہور ہے کہ انہوں نے شیطان کے بہکانے سے گندم کی بالی سے گیہوں کا ایک
دانہ کھالیا تھا اس لئے وہ جنت سے نکالے گئے، اسی لئے دنیا میں پہنچکر انہوں نے اتنقاماً اتنے
گندم خور اور اتنے گندم نما جو فروش پیدا کر دیئے کہ ساری دُنیا کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔
کلام پاک میں چونکہ بہت سی باتیں اشارۃً سمجھائی گئی ہیں اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے گندم سے مراد
آم ہو... جو ایک جنتی میوہ ہے۔ اور یقیناً وہ گیہوں نہیں بلکہ کوئی بہت بڑا آم ہی ہو گا۔ جو اپنے قد و
قامت میں خاصہ وزنی اور شیریں رہا ہو گا۔ جسے دیکھتے ہی ان کے منہ میں پانی بھر آیا ہو گا۔ یہ اسے
کھانے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ ورنہ کہیں ایک دانہ گندم کھا لینے سے انسان کو دنیا میں آنے کی
ضرورت پیش آتی ہے، وہ دانہ دو ڈھائی سیر کا تو ہو گا ہی۔ جسے ہاضمے کو پس پشت ڈال کر وہ
کھاتے چلے گئے ہوں گے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جنت میں جو، جوار اور چنے کے کھیت تو ہونے
سے رہے پھلوں ہی کے باغات ہوں گے، مرزا صاحب چونکہ حسب نسب کے اعتبار سے کھرے
تھے اس لئے ان کا سلسلہ نسب حضرت آدم تک براہ راست گیا ہو گا۔ درمیان میں کوئی میل
ملاوٹ کا سوال ہی پیدا نہ ہوا ہو گا۔ اس لئے آم کی شوقینی انہیں حضرت آدم سے ورثہ میں ملی تھی۔
اسی لئے وہ اس شخص کو عجیب الطرفین گدھا تصور کرتے تھے جو آم نہ کھاتا تھا۔ جیسا کہ ایک
جگہ فرما گئے تھے کہ گدھے آم نہیں کھاتے ان کے کلام اور خطوط میں کئی جگہ جگہ آموں کا ذکر
ملتا ہے اور میری دانست میں کہ داور محشر ان کے گناہوں کی سزا کے بعد اگر انہیں حور و غلماں
انعام میں دے گا تو وہ کہیں گے کہ حضور! اسی وزن کے آم دیدیجئے، میں حور و غلماں لیکر کیا
کروں گا جو ممکن ہے کہ اگر کسی وقت میرا آم کھانے کو دل چاہا تو وہ لوگ بھی اس میں حصہ
بٹائیں...

آموں کی کھلائی کے سلسلے میں مرزا صاحب خوش خور تھے اسی لئے انہوں نے اپنے کسی

دوست کو خط میں لکھا ہے کہ آم ہوں اور بہت ہوں، آموں سے متعلق یوں تو مرزا صاحب کے
بہت سے شعر ہیں مگر بعض آموں والے اشعار کو یاران طریقت نے غلط پڑھنا شروع کر دیا ہے
مثلاً ان کا ایک شعر اس طرح مشہور ہے ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

حالانکہ یہ شعر یوں ہے ؎

آموں کا ذکر تو نے جو چھیڑا ہے ہم نشیں
اک آم ایسا سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ غالب کو آم کس قدر عزیز تھے کیونکہ اس شعر میں ان کو اس کا
ملال نہیں کہ آم سے ان کے چوٹ لگی بلکہ غم اس کا ہے کہ ان کے سینے پہ پڑنے سے آم مجروح ہو گیا
ہوگا۔ غضب خدا کا غالب کے مداحوں اور معتقدین اتنا جھوٹ نہ بولیں تو اس وقت بھی
لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان اور پاکستان میں پڑے ہیں، مگر کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ
دو چار سو کچی امبیاں ہی ان پر ان کا فاتحہ کرکے ان کی روح کو خوش کرتا۔
راقم الحروف کو دو چار مرتبہ مرزا صاحب کے مزار پر حاضری دینے کا اتفاق ہوا مگر
ان کا مزار دیکھ کر اور یہ سوچ کر رونا آیا کہ ان کا مزار بھی بعض حضرات نے ایسی جگہ بنوا دیا جہاں
دور دور، ڈھائی ڈھائی میل آم تو آم، آموں کی ایک معمولی دکان بھی نظر نہیں آتی۔۔۔
حقیقتاً ان کا مزار تو ملیح آباد میں بننا چاہیے تھا کہ ان کی روح ہمیشہ مرنے کے بعد مختلف قسموں کے
آموں کی خوشبوؤں میں بسی رہتی اور اگر ایسا بھی ممکن نہ تھا تو کسی بڑھیا آم کی قلم منگوا کر ان کے
مزار پر نصب کرا دی ہوتی تاکہ مرنے کے بعد ان کی روح اس طرح بے چین نہ ہوتی۔ چنانچہ
عالم برزخ سے آموں کے بارے میں اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:
لو تم نے جنت میں آموں کا ذکر چھیڑ کر بھولی یادوں کو تازہ کر دیا۔ تم دنیا والے جنت

کا حال کیا ہوا تو، کہاں کی سُنی سُنائی باتوں پر بھروسہ کرتے ہو اور بیٹھے بٹھائے بغیر طرح دیئے مصرعوں پر گرہ لگاتے ہو۔ بھلا جنت کا آموں سے کیا تعلق اور اگر ہو بھی تو پھر کیا۔ جس جگہ دانے دانے پر مہر لگی ہو اور جہاں گندم کا دانہ آدم کے لئے شجر ممنوعہ قرار پائے ایسی جگہ بھلا کون جائے۔ ہاں تو اسی شرط پر جنت قبول کروں گا کہ میری قیام گاہ کے آگے انواع و اقسام کے آم لگے ہوں اور مجھے اجازت ہو کہ چاہے ڈال کے کھاؤں چاہے پال کے ۔۔۔ ع

جنت بھی ہے قبول مگر ایک شرط پر
آموں کے کچھ قلم مرے ہمراہ آئیں گے

جب سے عالم برزخ میں آیا ہوں، آموں کی صورت کو ترس گیا۔ یہاں آموں کی فصل تو بڑی چیز ہے، آم بیچنے والوں کی صورت کو ترستا ہوں اور یہ سوچ کر اپنے مقدر کو سراہتا ہوں کہ سلیحہ پانی پتی جن کا آموں سے کوئی دور کا لگاؤ نہ تھا ان کی قبر تو ملیح آباد میں بنے اور مجھ بدنصیب کو مرنے کے بعد آموں کی ہوا نہ لگے۔ عالم برزخ کو یوں سمجھ لو کہ ایک بیچ بیچ کے مقام کا نام عالم برزخ رکھا گیا ہے۔ جو لوگ یہاں مقیم ہیں اور جن کے اعزا دنیا میں رہ گئے ہیں وہ فاتحہ کے طور پر جو کچھ بھیجتے ہیں، فرشتے ان تک پہنچا دیتے ہیں اور جیسا مال لاتے ہیں ویسا اس کا صلہ پاتے ہیں۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ میاں عبدالرزاق ملیح آبادی کے گھر ملیح آباد سے چار پیٹیاں دسہری، سفیدے اور ثمر بہشت کی آئیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ پیٹیاں اُن کی آئیں اور تالیاں میں نے بجائیں۔ میاں عبدالرزاق آموں کی فصل سے پہلے وعدہ کر گئے تھے کہ اس مرتبہ فصل آنے پر اگر کسی عزیز نے آموں پر فاتحہ کیا تو ملیح آبادی آم کھلاؤں گا۔ پٹھان بچے بات کا دھنی اور قول کا سچا ہوتا ہے۔ چنانچہ دو پیٹیاں آموں کی جن میں ہر پیٹی میں پچاس پچاس قلمی آم کے دانے تھے انھوں نے مجھے دے دیئے۔ ہر دانہ ڈیڑھ پاؤ وزن کا، ایک آم جو سرولہ ہے، میرے زمانے میں نہیں ہوتا تھا، نہ جانے ملیح آباد والے کہاں سے لائے ہیں، بہت خوب ہے۔ میں نے اُن میں سے دو دانے جبرئیل امین کو بھجوائے کہ ہر معاملے میں وہ میرے کام آتے ہیں۔

اور مجھ پر غیر معمولی عنایت فرماتے ہیں جب سے دو دانے انہوں نے کھائے ہیں، ہونٹ چاٹتے نظر آتے ہیں۔ زندگی میں کیسے کیسے رفیق تھے ایک سلسلہ تھا جو مارہرہ، رام پور، سندیلہ اور بنارس تک چلا گیا تھا۔ یہ آموں کے اکھاڑے اور غالب پرستوں کے گہوارے تھے۔ سہارن پور میں ایک رٹول ہوتا تھا جو شیرینی میں الفانسو کو شرماتا تھا۔ صورت اور سیرت میں یکساں جیسا ظاہر ویسا باطن۔

دنیا میں اب بھی میرے معتقدین کی ایک لمبی فہرست ہے رامپور میں میاں امتیاز علی عرشی رامپوری جنہوں نے میرا دیوان مرتب کیا ہے، سندیلے میں میاں چودھری وجاہت علی سندیلوی جنہوں نے میرے غیر طبوعہ اشعار شائع کئے ہیں، دلی میں مالک رام، پنجاب میں غلام رسول مہر، بمبئی میں علی سردار جعفری۔ ان میں مصنفین بھی ہیں اور مرتبین بھی، نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی مگر ان میں سے کسی کو بھی توفیق نہ ہوئی جو چار رانیوں پر میری نذر دلواتے اور عالم برزخ میں میرے کام آتا ہے

کون سنتا ہے فغانِ درویش

قہرِ درویش بجانِ درویش

سُنتا ہوں کہ حکومت وقت میرا مقبرہ تعمیر کرانے جا رہی ہے۔ صاحب میں مقبرہ لیکر کیا کروں گا۔ میں مر کر یہاں آیا تو میری قبر پر اُنہوں نے ٹاپا اوندھا دیا۔ دو ایک باغ آموں کے میرے نام وقف کر دئیے ہوتے تو میں جانتا کہ حاکم کی قبر پہ لات ماری۔ آموں کے ٹوکرے مزار پر چڑھتے، عرس کے موقعے پر قلمی اور تخمی آموں کی چادریں چڑھتیں تو میں خوش ہوتا کہ مرنے کے بعد میری قدر ہوئی۔

کل شام پنڈت نہرو مجھ سے ملنے آئے تو میں نے ان سے شکایت کی، اتفاق ایسا کہ عبدالرزاق بھی بیٹھے تھے۔ بولے مرزا صاحب! یہ دنیا میں میرے جیل کے ساتھیوں میں تھے، جیتے جی ساتھ دیا اور مرنے پر بھی رفاقت کا دامن نہ چھوڑا۔ میں نے اُنہیں تہہ بہشت

کے دو دانے دیجیے۔ بولے اس پر تو مرزا صاحب میں بھی جان دیتا ہوں۔ ملیح آباد کے خان صاحبان سے میرا کبھی یارانہ نہ تھا بلکہ ان سے میرا تعلق بالکل عزیزدارانہ تھے جو قش آخر دم تک رفیق رہے میں نے کہا میاں! تمہاری زندگی میں تمہارے حکم سے مقبرہ بننے کا جب حکومت نے بندوبست کیا تھا تو میرے مزار کے گرد دو چار آموں کے درخت بھی لگوا دیئے ہوتے۔ بولے مرزا صاحب چوک ہو گئی اب میں لال بہادر شاستری کو لکھوں گا۔

ملیح آباد کے خان صاحبان تو آموں کی پرورش اور نگہداشت اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی مولوی بکرا پالتا ہے، اُسے کلیجے سے لگاتا ہے، پلاؤ زردے کھلاتا ہے۔ خاطر و مدارات میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ آم کے تراشنے کے طریقے بھی انوکھے ہیں قبلہ رو ہو کر انہیں ڈال سے توڑا جائے، ڈال سے جدائی کے وقت کوئی آیت پڑھی جائے ڈال سے جدا ہونے کے بعد اس طرح اُتر دکھن ہو کر اُسے گرفت میں لیا جائے کہ آم اذیت محسوس نہ کرے، پال میں رکھ کر اُسے ہفتہ بھر چھوٹی بڑی کروٹیں دلائی جائیں اس کے بعد کاٹتے وقت آم کے جسم اطہر پر اس طرح ہاتھ پھیرا جائے کہ اس کا چھلکا کہیں سے تکلیف نہ محسوس کرے، چھُری سے کاٹتے وقت منہ پورب پچھم کیا جائے۔ قاش اس انداز میں کاٹی جائے کہ آم کو اپنی قربانی تک کا گمان نہ ہو۔ قاش تن سے جُدا ہو تو رس کا قطرہ زمین پر نہ گرے۔

غالب کے حقوق کے ایک ذوق کا کہنا ہے کہ مرزا صاحب کے حقہ کی چلم بھی کاٹ کی تھی اور پورا حقہ آموں کی لکڑی سے تیار ہوا تھا، یہاں تک کہ حقہ کا پیندا تک آم کی لکڑی کا تھا اور آم کے کوئلے وہ عمر بھر استعمال کرتے رہے۔ بلکہ ایک محقق نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری تجہیز و تکفین کے سلسلے میں بجائے بیری کے پتوں کے آم کے پتے استعمال ہوں اور کافور کی جگہ آم کی گٹھلی کا سفوف استعمال کیا جائے۔ قبر میں تختے بھی آم کی لکڑی کے ہوں۔ مرزا صاحب جب بیمار پڑے تو جسم پر سویرے شام انبہ کھل کر ملتے

اور دسی کا دونوں وقت شربت استعمال کرتے۔ غرض مرزا صاحب کی پوری زندگی آموں میں گذری
اور مرتے وقت بجائے عرقِ انار کے ان کے حلق میں عرقِ انبہ ٹپکایا گیا۔

مرزا غالب کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء میں آل ورلڈ پیمانے پر منائی جانے والی ہے۔ اسکی
وجہ سے غالب کی شہرت اس قدر عام ہوگئی ہے کہ اب آم اور غالب کی شہرت میں یہ تمیز کرنا
دشوار ہے کہ دونوں میں زیادہ مشہور کون ہے اور ادیبوں اور شاعروں کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل
ہے کہ غالب آم پر غالب ہیں یا آم غالب پر۔ بہر صورت غالب پر جو جدید تحقیق ہو رہی ہے
اس کا سب سے بڑا المناک پہلو یہ ہے کہ آج تک اُردو کے کسی پروفیسر صاحب کو اتنی توفیق نہیں
ہوئی کہ وہ مرزا صاحب کے ازدواجی تعلقات پر کوئی تحقیقی مقالہ لکھوتے اور اس میں ایک مرتبہ
کا بیان درج کرتے کہ مرزا صاحب کی ازدواجی زندگی میں آم کو بھی دخل تھا اور غالب کی زندگی کا سب سے المناک پہلو
یہی ہے کہ اُن کے اور بیوی کے تعلقات تمام عمر اس درجہ کشیدہ رہے کہ اُن کو آخر لاولد ہی
مرنا پڑا۔ اور ہم آپ اُن کی نسل سے محروم ہو گئے۔

جڑ کٹ گئی ہی نخلِ آرزو کی

اختلاف کی وجہ جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ تھی کہ دونوں کے امزجہ ایک دوسرے سے
مختلف تھے۔ غالب آم کے شوقین تھے اور بیوی کو آموں سے نفرت تھی۔ یہ شراب پیتے تھے
اور وہ شراب پینے والے کے قریب منہ لانا پسند نہ کرتی تھیں۔ بیوی روزے نماز کی پابند تھیں
اور یہ رمضان شریف میں ایک روزہ نہ رکھتے۔ ہمیشہ بیوی سے کہا کرتے تھے کہ جنت میں اگر
تمہاری پوجا پاٹ روزے کے سبب ہوگی تو بندہ بھی وہاں ثمرِ بہشت کے قدر دانوں کی صف
میں نظر آئے گا۔ مگر سنا ہے کہ فریقین میں دشمنی کی سب سے بڑی وجہ آم ہی تھے۔ مرزا
صاحب یار دوستوں کو آموں کی فصل میں جو خطوط لکھتے تھے ان میں پہلا مطالبہ یہی کہ رہے

اس فصل میں جو بھیجیے تو بس آم بھیجیے

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فصل شروع ہوتے ہی آموں کے جھوٹے کے جھوٹے آنا شروع ہوجاتے

اور گھر بھر میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہ جاتی۔ اور مرزا صاحب کی طرف سے اس زوروں پر آموں کی
کھلائی پلائی شروع ہوتی کہ شام تک صحن میں ہر طرف گٹھلیوں کے ڈھیر لگ جاتے اس پر بیوی اور
زیادہ آگ بگولہ ہوتیں اور جب آموں کے ٹوکروں کے پاس سے گذرتیں تو زیر لب بڑبڑا جاتیں۔
"خدا ان مُردوں کو اُٹھا لے جو آموں کی فصل شروع ہوتے ہی گھر بھر کو کوڑا بنا دیتے ہیں"

ایک دن اتفاق سے بیوی وضو کر کے دالان میں نماز پڑھنے جا رہی تھیں کہ آم کا چھلکا اُن
کے پیروں کے نیچے آگیا اور وہ اس بری طرح پھسل کر گریں کہ اُن کے دونوں کہنیوں میں سخت چوٹ
آئی اور پاؤں کا گٹا اُتر گیا اس پر وہ ہنگامہ ہوا کہ مرزا صاحب نے اُس دن سے گھر کے اندر
قدم رکھنا بند کر دیا۔ اور بیوی نے نماز پڑھ پڑھ کر آم اور آم کھانے والوں کو منہ بھر بھر
کوسنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے ڈیوڑھی میں اپنا پلنگ بچھا لیا اور وہیں بیٹھ کر
صبح شام اور دوپہر آم کھا کھا کر گٹھلیاں اور چھلکوں کا انبار لگا دیتے۔ چونکہ گٹھلی چھلکے
ایک وقت میں اتنے ہو جاتے تھے کہ ان کا اُٹھانا مرزا صاحب کے بس سے باہر تھا اس لئے
محلہ کی ایک ڈومنی کو جو ذرا جوان سی تھی وہ آموں کی فصل بھر آٹھ آنا مہینہ پر رکھ لیتے تھے
ڈومنی کچھ دنوں تک آموں کے گٹھلی چھلکے پھینکتی رہتی۔

اس کے بعد مرزا صاحب اُس سے اپنی چلم دم کر لینے لگے اور اس کے صلہ میں اُسے
دو چار آم دینے لگے۔ اور اس طرح آموں کے سہارے وہ ان سے اس درجہ قریب تر ہو گئی
کہ محلہ والے اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے بلکہ بعض تو کنواڑوں کی درازوں سے جھانکنے تک
لگے۔ اور جب اس کی اطلاع بیگم تک پہنچی تو وہ آموں کے سلسلے پر ان سے جلی بھنی تو تھیں ہی
انھوں نے مرزا صاحب کی بدنامی میں کوئی قسر باقی نہ رکھا۔ جس کی وجہ سے مرزا صاحب
سسرال میں تمام عمر منہ دکھلانے کے قابل نہ رہے۔ اس طرح آموں کی وجہ سے ڈومنی مرزا
صاحب اور ان کی بیوی کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

سنا جاتا ہے کہ ایک پی، ایچ، ڈی صاحب جو حال میں دلی میں ایک کالج کے سامنے اُردو

کی ایک جگہ کیلئے امیدوار تھے اور امیدواروں پر لاٹھی چارج ہونے پر گا آ گئے انہوں نے غالب اور آم پر پی۔ ایچ۔ ڈی کیلئے اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھا تھا کہ غالب کو آم اس درجہ مرغوب تھے کہ جب کبھی ان کو کھانسی نزلہ، زکام، درد شکم کی تکلیف ہوتی تو وہ آم کے پیڑ سے ایک ہری پتی تڑوا کر سونگھ لیا کرتے جس سے ان کی ساری تکلیف رفع ہو جاتی — جدید تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ مرنے سے تین ماہ قبل اُنہوں نے اکبرآباد میں ڈیڑھ بیگھے کا ایک آموں کا باغ بھی نصب کرایا تھا مگر جب پہلی بار درختوں میں بور آیا تو اس سے تین مہینے پہلے موت کے ظالم ہاتھوں نے مرزا صاحب کو زندگی کی ڈال سے توڑ لیا — سنا ہے کہ وہ باغ ڈومنی کے پس ماندگان کے پاس اب تک موجود ہے۔ شعر

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

خانصاحب: اماں! میر صاحب کچھ بتا سکتے ہو کہ یہ غالب صاحب کی جو صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے وہ فروری کی کن تاریخوں میں پڑ رہی ہے؟

میر صاحب: بھائی جو لوگ غالب کی برسی منا رہے ہیں اُن لنسوڑھیوں کا میرے سامنے نام نہ لو۔

خانصاحب: کیوں خیر تو ہے! اُردو کے اتنے بڑے شاعر کی برسی منانے میں کون سا لنسوڑھیاپن ہے۔؟

میر صاحب: حضت معاف کیجیے گا یہ لنسوڑھیاپن نہیں تو اور کیا ہے کہ جو صاحبان غالب کی دُم سے بھی واقفیت نہیں رکھتے وہ آج اُنہیں لکھتے پر چڑھائے چڑھائے پھر رہے ہیں۔ اور جن کے یہاں کہنا چاہیئے کہ ان کا بچپن اور اُن کی شاعری بڑھی پلی اور جوان جہان ہوئی اُن کو کوئی گھاس ڈالنے کو تیار نہیں۔

خانصاحب: ارے بھئی وہ تو اکبر آباد کے تھے۔ جسے آجکل آگرہ کہتے ہیں اور پھر تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر وہ دلی چلے گئے۔ جہاں اُنکو بحیثیت شاعر کے شہرت حاصل ہوئی تھی۔

میر صاحب: اور اکبر آباد سے پہلے وہ پیدا کہاں ہوئے تھے؟

خانصاحب: اکبر آباد ہی میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

میر صاحب: اے یہ تو آپ کے معلومات کا عالم ہے۔ اور ایک آپ پر کیا موقوف ہے بڑے بڑے لکھوں کو جنہوں نے اُن پر تحقیقی مقالے لکھے ہیں اُن تک کو اس بات کا پتہ نہیں کہ مرزا صاحب پیدا کہاں ہوئے تھے! اور ان کی اصل خو بو کیا تھی؟

خانصاحب: بھئی میں نے تو ابھی تک جہاں جہاں پڑھا ہے اُس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اکبر آباد ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

میر صاحب: اچھا اب تو آپ نے کہہ دیا مگر اب آئندہ سے میرے یا میرے کسی خاندان والے کے سامنے یہ بات نہ کہئے گا ورنہ قسم قرآن کی وہ آپ کا منہ نوچ لے گا۔ اے حضور! آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اس وقت آپ جس کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں مرزا صاحب اسی میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ سامنے جہاں پر چوکی بچھی ہوئی ہے وہیں اللہ بخشے ہمارے دادا جان کی منہ بولی دادی کو پان کھاتے کھاتے اچانک دردِ زہ کی شکایت محسوس ہوئی تھی جس کے بعد سے ہمارے باپ کی دادی کی دادی نے ان کا پلنگ یہیں بچھوا دیا تھا۔ جہاں دوسرے روز سویرے مرزا صاحب ٹھوں ٹھوں کرتے عالم وجود میں آئے۔ واللہ پیدا ہونے میں نہ پوچھئے اُنھوں نے ماں کو کیا اذیت دی ہے؟

ہماری دادی جن کا ابھی اسّی برس کی عمر میں پچھلے سال انتقال ہوا ہے، فرماتی تھیں کہ مرزا صاحب چونکہ وہ [illegible] پیدا ہوئے تھے اور پیدا ہونے میں ماں کو سخت اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لئے شروع ہی سے وہ گھر بھر کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے۔

خانصاحب: میر صاحب گستاخی معاف۔ یہ بات کچھ لوکل معلوم ہوتی ہے؟

میر صاحب: قسم جناب امیر کی جو میں آپ سے جھوٹ کہتا ہوں بلکہ ہماری

نانی اپنی دادی کی کانوں سُنی کہتی تھیں کہ جب وہ پیدا ہوئے ہیں تو اتنے دُبلے اور کمزور تھے کہ نہلانے کے ایک گھنٹہ بعد تک تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے خدا ناکردہ مرزا صاحب مُردہ ہیں۔ پھر جب دائی نے روئی کے پہل میں ذرا اٹھایا اور گرم ہوتے تو اتنے زور کی چیخ ماری کہ گرد و پیش جو لوگ بیٹھے تھے وہ اُچھل پڑے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ لڑکا نہیں کوئی آسیب ہے کیونکہ اتنا کمزور بچہ اتنی زور سے رو ہی نہیں سکتا۔

خانصاحب: تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مرزا صاحب کی آواز بڑی کرخت رہی ہوگی؟

میر صاحب: ارے صاحب! آپ کرخت کہتے ہیں ہماری پر دادی کہتی ہیں کہ وہ بولتے کیا تھے؟ بکتے تھے اور وہ جو اولاد مرے اس میں سب سے بڑا دخل اُن کی آواز کو تھا۔ ورنہ ان کے ابا کہا کرتے تھے کوئی اولادیں ہوئیں جن میں سے تین تو سال سوا سال زندہ رہیں البتہ دو بچے پیٹ ہی سے مرے ہوئے پیدا ہوئے۔

خانصاحب: میری دانست میں جو بچے پیٹ ہی میں مر گئے وہ بھی وقت باہر سے ڈھکنے کی آوازیں جو اُن تک پہنچتی ہوں گی ان سے دہل کر مر گئے ہوں گے۔

میر صاحب: اب جو بات بھی رہی ہو۔ مگر تین بچے جو سال سوا سال کے ہو کر مرے ان میں ایک کے تو دونوں کانوں کے پردے غائب تھے اور دو بچے تو واللہ دسترخوان پر کھانا کھاتے کھاتے گذر گئے۔

خانصاحب: یہ کیسے؟

میر صاحب: ارے صاحب اسے شامت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن مرزا صاحب جب کھانا کھانے بیٹھے تو ماں نے دونوں بچوں کو بھی بٹھا لیا اتنے میں نہ جانے کس چیز میں نمک کم تھا اس پر مرزا صاحب مارے غصے کے نوکرانی پر جو بگڑے تو ایک بچہ کی تو دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے ہی حرکت قلب بند ہو گئی۔ اور دوسرا اتنا

خوفزدہ ہوا کہ تین روز تک کانپتے کانپتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔

خانصاحب: ہے ، ہے۔ بھئی اسی لئے تو اسلام میں غصہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اب دیکھئے کہ ایک ذرا سی آواز کے زیر و بم نے مرزا صاحب کو لاولد بنا کر رکھ دیا۔

میر صاحب: ارے صاحب! اُن کے بچپن کی ایک دو باتیں ہوں تو بیان کی جائیں مگر اللہ بخشے خوش قسمت بچپن ہی سے تھے۔ بلکہ دادی بیان کرتی ہیں کہ اُن کے پیٹ پر پیدائش کے وقت ایک سفید بیر سے بڑا ؟ دو دوڑا تھا وہ اس درجہ چمکتا تھا کہ وہ فوراً اس کے سامنے لونڈا تھا۔ چنانچہ ایک برہمن جس نے ان کی کنڈلی بنائی تھی، پیشینگوئی کی تھی کہ یہ بچہ شہرہ آفاق ہوگا۔ چنانچہ آج آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے ڈنکے پٹ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر مرزا صاحب کی قبر کھودنے کی اجازت دے دی جائے تو واللہ ان کی ہڈیاں جمع کر کے ان کو دوبارہ مصنوعی گیس کے ذریعے چلتا پھرتا دکھا سکتے ہیں۔

خانصاحب: اماں قسم قرآن کی اگر ایسا ہو جائے تو کہنا چاہیئے کہ ہم لوگوں کو بھی مرزا صاحب کا دیدار میسر آجائے اور ایسے ایسے انکشافات ہوں کہ قسم قرآن کی لوگ دانتوں میں اُنگلی داب کر رہ جائیں۔ ۔

میر صاحب: اماں اگر ایسا ہو جائے تو واللہ، خونِ حسین کی قسم میں ایک بات کی تصدیق خود مرزا صاحب کی زبان سے کرلونگا جو دادی اماں بیان کرتی تھیں۔

خانصاحب: اماں وہ کیا ؟

صاحب: اماں وہ یہ کہ دادی اماں مرحومہ فرماتی تھیں کہ مرزا صاحب کی جن محترمہ سے شادی ہوئی تھی سُنا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی ۔ ۔ ۔ پر عاشق تھیں اور کسی طرح مرزا صاحب سے نکا : : پر راضی نہ تھیں۔ مگر نہ مرزا صاحب کے بھائی کی کچھ چلی اور نہ ان محترمہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی شادیوں کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہی ہوا ۔۔۔

خانصاحب: یعنی؟

میر صاحب: اے یعنی یہ کہ زندگی بھر مرزا صاحب سے اور اُن سے اَن بَن رہی اور مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی کے دماغ پر اثر ہو گیا۔ جو مرتے دم تک رہا،

خانصاحب: تو کیا مرزا صاحب کے کوئی چھوٹے بھائی بھی تھے؟

میر صاحب: اے تھے نہیں تو کیا ۔ اے وہی صاحب جن کو غدر میں تلنگوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بھئی بات یہ ہے کہ ان کو محبت میں تن بدن کا ہوش سڑکوں پر پاگلوں کی طرح گھوما پھرا کرتے تھے اور مرزا صاحب کی شان میں بڑی گستاخی کے کلمات زبان پر لایا کرتے تھے۔ ان کو نہ اتنا ہوش تھا کہ غدر میں گھر سے نکلنا چاہیئے یا نہ نکلنا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی شقی نے گولی مار کر ان کا قصہ پاک کر دیا۔ اماں سنتے ہیں کہ ان کی لاش تک دستیاب نہ ہو سکی۔

خانصاحب: ہے ہے! اماں سچی محبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اے میں کہتا ہوں کہ جب مرزا صاحب کی بیوی کو اس کی خبر ہوئی ہوگی تو لاکھ بیاہتا سہی پھر بھی پرانی محبت تو عود کر آئی ہوگی۔

میر صاحب: اے آپ عود کر آئی کہتے ہیں۔ اے تین روز تک تو وہ بیہوش پڑی رہیں۔ اور ہفتوں ایک کھیل زبان پر نہیں گئی۔ جب ذرا ذرا ہوش آتا تھا کہتی تھیں کہ ہائے مجھے اٹھا لیا ہوتا اُنہیں نہ اٹھایا ہوتا چنانچہ ایک تو اس بات کی تصدیق کرنی تھی دوسرے ان کے اُستاد عبدالصمد صاحب کے بارے میں دریافت کرنا تھا کہ آیا وہ ہندوستانی تھے یا واقعتاً ایران سے آئے تھے۔

خانصاحب: اماں ہاں۔ یہ بات تو ضرور تحقیق طلب تھی۔

میر صاحب: صاحب تحقیق طلب یوں تھی کہ دادی اماں کہتی تھیں کہ عبدالصمد صاحب اے وہ سامنے کھڑ بچے والے مکان ہی میں رہتے تھے اور وہیں مرزا صاحب کو فارسی

پڑھاتے تھے۔ مگر قسم قرآن کی ایسے ظالم تھے کہ مرزا صاحب کو پڑھانے میں بڑی چار چوٹ کی مار دیتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو مرزا صاحب کو اتنی زور سے طمانچہ مارا تھا کہ مرزا صاحب بے ہوش ہو گئے تھے اور وہاں سے اٹھا کر گھر لائے گئے ــــ مگر مرزا صاحب کے ماں باپ بھی اللہ بخشے خوب تھے یعنی کہ بجائے غصہ گرمی کرنے کے انہوں نے عبدالصمد صاحب سے کہدیا تھا کہ لڑکا میرا اور ہڈی گوشت آپ کا۔

خانصاحب: اسی سے تو مرزا صاحب اپنے زمانے کے سب سے بڑے فارسی دان سمجھے جاتے تھے۔ اور بڑے بڑے فارسی دانوں کو دھیان میں نہ لاتے تھے۔

میر صاحب: ہاں صاحب! اس زمانے کے ماں باپ اپنے بچوں کے استادوں کا جو احترام اور جو خدمت کرتے تھے وہ تو اب محض قصہ کہانی بن کر رہ گیا ہے۔

میر صاحب: اماں اگر روس کے لوگ مرزا صاحب کو ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ کے لئے زندہ کردیں تو واللہ مزا آجائے۔ اماں سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ وہ چونکہ خدائے سخن میر تقی میر سے ملے تھے اور یہی عبدالصمد صاحب ان کو دیکھ گئے تھے ان سے میر تقی میر کی شکل و صورت کا بھی پتہ چل جائے گا اور کچھ عجب نہیں جو مرزا صاحب یہ بھی بتا دیں کہ میر صاحب لکھنؤ میں کس اکھاڑے کے پاس دفن ہیں۔ کیونکہ میر صاحب مرزا صاحب کی زندگی ہی میں تو مرے تھے۔ لاکھ بچہ سہی لیکن کچھ تو انہوں نے سنا ہی ہوگا کہ میر صاحب کی تجہیز و تکفین کہاں ہوئی اور کون لوگ ان کی مٹی میں شریک تھے۔

خانصاحب: بھئی میر صاحب! اگر ایسا ہو گیا تو واللہ بہت سے لوگ جو میر تقی میر کے بارے میں عقلی گدے لگائے بیٹھے ہیں ان کا تو کہنا چاہئیے کہ جلوس ہی نکل جائے گا۔

میر صاحب: دادی اماں بیان کرتی ہیں کہ مرزا صاحب جب نو سال کے تھے تو اس درجہ حسین اور جامہ زیب تھے کہ جب عبدالصمد صاحب میر صاحب سے

ملنے جانے لگے اور چوڑی دار پجامہ اس پر سیاہ کامدار ٹوپی اور پیر میں شاہ جہاں پوری جوتا پہن کر گئے ہیں تو کئی بار تو اُن کے نظر ہو گئی -

خانصاحب: مگر میر صاحب! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس زمانے میں ریلیں تو ایجاد ہوئی نہیں تھیں پھر عبدالصمد صاحب ان صاحبزادے کو لے کیسے گئے؟

میر صاحب: ارے بھئی اس زمانے میں سفر اونٹ گاڑیوں، بیل گاڑیوں اور گھوڑوں پر ہوتا تھا - چنانچہ عبدالصمد صاحب جن کے بارے میں سنا ہے کہ ان کے پاس ریس کے گھوڑے بھی تھے - اسی پر بٹھا کر لے گئے ہوں گے - اپنے سویرے چلے گئے ہونگے اور سورج غروب ہوتے ہوتے دلی پہنچ گئے ہوں گے - ریس کے گھوڑے بری حالت میں بھی پچاس میل فی گھنٹہ ریس کرتے ہیں پھر میں تو سمجھتا ہوں حد سے حد بھی پانچ چھ بجے شام تک دلی پہنچ گئے ہوں گے -

خانصاحب: ہاں اور کیا - اگر سانڈنی پر بیٹھ کر گئے ہونگے تو اس سے بھی پہلے دلی پہنچ گئے ہوں گے -

میر صاحب: سنا ہے کہ جب میر صاحب نے مرزا صاحب کو عبدالصمد صاحب کے ساتھ دیکھا تو پوچھا کہ یہ کس کے صاحبزادے ہیں؟ اور عبدالصمد صاحب نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا کہ میر صاحب آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ بچہ فطری شاعر ہے اس پر میر صاحب نے کہا کہ بیٹا کسی مصرعہ پر فی البدیہہ مصرع لگا سکتے ہو؟ تو مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا کہ آپ کوئی مصرعہ دیجئے - اس پر میر صاحب نے کہا کہ اچھا اس مصرع پر مصرع لگاؤ -

"بخشش دو گر خطا کرے کوئی"

اس پر مرزا صاحب تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے کہ حضور آپ نے مصرع فرمایا تھا اگر میں اس کو قطعہ کر دوں تو کوئی حرج تو نہ ہوگا - میر صاحب بولے کہ کوئی

حرج نہیں ہے۔ اس پر مرزا صاحب نے گنگنا کر یہ قطع پڑھا۔

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی نہ کہو گر بُرا کہے کوئی!
روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

یہ سُن کر میر صاحب نے مرزا صاحب کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر گلے لگا لیا اور فرمانے لگے کہ یہ بچہ کسی زمانے میں اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔ مگر یہ جو شراب کی عادت مرزا صاحب کو لگی وہ دلّی پہنچ کر لگی۔ جب اُن کی شادی ہو چکی تھی اور اس کی ساری ذمہ داری مرزا آغا بیگ صاحب پر عاید ہوتی ہے جو اپنے زمانے کے بلا کے شرابی تھے۔ اور مرزا صاحب کے پیچھے ہر وقت چھل پیری کی طرح لگے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب بھی بلا کے شرابی ہو گئے اور پھر آپ جانتے ہیں کہ ؎

"چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شرابی کو اگر قارون کا خزانہ بھی دیدیا جائے تو وہ چار دن میں اُڑا کر رکھ دے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب مُغلیوں تک سے قرضہ لینے لگے۔

خانصاحب: یہ مغلیئے تو بلا کے ہوتے ہیں۔ قرض خواہ کا کفن تک نہیں چھوڑتے۔

میر صاحب: اب ایک لطیفہ سنئیے۔ وہ مرزا صاحب کا جو شعر ہے نہیں کہ :-

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اس کا بھی اسی قرض ۔کے ۔۔۔ یعنی دین سے تعلق ہے۔ جس کی اطلاع آجتک اتنی شرحیں لکھنے والوں میں سے کسی کو نہیں معلوم۔

خانصاحب: بھئی یہ بات تو آپ نے عجیب کہی!

میر صاحب: ارے صاحب! اس شعر کے پیچھے تو ایک بہت بڑی تلمیح ہے جو سوائے ہمارے خاندان والوں کے کسی کو نہیں معلوم۔

خانصاحب: ارے بھئی ہم بھی تو سنیں۔

میر صاحب: خان صاحب ہوا یہ کہ مرزا صاحب یوں تو ہما شما سبھی سے قرض لیتے تھے لیکن ان سے ایک مرتبہ غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے دہلی کے یار محمد خاں مغلیہ سے بھی قرضہ لے لیا۔ اور یہ مغلیہ بلا کا بکیٹ تھا اور کسی بدمعاشی میں سہذ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے بار بار مرزا صاحب سے قرضے کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور جب وہ نہ دے سکے تو ایک دن جب مرزا صاحب حوض قاضی کے پاس سے گذر رہے تھے تو اس نے مرزا صاحب کو آ دھمکا۔ اور سر راہ ان سے ہاتھا پائی کر کے ان کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس پر ایک خلقت جمع ہو گئی۔ اتفاق سے اسی درمیان میں مرزا صاحب کی ڈومنی بازار سیتا رام کدو اور لوکی خریدنے نکلی تھی اس نے جو بھیڑ دیکھی تو صفوں کو چیرتی پھاڑتی اندر پہنچ گئی اور دیکھا کہ وہ مردود مغلیہ مرزا صاحب کے سینے پر سوار ہے۔ جب مرزا صاحب کی نظر ڈومنی پر پڑی چونکہ انکی طبیعت ہر حال میں موزوں رہتی تھی اس لئے انھوں نے فی البدیہہ ڈومنی سے مخاطب ہو کر کہا ؎

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے"
"کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟"

مقصد یہ کہ غالب تو ان کا تخلص تھا مگر اس وقت مغلیہ ان پر غالب تھا۔ اسی لئے مغلوب ہونے کی صورت میں انھوں نے ڈومنی سے کہا کہ ان حالات میں بتلاؤ ہم کیا ہیں۔

خانصاحب: (قہقہہ لگا کر) بھئی بات تو پتے کی کہی اور مرزا صاحب کچھ ایسے اردب میں تھے کہ اپنے کو غالبؔ کہتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ کیونکہ اُس وقت دُنیا کسی قیمت پر اُن کو غالبؔ ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ واللہ میر صاحب! یہ تلمیح تو کسی کے باپ کو بھی نہیں معلوم ہوگی وہ چاہے ایک نہیں ہزار صد سالہ برسی منائیں۔

میر صاحب: ارے صاحب یہی تو میں کہتا ہوں کہ تمام حضرات جو اپنے آپ کو غالبیات کا ارسطو سمجھتے ہیں وہ ابھی غالبؔ کی تحقیقات کے سلسلے میں سالہا سال ہمارے خاندان والوں کے آگے پانی بھریں۔

خانصاحب: اماں واللہ میر صاحب! آپ کی دادی نے مرزا صاحب سے جب وہ دلّی سے واپس ہوئے تھے تو یہ نہ پوچھا کہ میر صاحب کس وضع قطع کے آدمی تھے۔؟

میر صاحب: اے پوچھا کیوں نہیں۔ مرزا صاحب بتاتے تھے کہ بالکل رینک سلائی سے تھے۔ اور چہرے پر محبت کے مارے ہوؤں پر جو افسردگی برستی ہے وہی اُن پر برستی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد باتیں کرتے کرتے غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ اور سینہ مسوس مسوس کر رہ جاتے تھے۔

خانصاحب: لیجئے یہ کہ اپنی محبوبہ کو یاد کر کے غوطہ میں پڑ جاتے ہوں گے۔؟

میر صاحب: خاں صاحب! محبت کی نہ پوچھئے۔ اُس نے کیسے کیسے مجنوں فرہاد اور وامق کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔

خانصاحب: اے وہ تو کہئے۔ کچھ عرصہ تک جنون طاری رہا اور کائنات عالم کی ہر چیز میں ان کو محبوبہ نظر آتی رہی۔ ورنہ تیشہ مار لینے میں کون سی کسر باقی تھی جہاں فرہاد نے مار لیا تھا وہاں ان سے کیا بعید تھا۔ سچ ہے میر صاحب ؎

عشق ازیں بسیار کردست وکند

میر صاحب: اے میں تو سمجھتا ہوں کہ میر صاحب زندگی بھر کنوارے رہے ہونگے اور میر عرش جنہیں لوگ میر صاحب کا لڑکا بتاتے ہیں اُسے انہوں نے گود لے لیا ہوگا؟

خانصاحب: ہاں اور کیا اگر وہ آخر عمر میں کہنے سُننے سے شادی کرنے پر آمادہ بھی ہوئے ہونگے تو کس کی لڑکی ایسی فالتو تھی جو میر صاحب کے سر منڈھ کر عبلیتی مکھی نگل لیتا ۔ پھر صاحب جو اس عاشقی معشوقی کے سلسلہ میں دیوانہ رہا ہوگا۔۔۔ اسے تو ساری زندگی بے روزگاری کا منہ دیکھنا پڑا ہوگا اور ایسے بے روزگاروں کو لڑکی دینا تو بڑی چیز ہے کوئی لیٹنے کو کھٹیا تک دینے کو تیار نہ ہوا ہوگا ۔

میر صاحب: خانصاحب! میر کلو عرش ہی کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ایسے ویسے رہے ہوں گے جو کلو کلو کے نام سے مشہور ہوگئے بھلا میر صاحب جو کہنا چاہیئے کہ نجیب الطرفین سیّد تھے وہ تو جوانی میں بڑے سرخ و سپید رہے ہوں گے ۔ کیونکہ جب مرزا صاحب ان سے ملے ہیں اس وقت وہ خاصے عمر رسیدہ تھے مگر چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ بقول شاعر ؎

"آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی"

خانصاحب: مگر ایک بات اگر عبدالصمد صاحب چاہتے تو میر صاحب سے دریافت کرلیتے کہ ان کی محبوبہ آیا خان آرزو صاحب کی لڑکی تھی یا سالی؟

میر صاحب: ارے صاحب! خان آرزو صاحب کی لڑکی نہ ہوتی تو وہ میر صاحب کو گھر سے نکالتے ہی کیوں ۔۔۔ چنانچہ عبدالصمد صاحب نے میر صاحب سے باتوں باتوں میں دریافت کرلیا کہ وہ کون محترمہ تھیں، دادی جان کہتی تھیں کہ جب اگدی کھجلا کر عبدالصمد صاحب نے بمذبذب یہ بات میر صاحب سے دریافت کی

اور خان آرزو صاحب کا کچھ حوالہ دیا تو میر صاحب کچھ جھینپ سے گئے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خان آرزو صاحب کی صاحبزادی ہی رہی ہوں گی ورنہ اگر سالی کا معاملہ ہوتا تو خان آرزو صاحب کو ہمزلف بنا لینے میں زیادہ پس وپیش نہ ہوتا۔

خاں صاحب: اچھا صاحب! چھوڑیئے اِن باتوں کو اب تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مرزا صاحب کی صدسالہ برسی منانے والے کس شان سے برسی مناتے ہیں۔ اور کون کون سی من گڑھنت باتیں ان سے منسوب کرتے ہیں۔ بھئی اب گیارہ کا عمل ہے، اب اجازت دیجئے۔ "یار زندہ صحبت باقی۔"

غالب کا خط
ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

صاحب تم نے شادی کیا کی ساری دنیا کو بھلا دیا۔ اپنے جملہ حقوق اِس طرح رفیقۂ حیات کے نام محفوظ کر لیے کہ دوست احباب تمہاری صورت کو ترس گئے۔ شادی سب کرتے ہیں مگر اِس طرح آپے سے نہیں گذر جاتے۔۔۔ اب نہ آتے ہو نہ جاتے ہو ضخیم ضخیم کتابیں لکھ کر ادیبوں کو شرماتے ہو۔ دُبلوں کو رُلاتے ہو، موٹوں کو ہنساتے ہو۔ پڑھنے لکھنے میں بھی وہ آن ہے کہ پٹھانوں جیسی شان ہے۔ کیا فصاحت ہے اور کیا بلاغت سچ پوچھو تو ریاضت میں عبادت اور عبادت میں ریاضت ہو۔ پچھلے ہفتے ہوش بلگرامی آئے تھے تمہاری لکھی ہوئی دو کتابیں مزدوروں پر لدوا کر لائے تھے۔ ایک میاں حکیم مومن خاں مومن کی کلیات تھی جس پر تمہارے مقدمے کی بہتات تھی، دوسری کلیات میر تقی میر کی تھی جس میں متعدد کاتبوں کی تحریر تھی۔ تم نے کلیات میر کو دوبارہ بخشی گویا میر کی روح کو راحت بخشی۔ لکھنے میں اتنی ریاضت کرتے ہو کہ کاتب کو تصحیح کرنے کی بھی مہلت نہیں دیتے۔ کلیات میں غلطیوں کے انبار ہیں جو پڑھنے والوں کی طبیعت پر بار ہیں۔ اب میں کاتبوں کی تعریف کروں یا تمہاری کوتاہیوں پر حرف دھروں، تم نے ایک کتاب لکھی اور دو دو کے مؤلف اور مصنف بن بیٹھے۔ ایک تمہارا کارنامہ دوسرا

اس کا غلط نامہ۔ تم نے غزل پر کتاب لکھ کر غزل گو شعراء کو عرش پر پہنچایا اور نظم نگاروں کو نیچا دکھایا۔ اور پھر غزل پر وہ طبع آزمائی کی کہ اگر غزل حسن پائے تو اپنا گریبان پھاڑ کر کسی طرف نکل جائے۔ کہو جوش ملیح آبادی کی نظر سے تمہاری کتاب گذری؟ اُن کے دل و دماغ پر اسے پڑھ کر کیا گذری؟ کلیات میر کے مقدمے میں تو وہ زور ہے کہ پاکستان سے ہندوستان تک شور ہی شور ہے۔ بابائے اُردو تو مقدمہ باز تھے تم سپریم کورٹ کے جج نکلے۔ اُستاد گرُو رہے چیلے شکر ہو گئے۔ وہ جو شاعر نے کہا تھا ـــ ٹھیک ہی کہا تھا:۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

تم نے طلسم ہوش ربا میں تنقید اور تنقید میں طلسم ہوش ربا لکھ کر تنقید نگاروں کو بجر بکہ اِن بنا دیا اور تنقید کو ایسی رمضان عتیق کی تاریخ بنا دیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے الانہ منہ سے بولے اور نہ سر سے کھیلے صرف ہاتھ باندھے تمہاری سُنتا رہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تنقید کو چوڑا چکلا کس نے کیا تو میں کہوں گا عبادت بریلوی نے۔ عنوانات کی وحدت کو کثرت الفاظ کے جلوے دکھانا کوئی تم سے سیکھے۔

ہندوستان کی تقسیم نے کیسے کیسے برگزیدہ ادیبوں کو اُکھاڑ پھینکا اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا پہنچے۔ انور حسین، آرزو، سیماب، نیاز، اور اور میاں شاہد احمد .... پاکستان کی راہ یہاں آ پہنچے ہیں۔ ظفر علیخاں یعنی صحافیوں کے علی قلی خاں برسوں پطرس بخاری عبدالمجید سالک کے ہمراہ آ گئے تھے۔ جعفر علیخاں اثر اب آئے ہیں۔ ہائے کیسا کیسا جوان زندہ درگور ہوا ہے۔ وطن کی تبدیلی ولدیت کی تبدیلی سے کم نہیں ہوتی۔ میں نے مرتے مرتے نظام الدین نہیں چھوڑا میں اب تک ایک زمین دوز مکان میں مقیم ہوں۔ سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر ہونے کی خبر ہے۔ ابھی معاملہ کھٹائی میں پڑا ہے۔ قبر پختہ ہو چکی ہے۔ جگہ کا احاطہ کر دیا گیا ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں شعراء اپنے اپنے شعروں سے نشتر چبھوتے ہیں۔ ایک بار تبسم اور عبدالمجید سالک لاہور سے ہندوستان آئے تھے میرے مزار پر بھی تشریف

لائے تھے۔ دل چاہا کہ اُٹھ کر لپٹا لوں اور حیاتِ رفتہ کو واپس بلالوں۔ پر اتنی توانائی کہاں سے لاؤں۔ پروفیسر احتشام حسین دلّی آتے ہیں میرے مزار پر نہیں آتے۔ وہ ترقی پسند ہیں تنزل پسند کے مزار پر کیوں آنے لگے؟ وہ سید ہیں، مغل نہ وہ لفف دلیں رند شاہد باز مجھ سے اُن کو کیا دلچسپی؟ تضاد اور پھر تضاد مبیّن۔

دفارِ عظیم کو ایک خط علیحدہ سپرِ ڈاک کیا ہے۔ اُن کو دعا کہو۔ حکیم مومن خاں مومنؔ پر تمہارا کئی میل لمبا مقدمہ پڑھ کر دو ایک ہفتے تکان دور کروں گا۔ پھر کلیاتِ میرؔ کا مقدمہ پڑھ کر اپنی تندرستی کی فکر کروں گا۔

خطۂ اعظم گڈھ کے ایک پختہ شاعر میاں شمیم کرہانی نے میرے مزار پر آ کر وہ قصیدہ خوانی کی ہے کہ اُس کا ایک شعر بیٹھا اِس وقت بھی گنگنا رہا ہوں اور تنہائی میں اس کا لطف اُٹھا رہا ہوں۔ تم شعر پڑھو میں سر دُھنتا ہوں ۔

کعبۂ اہلِ نظر مدفنِ غالبؔ ہے یہی !
محوِ خواب اک دلِ بیدار اسی خاک میں ہے

چندہ بازانِ جہاں را بتجارت منگر

(کنڈی کھٹکھٹانے کے بعد)

مرزا صاحب: اجی فدن صاحب ہ اے قبلہ فدن صاحب! اے حضرت! کہنا چاہیئے کہ آٹھ کا عمل ہے اور ابھی تک آپ گھوڑے بیچ پڑے ہیں۔

فدن صاحب: (بستر پر لیٹے لیٹے غنودگی کے عالم میں) اماں کون! مرزا صاحب! تو چلے آؤنا، اے ذرا اور دھیمے سے آواز نکالی ہوتی — بھئی کیا زنانی آواز نکالی ہے۔

مرزا صاحب: اے قبلہ! آپ نے تو سونے کی حد کر دی یعنے کہ آفتاب جب سوا نیزے پر آیا تو آپ مُرغ کی اذان پر کان لگائے پڑے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حضور والا! وہ جشن صد سالہ کے سلسلے میں بنّے صاحب کے گھر پر جو کانگریسی جلسہ کر رہے ہیں اس میں چلنا ہے یا نہیں؟

فدن صاحب: ارے بھائی چلیں گے اور ضرور چلیں گے۔

مرزا صاحب: ارے تو اُٹھو نا! نہیں تو جلسہ ختم ہونے کے بعد پہنچے تو کیا پہنچے!

فدن صاحب: اماں چائے پان ہی تو ہے۔ اس کے بعد چندے کی باتیں

ہوں گی اور محلے کے موٹے موٹے جو آجکل کانگریس کی دُم میں گھسے ہیں اور درمیانی مدت والے الیکشن میں سیٹ کی مکھی پر بگلے کی طرح نشست لگائے بیٹھے ہیں انہیں کس کے دو بلا جائے گا۔

مرزا صاحب: یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے۔ بات یہ ہے کہ اب پبلک تو کانگریس کو گھاس ڈالنے کو تیار نہیں کیونکہ یہ بات ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ الیکشن سے لیکر جشن صدسالہ تک سب کھانے پینے کی باتیں ہیں اور اب کانگریس کو جو ادھر اُدھر سے مارے ہوئے ڈونیشن ملتے تھے وہ بھی لوگ دینے کو تیار نہیں کیونکہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ سب کے سب بزنس کے طور پر الیکشن لڑتے ہیں۔ چار لگاتے ہیں اور سولہ پاتے ہیں اور پبلک "دکان کرانہ نفع کندہ" بن کر رہ جاتی ہے یہ تو کھلا سٹہ ہے۔ قوم و ملک سے اگر کوئی ہمدردی تھی تو پس گاندھی جی کی زندگی تک تھی سو اُن کی شہادت کے بعد سے اب یہ سب قوم کی نانذوں میں منہ ڈالے پڑے ہیں۔ ایک نہیں لاکھ دُم مروڑیئے یہ نا نذ نہ چھوڑی ہے نہ چھوڑیں گے۔ اب دیکھئے نا تقسیم سے قبل تک جو گلی کوچوں میں "پانڈت پانڈت" کی ہانکیں لگا کر پیسہ دو پیسہ ہاتھ دکھلوائی لیتے تھے۔ اب کونسل، اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر بنے بیٹھے ہیں۔ اور "جو مورے سو راجہ کے ناہیں" حرام میں جنتا کا روپیہ اُڑا رہے ہیں اور جنتا کی جیبیں کاٹنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چنانچہ اس درمیانی الیکشن کے لئے یہ سوچ میں پڑے تھے کہ اب کس کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑی جائے تاکہ جنتا کی جیبیں کاٹنے کا موقع ہاتھ آئے۔ سو اب انھوں نے غالب کی صدسالہ برسی کا ڈھونگ رچایا ہے۔

قدن صاحب: بھائی مرزا تمہارا قطع کلام ہوتا ہے۔ میاں ذری یہ تو بتاؤ کہ یہ جشن صدسالہ کا مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ مرزا صاحب کے مرنے کا جشن منانے جارہے ہیں؟

مرزا صاحب: ارے صاحب اُردو کا شاعر مرا ہے اور پھر اتنا بڑا شاعر مرا ہے جو تمام ہندوستان کے شاعروں پر غالب ہے۔ اس کا یہ جشن نہیں منائیں گے تو کیا سوگ منائیں گے۔؟

فدن صاحب: بھئی کیا کہنے ہیں اِن لکشمی پوجا والوں کے!!

خود قتل بھی کرے ہے خود لے تواب اُلٹا

مرزا صاحب: ارے بھئی "شکر خورے کو شکرا اور موذی کو ٹکر" والی مثل انھیں پر تو صادق آتی ہے۔ نہیں تو کیا یہ ہم آپ پر صادق آئے گی۔ جو جان اور مال دونوں سے جا رہے ہیں۔ اور زبان پر مہندی کا نمنا کسا ہے۔

فدن صاحب: آپ نے ابھی اخبار میں پڑھا ہوگا کہ انھوں نے پبلک کو دھوکہ دینے کے لئے ایک ترپ کی دُگی اور چلی ہے اور اعلان کیا ہے کہ یہ جشن الیکشن کو روک کر پہلے منا لیا جائے گا تاکہ اِدھر اُردو داں طبقہ سے جتنی رقم بٹوری جا سکے بٹور لیں اور اس کے بعد اسی رقم سے الیکشن لڑیں۔ اسے کہتے ہیں ؎

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

اس میں کروڑوں اربوں کی رقم کٹے گی اور خوشی خوشی اُردو داں طبقہ چندہ دے گا اور جو نہیں دے گا اس سے زبردستی لیا جائے گا۔ فہمیدی یا فہمیدیاؤں اسی کو تو کہتے ہیں "مارے اور رونے نہ دے۔"

مرزا صاحب: بھائی فدن صاحب! یہاں تو بقول شخصے ہم بھی قائل ہو گئے اماں یہ کانگریسی کمال کر رہے ہیں۔ ایک طرف مندر بنوا رہے ہیں اور دوسری طرف پوجاری قتل کئے جا رہے ہیں۔

فدن صاحب: ارے صاحب ایک اور لطیفہ بھی اس سلسلہ میں سنتے چلیے۔ سُنا ہے کہ جن سنگھ والے بھی اِس میں شریک ہیں اور وہ بھی چندہ جمع کر رہے ہیں۔

مرزا صاحب: ارے بھائی جب جنگل میں کوئی جانور مرتا ہے تو رقم رقم کے گدھ اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اس میں کیا گدھا اور کیا جرگدھ۔

کہ دریں ابن فلاں ابن فلاں چیزے نیست

فدن صاحب: بھئی مرزا! کس خوبصورتی سے میاں جامی کو لاکر تم نے اِس موقع پر فٹ کیا ہے، ہے ہے۔ واللہ قبر میں اپنے مصرعہ کی اِس درگت پر دو چار کروٹیں تو مرحوم نے لے ہی لی ہوں گی!

مرزا صاحب: اے یہ جشن بھی تو غالب کی قبر پر کروٹیں لوانے کے لئے منایا جارہا ہے۔ ایک طرف تو اُردو زبان کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اس کا نام تک لینا گناہِ عظیم سمجھا جارہا ہے اور دوسری طرف اسی زبان کے ایک شاعر کو بھارت کا ایک عظیم شاعر قرار دیکر اس کی برسی منائی جارہی ہے ؎

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

فدن صاحب: ارے صاحب اگر ان میں سے کسی کو غالب کی اس ظاہرا عقیدت کا ایک سواں حصہ بھی اُردو سے ہمدردی ہوتی تو ایسا کرتے کہ اِس روپے کو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تقسیم کرکے وہاں غالب اکیڈمی کے نام سے ایک شعبہ کھلوا دیتے تاکہ ہر یونیورسٹی میں غالب پر جن لوگوں نے کام کیا ہے۔ اُنہیں رکھ کر اُن سے مزید تحقیق کرائی جاتی۔ دلّی یونیورسٹی کو جو غالب پر اتنے عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ دس بیس لاکھ روپے دیدیتے تاکہ اِس شعبہ کو اور زیادہ وسعت دے دی جاتی، اور دو چار آدمی غالب کے سلسلہ ہی میں روٹیوں سے لگ جاتے اور مرکزی حکومت کا نام ہوجاتا اور غالب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتے۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ ہر شخص غالب کے نام پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے ؎

"بابا آنما بھوکی ہے کچھ ٹن کیئے جاؤ غالب کے نام پر" واہ رے بہادروں کیا دُنیا کو دھوکے میں

مبتلا کیے ہو۔

مرزا صاحب: اماں فدن صاحب ہیں تو یہ کہتا ہوں کہ دوسری قومیں جو ان کی یہ حرکتیں دیکھ رہی ہیں وہ اپنے دل میں کیا کہتی ہوں گی؟

فدن صاحب: اے ان کو اس سے کیا غرض یہ تو خیر چکنا گھڑا ہیں مگر یہ تو بتاؤ کہ یہاں کی جنتا کے بارے میں غیر ملکوں کے لوگ کیا رائے قائم کیے ہوئے بیٹھے ہوں گے کہ ایک طرف تو غالب کے نام پر روپیہ کھسوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف راجدھانی میں کارپوریشن کی طرف سے ہر کام ۱۵ اگست ۱۹۶۸ء سے ہندی میں شروع ہو گیا ہے اور اُردو کو نکال پھینکا گیا ہے۔ پھر ریاستی اسمبلیوں میں کوئی ممبر اردو میں حلف نہیں لے سکتا۔

مرزا صاحب: اور یو۔ پی میں تو بچے بچے کو یہ ہندی پڑھا پڑھا کر ایسا مستند جاہل بنائے دے رہے ہیں کہ پڑھ لکھ کر ان سے تو کوئی اپنے گھر کا غلیظ بھی نہیں اُٹھوائے گا اور اُردو کے نام سے تو اتنی نفرت ہے کہ وہ علاقے جہاں خالص مسلم آبادی ہے اور کوئی متنفس ہندی کا نام نہیں جانتا وہاں سڑکوں کے نام جن پتھروں پر اُردو میں لکھے ہیں اُن کو کھرچ کھرچ کر یا تو مٹا دیتے ہیں یا اُس حصّہ کو جس پر اُردو لکھی ہوتی ہے اسے چھپا دیتے ہیں۔ مگر یار یہ جن سنگھ والے اس جشن میں کیوں پیش پیش ہیں؟

فدن صاحب: ارے صاحب جب کوئی چور چوری کر کے بھاگتا ہے تو وہ سب سے آگے چور چور کہتا ہوا بھاگتا دکھائی دیتا ہے اُن کو بھی تو دلّی میں اندر ورغہ ل کے مرنے سے جو کانگرسی سیٹ خالی ہوئی ہے اس کا الیکشن کانگریس کے مقابلہ میں جیتنا ہے اور اُردو داں طبقہ سے ووٹ لینا ہے۔ زیادہ نہ سہی بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سہی۔ مسلمانوں میں غدّاروں کی کوئی کمی ہے؟ تم دیکھ لینا آئندہ جو درمیانی مدت کے الیکشن ہونے جا رہے ہیں اس میں بعض غدّار پھر کانگریس کو ووٹ دیں گے۔

مرزا صاحب: دوسرے فدن صاحب! یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی

کہ ایک شخص جو آج شام سوتے وقت تک جن سنگھی تھا وہ دوسرے روز سویرے جب آنکھ کھولتا ہے تو کانگریسی کیسے ہوجاتا ہے اور کانگریس اس کو قبول کیسے کرلیتی ہے ؟

فدن صاحب : ارے صاحب! یہ سب دانا بدول والی باتیں ہیں۔ حضور! اس کو بھی ایک قسم کی نس بندی سمجھئے۔ آپ نے سنا ہی ہوگا کہ جو رکا بھائی گرہ کٹ، تو جب پوری پبلک یہی کام کررہی ہے تو پھر اس میں محمود اور ایاز کی تشخیص کیسی، ہر شخص محمود بھی بن سکتا ہے اور ایاز بھی۔

مرزا صاحب : بھئی میں تو کہتا ہوں کہ بہروپئے کو اگر آپ کو اجتماعی شکل میں دیکھنا ہو تو واللہ ایک نظر کانگریس پر ڈال لیجئے۔ بھئی مہاتما جی ٹھیک ہی کہہ گئے ہیں کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب یہ کانگریسی ٹوپی تھری ناٹ تھری کہلائے گی۔ اور لوگ کانگریس کو برادران یوسف سمجھ کر بھاگیں گے۔

فدن صاحب : تو پھر اُردو والے جب ساری چالیں سمجھتے ہیں تو اُردو کے لئے کچھ کہتے کیوں نہیں ؟

مرزا صاحب : کہیں تو کس سے کہیں اور کس لئے کہیں ؟ کیونکہ ہر شخص نو کانگریس میں باون گزا ہے۔ جو نہیں ہوتا ہے وہ عہدہ پاکر ہوجاتا ہے، اماں! میں تو کہتا ہوں کہ فخر الدین علی احمد صاحب جو اس بڑی کے منوانے میں پیش پیش ہیں ان سے کہا جائے کہ وہ اس کی تحریک کریں اور دلّی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو والوں کو فخر الدین علی احمد صاحب سے اس سلسلہ میں بات کرنا چاہئے۔ آخر یہ یونیورسٹی کا سب بڑے گھر کی بہو بیٹیاں بنے کیوں بیٹھے ہیں ؟ میں کہتا ہوں کہ کانگریس کے ان کفن کھسوٹوں میں اگر ذرہ برابر بھی اخلاص اور دیانت داری ہے تو یہ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں جو کروڑ ہا روپیہ جمع ہو رہا ہے اس سے دلّی میں ایک غالب یونیورسٹی بنوادیں مگر اُردو کے نام سے تو ان کا دم نکلتا ہے۔

فدن صاحب : یہ ایک نہیں لاکھ اُردو کی نس بندی کریں وہ بہرحال پھولتی پھلتی

رہے گی۔ البتہ یہ جو کوشش ہے کہ ہیجڑے کے گھر لڑکا پیدا ہو جائے اور ہندی بھارت کی عوامی زبان بن جائے تو یہ ناممکن ہے، اماں کبھی کسی زنخے کے یہاں بچہ ہوا ہے؟ کہ ان ہی کے یہاں ہو جائے گا۔ نیچے کے مخارج سے بولنے والی زبان اوپر کے مخارج سے بولی کیسے جا سکتی ہے؟ اماں رِچ، پ، ڈال کو بھلا اوپر والی منزل سے کیا واسطہ؟

مرزا صاحب: مگر یار میرے!

کون سنتا ہے فغانِ درویش

قہرِ درویش بہ جانِ درویش

فدن صاحب: اچھا اِن سالوں کی رکھے تا بازیوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ جلسے میں چلنا ہے کہ نہیں۔

مرزا صاحب: اماں چھوڑو، جتنی باتیں جلسہ میں ہوتیں اس کی چوگنی باتیں ہم نے آپ نے بیٹھ کر کر ڈالیں اب وہاں جا کر کیا کریں گے۔

فدن صاحب: اچھا مرزا! تو بھائی اِس جشن کی کامیابی کے لئے دست بدعا رہنا اور اگر کوئی موقع نکلے تو ایک ذری بھوارکا رُخ اِدھر بھی موڑ دینا۔ آج کل بڑی تنگی ہے۔

غالبؔ کا میمورنڈم بارگاہ ایزدی میں

گھر میں سناٹا تھا۔ بڑے بچے اور بچیاں کالج اور اسکول گئے ہوئے تھے۔ گھر کی مالکہ یعنی رفیقۂ حیات بھی علی گڈھ گئی ہوئی تھیں۔ اس لئے "خانہ خالی را دیو میگرد" والی مثل مجھ پر صادق آ رہی تھی اور بقیہ تین چھوٹے بچوں کی موجودگی میں میرے ہر بُنِ مو سے آوازیں نکل رہی تھیں ع

مرا ہندوستاں ہے اور میں ہُوں

اتنے میں ڈاکیئے نے آواز دی "ڈاک لے لیجیئے"۔ ڈاک میں پہلا خط جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی کا تھا۔ جو ایک نہایت ضخیم ملّت قسم کا غالبؔ نمبر نکال رہے ہیں۔ اُس کے لئے اس خط میں مضمون کا تقاضہ تھا۔ کالج سے میں ویسے ہی گھر پہنچا تھا اور تھکا ہوا تھا اس لئے قدرے کمر سیدھی کرنے کے لئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور صرف ایک ہی خط پڑھ پایا تھا کہ نیند کا ایک ایسا جھونکا آیا کہ آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں اور میں خراٹے لینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سوتے میں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے آواز دی "سواری اُتروا لیجیئے"۔ اور اس کے بعد ہی ایک محترمہ آ کر کرسی پر جو میرے پلنگ کے پاس بچھی تھی۔ بیٹھ گئیں اور میرے کچھ کہنے سے پہلے اُنہوں نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی رفیقۂ حیات ہوں۔

شادی کے بعد سے میں اکیلے مکان میں جبکہ گھر والے اور بچے بھی نہ ہوں اس طرح کے خواب دیکھنے کا عادی نہیں رہا ہوں۔ کیونکہ اس سے اوّل تو ازدواجی تعلقات میں فرق پیدا ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دوسرے بچوّں کے اخلاق پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے اور تیسرے میاں بیوی کے درمیان کوروپانڈوؤں کی جنگ، کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

مرزا صاحب کی رفیقۂ حیات جو میرے مقابل آکر بیٹھ گئی تھیں۔ یقیناً مرزا صاحب سے حسین تھیں۔ ستُواں ناک، بھرا بھرا کتابی چہرہ، سُرخ و سپید رنگ، گدبدے ہاتھ پاؤں، بڑی بڑی آنکھیں اور پیشانی پر مسلسل عبادت اور ریاضت کے سبب گول سیاہ گھٹّا پڑا تھا جو ان کی سرخ و سپید پیشانی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کیرم بورڈ کی سیاہ گوٹ سفید سنگ مرمر کے کسی ٹکڑے پر گر پڑی ہو۔ عمر یہی کوئی تیس پینتیس کے لگ بھگ ہو گی چہرے مُہرے سے پتہ چلتا تھا کہ دو چار کچّے بچّوں کے سوا انہوں نے کوئی بچہ دل لگا کر نہیں پیدا کیا اور نہ اس سلسلہ میں کوئی خاص توجہ برتی ـــــ اسی لئے کمزور ہونے کے سبب اُن کے سارے بچّے سال سوا سال تک زندہ رہ کر مرزا صاحب کو داغِ جُدائی دے گئے میں نے مزاج پرسی کے بعد پوچھا کہ کیسے تکلیف فرمائی؟ تو بولیں: " مجھے اُمراؤ بیگم کہتے ہیں اور میں مرزا صاحب کی رفیقۂ حیات رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عالمِ برزخ سے مرزا صاحب آپ کو برابر خط لکھتے رہتے ہیں۔ اس لئے مجھے خیال ہوا کہ اُنھیں آپ سے یا آپ کو اُن سے کوئی خاص عقیدت ہے۔ لہٰذا اوّل تو میں آپ سے یہ مشورہ کرنے آئی ہوں کہ میری اور مرزا صاحب کی اجازت کے بغیر آپ کے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں مرزا صاحب کی جو صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے اور جس میں دنیا بھر کے چندے اور عطیات وصول ہو رہے ہیں اُس میں کیا کوئی گنجائش میرے لئے بھی نکل سکتی ہے؟ اور مرزا صاحب کی زوجہ ہونے کے ناتے مجھے بھی دس بیس ہزار روپے بحق زوجیت مل سکتے ہیں؟ میں اپنے ساتھ اُس میمورنڈم کی نقل بھی لائی ہوں جو مرزا صاحب

نے بارگاہِ ایزدی میں اُردو کے سلسلے میں ابھی حال میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ بھارت میں آزادی کے بعد سے اُردو کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک ہو رہا ہے۔ اس سے مرزا صاحب بھی حد درجہ دل برداشتہ ہیں اور اس سلسلے میں وہ عالمِ برزخ میں بھی اُردو کے لئے بڑا کام کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ یہ سُن کر بہر حال بڑی خوشی ہوئی کہ عالمِ برزخ میں بھی اُردو کی نشر و اشاعت کا کام زور دوں پر ہو رہا ہے۔ اور اس کا اندازہ مجھے اس سے بھی ہوا کہ آزادی کے بعد سے نہ جانے کتنے اُردو کے ادبا و شعرا ہمارے ملک سے جا چکے ہیں کیونکہ یہاں اُردو کے ساتھ ایسا سلوک ہو رہا ہے جیسے ایک طرف کوئی شخص پجاریوں کے سر قلم کر رہا ہو اور دوسری طرف پرشاد تقسیم کیا جا رہا ہو۔ اور مندر تعمیر ہو رہے ہوں تاکہ دنیا والے یہ سمجھیں کہ بڑا نیک کام انجام دیا جا رہا ہے۔ اور جب بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوں تو پچاس فیصدی ثواب کے دعوے دار ہو جائیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ پاکستان کی سرحد پر سُنا ہے ایسے کٹّر اور عقیدت مند قسم کے مسلمان بستے ہیں جن میں اگر کوئی سیّد زادہ پہنچ جاتا ہے تو اُسے مار کر وہیں دفنا دیتے ہیں اور اس کی قبر بنا کر مختلف تقریبات منانا شروع کر دیتے ہیں اور اس بد نصیب سیّد کی وساطت سے اللہ تک اپنی فریادیں اور مُرادیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ کبھی قبر پر چادر چڑھاتے ہیں، کبھی قوالیاں کراتے ہیں، اور لڈّو، ریوڑیاں اور دوسرے چڑھاوے چڑھا کر اپنی غیر معمولی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، مزار کے پینتانے کھڑے ہو کر نہایت خشوع و خضوع سے اپنے قصور معاف کراتے ہیں اور توبہ و استغفار پڑھ کر اپنے گناہوں کی معافی کے طالب رہتے ہیں ہمارے ملک میں اُردو کے ساتھ بھی ماشاء اللہ ایسا ہی سلوک کیا جا رہا ہے۔ حاشا آپ اسے کسی بد نفسی یا طبعیت کی رکاکت پر محمول نہ کیجئے۔ بلکہ اس میں وہی شخصی عقیدت بدرجۂ اتم موجود ہے جو سیّد کو مار کر قبر بنانے والوں میں پائی جاتی ہے۔ جونہی ہمارا ملک آزاد ہوا تو ہمارے ملک والوں نے اُردو سے اپنی مذہبی عقیدت ظاہر کرنے کے لئے اُسے نہ صرف

اس کی جائے پیدائش میں قتل کر دیا بلکہ جہاں جہاں یہ پروان چڑھی تھی اور جن جن جگہوں پہ اس کے عقیدت مندوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ تھی وہاں اس کے مقبرے بنوا دیئے۔ اب اس کی قبر پر مختلف قسم کی تقریبات منائی جاتی ہیں۔ اور اظہارِ عقیدت میں آل انڈیا مشاعرے اور سمناشر سے منعقد ہوتے ہیں۔ منسٹر صاحبان سے لیکر بڑے بڑے ادبا روشعراء اور بنیا اُن مشاعروں میں مدعو ہوتے ہیں۔ اس کی صدارت کرتے ہیں اور ایکشی جلسوں میں اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس کے اوصافِ حمیدہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کی ملکی و ملی خدمات کو سراہتے ہیں۔ اور اس کے بڑے بڑے شعراء کے "ڈے" اور "نائٹ" مناتے ہیں۔ ان کے تیجے اور چالیسویں کے نام پر چندے جمع کرتے ہیں۔ اس کی لطافت اور شیرینی کے گُن گاتے ہیں۔ اسے ہندوستان کی تیسری زبان کا درجہ دیتے ہیں اس کے سجادہ نشینوں کا سالانہ وظیفہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کی مدح سرائی میں کانفرنسیں ہوتی ہیں اور جب سرکاری یا غیر سرکاری اُردو داں یا غیر اُردو داں حضرات اپنی تقریروں میں اس کے حق میں کلمات خیر فرماتے ہیں تو کُل مجمع اس طرح بغلیں بجا بجا کر اور تالیاں پیٹ پیٹ کر اظہارِ مسرت کرتا ہے کہ جیسے اُردو کی سیدانی کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے اس کے شعراء و ادباء کو سالانہ وظائف دیئے جاتے ہیں۔ اس کی کتابوں پر انعامات تقسیم ہوتے ہیں اور اس طرح اس کا وہی احترام کیا جاتا ہے جو ایک عقیدت مند پٹھان ایک مقتول سیّد کا کرتا ہے۔ اب رہا آپکی کے حقِ زوجیت کا سوال تو آپ کا یہ مطالبہ اس وجہ سے ناقابل قبول ہے کہ ہمارا ملک ایک خالص جمہوری ملک ہے۔ جس میں ہر ذی رُوح اور غیر ذی رُوح چیز کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اسی لئے فسادات سے لیکر ہر قسم کی بداعمالیوں کو ایک عام چھوٹ حاصل ہے۔ ہمارے مُلک والوں کو انگریزوں سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ اُنھوں نے اپنے پونے دو سو سال کے دورِ حکومت میں بہت سی بے زبان اور معصوم چیزوں پر پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ جن کے سبب

اُن سب کا دم گھٹا جا رہا تھا - اب آپ خود انصاف فرمائیں کہ رشوت ستانیوں، ذخیرہ اندوزی، جھوٹ، مکر و فریب، دغا بازی، نے کس کا باپ مارا تھا جو اُن بے زبانوں پر قانونی پابندیاں عائد کر کے پونے دو سو برس تک اُن کا گلا گھونٹا جاتا رہا ہے - اس لئے جو نہی ہمارا ملک آزاد ہوا ہم نے پوری دیانتداری، انصاف اور جمہور نوازی سے کام لیتے ہوئے ان سادہ سی بھولی بھالی کی ساری بے زبان چیزوں پر سے پابندیاں ہٹا لیں - اسی لئے اب ماشاء اللہ نہ تو ذخیرہ اندوزی کو ہم سے کوئی شکایت رہی ہے نہ رشوت ستانی اور جھوٹ کو ہم سے بیر ہے۔ نہ دغا اور فریب کو ہم سے کوئی گلہ ہے اور نہ فسادات ہمارے شاکی ہیں - ہمارا ملک شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے - پھر ان حالات میں جبکہ ہم حقِ ولدیت اور حقِ وراثت کو تسلیم نہیں کرتے تو آپ کا حقِ زوجیت کس کھیت کی مولی ہے جو ہم اُسے تسلیم کریں - ہم نے جب والیانِ ریاست کے وراثتی حقوق اور مرکزی سرکار کے ملازمین کے جائز مطالبات نہیں تسلیم کیے تو آپ کے حقِ زوجیت کو کیسے تسلیم کر لیں - آپ نے کیا ہمارے ملک کو یورپ جیسا حقیر اور رذیل ملک سمجھ رکھا ہے جہاں کے زمین و آسمان کے نیچے بداعمالیوں تک پر بندشیں عائد ہیں اور جہاں آج تک کوئی قرینے اور قاعدے کا کام ہی نہ ہو سکا۔ بھلا اپنی اولاد اور اپنی ذات کے مقابلے میں ملک و قوم کا خیال کرنا اور اس کے لئے ایثار اور قربانی کرنا کس مذہب میں جائز ہے؟ یہ ضمیر فروشی نہیں تو پھر کیا ہے؟ کیا ہم اپنے ذاتی مفاد کو پس پشت ڈال کر قوم اور ملک کو چاٹتے رہیں اور اپنی ضروریات کا گلا گھونٹ دیں - یہ تو کبھی تک نہ ہم سے ہوا ہے نہ ہو گا - ہمیں خدا اُس دن کے لئے نہ رکھے جس دن ہمارے دل میں اپنے ذاتی مفاد کے مقابلے میں ملک و قوم کے مفاد کا خیال پیدا ہو - ہم اپنے بعد اپنے کنبہ والوں کی طرف جھکتے ہیں تو کیا بُرا کرتے ہیں - آپ نے کبھی پیٹ کے بجائے پیٹھ کی طرف گھٹنوں کو مُڑتے دیکھا ہے - پھر اگر ہم اپنی اپنی سوچتے ہیں تو کون سا گناہ کرتے ہیں؟ ہمارے نزدیک تو زندگی کا دوسرا نام لکشمی پوجا ہے نہ کہ ملک و قوم کا مفاد

اور اس کی پوجا؟

میری اس پوری گفتگو کو بغور سُننے کے بعد مرزا صاحب کی بیگم صاحبہ بولیں: "حضور والا میں نہیں سمجھتی تھی کہ آپ اپنے ملک کے اتنے بڑے مزاج داں ہیں اور اس کے رہنے والوں کی صلاحیتوں سے اس درجہ باخبر ہیں۔" میں نے کہا "اگر آج مزاج داں نہ ہوتے تو یہاں زندہ رہ کر آپ کے سامنے ان جیتے جاگتے حقائق کی پردہ کشائی کیسے کرتے؟"

اس کے بعد میں نے کہا "اچھا! اب وہ مرزا صاحب کے میمورنڈم کی نقل جو آپ لائی ہیں وہ بھی دکھا دیجیے۔" اس پر پلندہ کھول کر بولیں "اے لیجئے یہ حاضر ہے۔"

یہ میمورنڈم اس طرح پر شروع ہوتا تھا۔

کمرہ نمبر ۶۰ محلّہ ارواحان

۸ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

خالقِ برتر اور ہر بلند و پست سے بالاتر!

غالبِ خستہ جاں کا نذرانۂ عقیدت قبول فرمائیں۔ پہلے یہ گنہگار اپنے عصیاں کی معافی چاہتا ہے۔ جو ستاروں سے زیادہ بے شمار اور تیری رحمتوں کے آگے گرد و غبار کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کا سلسلہ موئے سر کے مانند قطار در قطار چلا گیا ہے۔ پھر حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے۔ اے رب العزت! قبل از مرگ نا گہاں یہ عاصی اسیرِ شعر و نغمہ رہا مگر اب باری تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اپنے جملہ گناہوں کی معافی کا طالب ہے۔ عالمِ برزخ میں آنے پر اس اسیرِ لہو لعب نے شعر گوئی سے توبہ کر لی ہے۔ اور اصلاح دینے سے دست کشی اختیار کر لی ہے اگرچہ یہاں بھی شاگردوں کا ہجوم ہے اور میری منقبت کی دھوم ہے۔ مگر اب نہ ان کی سُنتا ہوں نہ اپنی کہتا ہوں، سُنتا یوں نہیں کہ بہرا ہوں۔ کہتا یوں نہیں کہ عتابِ الٰہی سے ڈرتا ہوں۔ شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ سو سال کی عمر ہے نو دس برس کی عمر سے شعر کہتا تھا۔ ساٹھ سال اس لہو لعب

میں بسر ہوئی، نہ مدح کا صلہ ملا نہ داد سے

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
وے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعراء اور احباب سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ مجھے اب زمرۂ شعراء میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے پُرسش نہ ہو کہ اس فنِ قبیح سے تائب ہو چکا ہوں۔ مگر چونکہ اس کافر بچّہ ریختہ کی زلف گیر کا تاحیات اسیر رہا ہوں اس لئے اِس پر جب کوئی وقت پڑتا ہے تو دل پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ زبان سبھوں کو عزیز ہوتی ہے۔ کائنات اسی کے گرد ناچتی ہے۔ اسی سے اقرار و انکار کرتی ہے۔ اس پر تیرا نام آتا ہے۔ اسی سے بندہ تیری حمد و ثنا کے گیت گاتا ہے۔ اسی سے اُس نے تیرے وجود کا اقرار کیا۔ تیری عظمتوں اور رحمتوں کا اعتراف کیا، تیرے وحدہٗ لاشریک ہونے کا اعلان کیا۔ ہر وعدہ وعید کی بنیاد اس پہ قائم، جس ماحول میں یہ پلی بڑھی اُس نے ویسی بولی سیکھی۔ بولی میں نُدرت، رعنائی، دلکشی اور دلربائی اسی کے ذریعے پیدا کی۔ پھر اس نے کیا گناہ کیا جو اسے حرفِ غلط کی طرح مٹایا جا رہا ہے۔

میں ۲۸ فروری ۱۸۶۹ء کو عالمِ فنا سے عالمِ بقا کو روانہ ہوا اور تا ایں دم عالمِ برزخ میں مقیم ہوں۔ میرے بعد بھارت آزاد ہوا اور تلنگے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔ تیرا صدقہ، تیری رحمت۔ جن گناہِ کبیر کا مرتکب ہوا تھا اور جو کائناتِ فکر دنیا میں چھوڑ آیا تھا اُس کی پاداش میں میری صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ بڑی بڑی رقمیں اور بھاری بھاری عطیات وصول ہو رہے ہیں۔ مگر آزادی کے بعد دلّی کا نقشہ ایسا بدلا کہ دلّی وہ دلّی نہ رہی جس میں سات برس کے سِن سے آنا جاتا تھا۔ وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس مقیم رہا۔ بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار، اردو بازار، خانم بازار کہ بجائے خود ایک قصبہ تھا اب خبر نہیں کہ کہاں ہیں؟ مکین اور دوکاندار نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور ہماری دوکان کہاں تھی؟

ظلم کا پیمانہ ضعیف پر یوں ٹوٹا کہ اِدھر آزادی کا بگل بجا اُدھر ریختہ کو پیامِ اجل
ملا۔ جہاں یہ پلی بڑھی وہیں اس کے ٹھوکر لگی۔ وہ دیس جہاں یہ عام زبانوں پر چڑھی تھی
وہیں اب اس کی جان مصیبت میں پڑی ہے۔ پورے پورے صوبوں اور پورے پورے ضلعوں
میں جہاں یہ چھائی بچھائی تھی وہاں اسے بیخ و بن سے اکھاڑا گیا۔ اب اگر رام پور یا لکھنؤ جاؤں
تو گونگا بنا پھروں۔ نہ کوئی میری زبان سمجھنے والا، نہ مجھے میری زبان میں سمجھانے والا۔ وہاں
کی زبان میں نہیں سمجھتا، وہاں والے میری زبان سمجھنے سے قاصر۔ ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

مرتے دم تک ملک کے گوشے گوشے میں ریختہ کا زور تھا۔ نہ اس زبان کا کوئی مذہب
تھا اور نہ مسلک۔ نہ کوئی دوست نہ غمخوار۔ بلاتخصیص مذہب و ملت اس نے بھارت کے
رہنے والوں کو اپنا منہ بولا بھائی بنایا اور سب کو سینے سے لگایا۔ شعراء میں کیا ہندو کیا مسلمان
کیا عیسائی اور کیا سکھ۔ کسی میں کوئی امتیاز نہ برتا۔ نہ دھوتی اور پیجامے کی قید، نہ ٹوپی اور داڑھی
میں تمیز۔ سب ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھتے اور ایک دوسرے سے ہنستے بولتے۔ گاندھی
جی اس کے معترف، نہرو کا پورا خاندان اس کی شیرینی کا دلدادہ۔ دنیا میں اس کا پانچواں
نمبر، آزاد بھارت کی تیسری بڑی زبان، آزادی کی ساری مہم سر کرانے والی۔ سارے
ملک والوں کے دلوں کو گرمانے والی۔ جب دستور بنا تو اسے چودھواں نمبر ملا۔ میں سمجھا کہ
چلو۔ دان سن کے اعتبار سے ساری زبانوں کی ترتیب عمل میں آئی ہے۔ جو زبان عمر میں
چھوٹی ہے اُسے پیچھے رکھ کر اور دان سن کو دیکھ کر آگے بڑھایا گیا ہے۔ دیش آزاد ہوا ہے
تو میزانِ عدلِ جہانگیری سے تول دیا گیا۔ جوان زبان ہونے کے سبب سے چودہ سالہ قتالہ
تسلیم کیا گیا ہے سہ

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

اس نے فرنگیوں کے دور میں آزادی کے جذبات ملک میں بکھیر رکھے تھے۔ اپنے نعروں
سے مجاہدین آزادی کے دلوں کو گرمایا تھا۔ دیس کے رہنے والوں کو یکجہتی کا درس دیا تھا۔
اور سبھوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ اسی سبب سے اسے بڑا مانا ہے۔ میں خوش ہوا اور
عالمِ برزخ میں اُس کے بولنے والوں کو تہنیت اور مبارکباد دی کہ لو صاحبو! جسے مغلوں
نے منہ نہ لگایا اور جسے فرنگیوں نے نگھے پر نہ چڑھایا۔ اُس کے دن بہورے۔ شیفتہ اور
آزردہ نے ہنس کر کہا "مرزا جی! ان خوش فہمیوں کا شکار ہو۔ تیل دیکھو تیل کی دھار۔
ہمارا ملک منافشات سے عبارت ہے۔ سالہا سال کا تنفر اس کی رگ و پے میں سرایت
کئے ہے۔ منافرت کی تان اسی پر ٹوٹے گی۔ بیچاری حکومت بھی کچھ نہ کر سکے گی۔" میں نے کہا۔
"نہیں صاحب! وہ دن گئے جب خلیل شاہ فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔ اب خلیل شاہ کو فاختہ
اُڑائے گی۔ بھلا کون ہے جو چمکتے سورج کے اُجالے کو رات کی تاریکی قرار دے۔ اور دو
اور دو چار کو پانچ بتائے مگر بعد میں وہی ہوا۔ رشک کرنے والے ایسے کل جھپٹ نکلے کہ
آزادی کا سنگ بنیاد رکھتے ہی سارے کے سارے صفِ اعدا میں نظر آنے لگے۔ ع

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

حالات ایسے بدلے اور واقعات نے ایسی کروٹ لی کہ سبھوں نے اُس کی طرف
سے منہ پھیرا۔ کل بہتر نفر اُس کے خیموں میں دکھائی پڑے۔ میدان کربلا کی تاریخ دہرائی
گئی۔ اور جو زبان سب سے چھوٹی تھی وہی بڑی قرار پائی۔ نابالغ کو بالغ قرار دے کر بچہ بچہ
اُس کی جوانی سے منکر ہو گیا۔ جس زبان کو میں نے اپنے تخیل کی رعنائیاں بخشی تھیں جس
کی زلف گرہ گیر کو میں نے اپنے قلق کے شانہ سے سنوارا تھا۔ جس کی خاطر فارسی چھوڑ کر
ریختہ اختیار کی تھی اُس کے سمجھنے والوں کا قحط پڑ گیا۔ میں مبہوت اغیار خنداں اب اگر
دلی جاؤں اور زبان کھولوں تو شاید دلی والے میرا جلوس نکال دیں۔ اے پاک
بے نیاز! اسے

یہاں آیا ہوں وہاں ابتدائے آفرینش سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ پہلے زبان کے بولنے والے کالعدم ہوتے تھے اُس کے بعد زبان ختم ہوتی تھی۔ پہلے گوتم بُدھ کے عقیدت مندوں کا صفایا ہوا پھر پالی زبان کو دیس نکالا ملا۔ مگر اب اُلٹی گنگا بہنے لگی یعنی زبان کے بولنے والے موجود ہیں اور زبان ختم ہو رہی ہے۔

یہ دستورِ زبان بندی ہے کیسا تیری محفل میں!
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اگر تو نے عالمِ برزخ کی زبان کو اُردو قرار دیدیا ہوتا تو بھی اُردو کے ادبا و شعرا جو پاکستان اور بھارت سے سلسلہ وار عالمِ برزخ کی طرف آرہے ہیں۔ اُن کا آنا حق بجانب ہوتا اور تیرے بندے تیرے حکم کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اگر پاکستان پہنچنے والے ادبا اور شعرا کا جرم یہ تھا کہ اُنھوں نے ملک کو تقسیم کرایا تو اس میں دونوں فریق برابر کے شریک تھے۔ برضا و رغبت دونوں نے اسے تسلیم کیا تھا۔ جُرم تسلیم کرنے والوں کا تھا نہ کہ ملک کو آزاد کرانے والی زبان کا، جس نے ملک میں یک جہتی اور اتحاد کی روح پھونکی۔ دیس کے رہنے والوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ اور غیر ملکیوں کو بیک بینی و دو گوش نکلوایا۔ جو لوگ پاکستان بھاگے اُنھیں اگر سزا کے لئے عالمِ برزخ میں طلب کیا گیا تو اُن کا جُرم روشن! وہ یہ سمجھے کہ تیری ذات ہر جگہ موجود نہیں ہے۔ اس لئے وہ پاکستان بھاگے۔ مگر ہندوستان میں رہنے والے تو یہ سمجھ کر نہیں گئے کہ تیری ذات ہر جگہ موجود ہے پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی۔ اُنھوں نے اپنے وطن کو وطن سمجھا، اپنے حاکم کو حاکم مانا۔ پھر یہ کیسا قہر ہے کہ اُن کو عالمِ برزخ میں بُلایا جا رہا ہے وہ زبان جس کے دم سے تیرا نام میرے وطن میں لیا جاتا ہے۔ اگر وہ زبان مٹ گئی تو کون تیرا نام لے گا؟ آج یو۔ پی، بہار اور مدھیہ پردیش جو اس زبان کے گڑھ تھے، وہاں کے بیشتر گھرانوں میں وہ اپنی زبان میں تیرا نام نہیں لے سکتے! ع

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اب ایک طرف تو زبان کے وجود کو ختم کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف میرے کندھوں پر رکھ کر بندوق چھوڑی جا رہی ہے۔ میرے نام سے چندے وصول کئے جا رہے ہیں، عطیات حاصل ہو رہے ہیں۔ اور جس زبان کا میں شاعر تھا اُس زبان کو بیخ و بُن سے اُکھاڑا جا رہا ہے۔ میرے نام کے ہال تعمیر ہو رہے ہیں۔ ایک بین الاقوامی کتب خانہ میرے نام کا راجدھانی میں قائم کرنے کی تجویز ہے۔ میری جائے سکونت دلّی اور اکبر آباد دونوں کو زینت بخشی جا رہی ہے۔ میری یاد میں بڑے بڑے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں۔ کتابیں چھاپی جا رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل کے نمبر نکل رہے ہیں۔ میرے کلام کی مدح خوانی ہو رہی ہے۔ میرے مزار کو بین الاقوامی شہرت دی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف اُن کتابوں، اُن اداروں اور اُن کتب خانوں سے افادہ حاصل کرنے والوں کی زبانیں کھینچی جا رہی ہیں۔ موجودہ نسل کے بعد شاید میرا نام بھی کوئی نہ پڑھ سکے اور یہ بھی نہ جان سکے کہ میں کس زبان کا شاعر تھا؟ اس زمین و آسمان کے نیچے جہاں قطب مینار، جامع مسجد، تاج محل اور دوسری تاریخی عمارتوں کی شدھی عمل میں لائی جا رہی ہے۔ جہاں اُن تعمیرات کو دوسروں کے نام سے منسوب کیا جا رہا ہے وہاں کیا عجب ہے کہ میرا شمار بھی دیش بھاشا کے شاعروں میں ہونے لگے اور مجھے ہندی کا کوی بنا کر آنے والی نسل ویسی ہی پچاس سالہ جوبلی منانا شروع کر دیں جیسی کہ جنوبی ہندوستان میں عثمانیہ یونیورسٹی کی منائی جا رہی ہے۔ کاش ہر روپیہ جو میرے نام پر وصول کیا جا رہا ہے اُسے اُس زبان کی بقا پر صرف کیا جاتا جس میں میں نے شاعری کی تھی۔ میرے نام سے اکبر آباد میں اُردو یونیورسٹی قائم کی جاتی۔ جنوبی ہندوستان میں جہاں اُردو پلی بڑھی تھی اور

جہاں اُردو یونیورسٹی قائم تھی اُسے دوبارہ اُردو یونیورسٹی کا نام دیا جاتا۔ بہار میں اُردو کالج قائم کیے جاتے۔ جن مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں اُردو ختم ہو چکی ہے وہاں از سرِ نو اسی روپے سے اُردو کی تعلیم شروع کی جاتی۔ لیکن ایسا کون کرے کیونکہ اب اُسے مُردہ زبان قرار دیا جا رہا ہے۔ مولانا آزاد جو ابھی چند سال ہوئے بھارت سے عالمِ برزخ میں آئے ہیں۔ وہ بتاتے تھے کہ جب میری تقریر ریڈیو کو یہ کہہ کر نشر کیا جانے لگا کہ میں نے ہندی میں تقریر کی ہے تو میں نے یہی مناسب جانا کہ اپنی عزت آبرو بچا کر عالمِ برزخ میں پناہ لوں! اور یہی الفاظ نواب جعفر علی خاں اثر کے ہیں۔ جو مولانا آزاد کے بعد یہاں آئے ہیں۔ وہ زبان جس نے میل محبت، اتحاد و اتفاق، یک جہتی اور بھائی چارے کا سبق دیا تھا۔ جس نے اہلِ وطن کو مجلسی آداب سکھائے تھے، جس نے زبان کھولنے اور بند کرنے کے آداب سے اہلِ وطن کو آشنا کیا تھا۔ آج اُس کی نشر و اشاعت کے جرم میں اُس کے بولنے والوں کو نفرت سے دیکھا جا رہا ہے اور اُس کے نام پر فسادات کھڑے کیے جا رہے ہیں۔

ان حقائق کے پیشِ نظر گذارش ہے کہ اس یادداشت کو عملی جامہ پہنایا جائے ایسا نہ ہو کہ جس طرح اکیس لاکھ دستخطوں کو بھارت کی قومی سرکار کے صدر نے دُشمنت افزا سیاب بنا رکھا ہے، اُسی طرح تُو بھی اس میمورنڈم کو بغیر اپنا حکم صادر کیے اپنے پاس محفوظ نہ کر لے اور وہاں اور یہیں میں کوئی جواب نہ ملے۔ میری غیر موجودگی میں بھی اُردو کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے ؎

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

غالبِ خستہ

مرزا غالب کا خط ہمایوں کبیر کے نام

تن بہ تقدیر میاں ہمایوں کبیر

سُنو صاحب! دلی میں ایک مرزا اسد خاں گذرے ہیں۔ پیدائش اُن کی اکبر آباد کی تھی اور تخلص غالب کرتے تھے۔ سسرال والے انھیں مرزا نوشہ پکارتے تھے۔ احاطہ کالے صاحب میں رہتے تھے اور شعر و شاعری پر گذر بسر کرتے تھے۔ بادشہ کی مصاحبی پر اتراتے اور اس کے صلہ میں قلیل تنخواہ پاتے تھے۔ صورت کے گورے مگر مُقدّر کے کالے تھے۔ بہادر شاہ ظفر سے ناتا جوڑا تو شاہی نے بادشاہت کا ساتھ چھوڑا۔ دربار رامپور سے لَو لگائی تو والیٔ ریاست نے موت کی ٹھوکر کھائی۔ جس جس کو پیار کیا اُس نے عالم ارواح کا سفر اختیار کیا۔ کچھ جنّت مکانی ہوئے تو کچھ خلد آشیانی۔ علی مرتضیٰ شیر خدا کے غلام تھے مگر آدھے مسلمان تھے۔ سُور سے نفرت اور شراب سے رغبت فرماتے تھے۔ مغل بچہ ہونے کے ناتے پیشۂ ابا سپہ گری تھا مگر اس ننگِ اسلاف نے شاعری اور رندی اختیار کی۔ اسلاف کا پیشہ چھوڑا اور خاندانی حسب نسب کے کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند جوڑا۔ نہ جنتی رہا نہ دوزخی۔ جب تک زندہ رہا مفلسی کو اپنا مونس اور غمخوار بنایا اور عمر کا بیشتر حصہ قرض خواہی میں گذارا۔ جب تک دم میں دم رہا دیر و حرم سے دستبردار اور جام و مینا کا پرستار رہا۔ مرنے پر نظام الدین میں چر سر بھر زمین کا مالک و مختار رہا۔

نوٹ۔ یہ خط اُس وقت لکھا گیا تھا جب ہمایوں کبیر زندہ تھے اور محکمہ تعلیم کے وزیر تھے۔

اور اس وقت سے اب تک اسی آستانے کا تابعدار ہوں ۔

مرنے کے بعد بھی نہ ریاست کی کو گئی   وہ گز زمین پا کے زمیندار ہو گئے

میاں حالی میرے ساتھ ہیں ۔ میرا قطع تاریخ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کہہ کر آئے ہیں ۔ گویا بڑا شیر مار کر آئے ہیں ۔ میں نے شکوہ کیا کہ تم نے عقبیٰ میں میری مغفرت چاہی تھی مگر یہاں دُنیا میں مغفرت کے لالے پڑے ہیں ۔ میرے مزار کو دیکھو اور آئندہ کے لئے سبق سیکھو ۔ سرکاری وعدوں پر نہ جاؤ ، وعدے تسلی اور دلاسے کی خاطر ہوتے ہیں ۔ میری قبر پر مقبرہ کا وعدہ اُردو زبان کی بقا کے وعدے سے کم نہیں دونوں ہوا میں معلق ہیں ۔ دنیا میں اُردو فارسی کا عاشق زار و پرستار تھا ۔ مزار کھٹائی میں کیوں نہ پڑتا ۔ اسی کو کہتے ہیں ع

مزارِ عاشقاں بر شاخ آہو

سُنتا ہوں کہ میرے مزار کے برابر اُردو کا مزار بھی تعمیر ہونے کی تجویز ہے ۔ صرف آئندہ انتخابات کی دیر ہے ۔ میاں جگر مراد آبادی آئے ہیں اور یہ خبر لائے ہیں کہ اُردو کے پرستاروں کی مردم شماری ہو رہی ہے جو گنتی کے نکلیں گے ۔ سابق شاعروں اور ادیبوں کے مزاروں پر قوالوں کا عہدہ پائیں گے ۔ اور نہ سمجھے جانے والے اشعار قوالی میں گائیں گے ۔ ہے ۔ ہے ۔ مردم شناسی کا دور ختم ہوا تو اس کی جگہ مردم شماری نے لے لی ۔ اب تو سبھوں کی نگاہ اعداد و شمار پر ہے ۔ دیکھو کیا ہوتا ہے ؟ یہی قرب قیامت کی دلیل ہے ۔

میاں نہرو کو انھیں دنوں ایک خط لکھا تھا جس میں ایک تجویز اُردو سے متعلق تھی اور دوسری اس امر میں تھی کہ اگر آزادی کے بعد اُردو عالم ارواح کی زبان ٹھہرائی گئی ہو تو اُس کے شاعروں اور ادیبوں کو یہاں بھیجنے میں شتاب کرو ۔ سو اُردو کو

لکھنؤ اور دلی کی علاقائی زبان بنانا تو پیچھے رہا۔ برہمن بچہ کا قول سچا ہوتا ہے جو چیز اس کے
اختیار میں نہ تھی کیونکر کرتا۔ البتہ تقریروں میں زبان سے آنسو بہاتا ہے اور اُردو دانوں
کو گرماتا ہے۔ ارباب حل و عقد اس پر دانت دکھاتے ہیں اور مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔
ایک چنا بھاڑ کیسے پھوڑے اور کس کس سے اپنا رشتہ ناتا توڑے۔

دوسری تجویز جو محکمہ خارجہ سے متعلق تھی وہ گلے گلے پانی منظور ہوئی اور وہ یوں کہ
ہند اور پاکستان کے تعلقات پُرانے چلے آتے ہیں اور آزادی کے بعد تو اُردو ادیبوں اور
شاعروں کی عالم ارواح میں برآمد سے دروازے اور کشادہ ہو گئے ہیں۔ مگر پھر بھی میرے
قدردان ہیں۔ چنانچہ میرے دیوان کی لکھائی چھپائی پر اُن کی سرکار انعام دے چکی ہے
اور اس بندۂ ناچیز کو سرفراز کر چکی ہے۔ جگر مرادآبادی کو سرکاری طور پر انعام دے کر میاں
نہرو نے اپنے وعدے کی تکمیل کی اور ان کی سرکار نے بھی ان کے حکم کی تعمیل کی۔

کل صبح میاں حالی اور میں سیر کو نکلا۔ تو سامنے ایک سبزہ زار کے گرد حصار دیکھا
اس حصار میں قبر تھی مگر حصار کا پھاٹک بند تھا۔ حالی نے پوچھا یہ کیا؟ اندر اللہ اور
باہر تالا۔ میں نے کہا میاں تمہاری عقل شعر فہمی تک محدود ہے۔ مزار فہمی شے دیگر است
تالا اور اللہ کی گردان کر دیکھو دونوں کو ملا کر پڑھو۔ اللہ تعالیٰ نکلتا ہے یا نہیں ـــ اسی
وضع قطع کا مزار جامع مسجد دلی کے پاس میاں آزاد کا ہے جس میں اندر اللہ باہر تالا ہے
شہر کے اندر جنوں کی مسجد تعمیر کرنا علم دریاؤ ہے اسے تم کیا سمجھو۔ یہ قضا و قدر یا
حکومت کے ارباب حل و عقد کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔ آزاد دنیا کے سرد و گرم چشیدہ
تھے بھلا اُن کا مزار زمانے کے سرد و گرم سے نہ گذرتا تو کیا ہمارا آپ کا مزار گذرتا ـــ
غبار خاطر کے مصنف سے موسم گرما کے گرد و غبار کا روحانی تعلق رہا ہے۔ اس لئے
موسم گرما میں غبار اور موسم باراں میں رحمتِ پروردگار کے لئے اس کے رستے کھول
دیئے گئے ہیں اور ہمہ شما پر انہیں بند کر دیا گیا ہے۔ مرحوم کا مزار ان کی مزاج کی کسوٹی

پرکس کے تعمیر ہوا ہے۔ اُس کے گرد و پیش سبزہ اس لئے لگایا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو ہر چیز ہری دکھائی دے۔ باہر والا سبزے تک رسائی کو ترستا ہے اور صاحب مزار چہل پہل کو ترسے ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

اور ہاں میاں! ایک بات تم سے کہنی تھی۔ یگانہ اب دُنیا سے بیگانہ ہو کر یہاں آئے ہیں تا حیات غالب شکن رہے عالم برزخ میں اس سبب کا ہے سے خوش اور مگن ہیں۔ ایک دن کہتے تھے کہ مزار آزادی کے بعد بنا ہے اُس میں ہیرے اور جواہرات کی لیس لگی ہے۔ اس میں کچھ امیر ہیں اور کچھ کبیر اور اُن سب میں دو آتشہ وزیر با تدبیر میاں ہمایوں کبیر جو اپنے پستہ قد بنائے جانے پہ کہتے ہیں۔ ع

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

میاں! قضا و قدر کی میزان میں تولے اور ماشے کا فرق نہیں ہوتا جس کے جسم پہ وہ فقط دھرتے ہیں اُس کی کمی علم و فضل کے وزن سے پوری کرتے ہیں۔ تم کو اگر آدھا قد دیا تو اس کے وزن بھر دماغ میں علم و ادب کا سرمایہ بھی تو بھر دیا۔ خود اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالو اُس کے بعد دیکھو بھالو اور یہ سوچ کر شکر بجا لاؤ کہ جو قد و قامت میں سہراب و رستم ہیں وہ علم و فراست میں تم سے سبک اور کم ہیں۔ تم جیسے پستہ قدوں پر قطب مینار کی بلندی قربان۔ جانوروں میں اونٹ قد و قامت میں بے مہار مگر چال ڈھال میں عقل و خرد کا تابعدار لیلیٰ کا محمل بردار مجنوں کا غم گسار پھر بھی بفہم العقلی میں منفرد روزگار، قناعت کی جیتی جاگتی تصویر اور مجنوں کا ناخنِ تدبیر اُسے نہ کہا جائے تو کیسے کہو گے۔ ببول کے کانٹے کھانا اور ریتیلے میدانوں میں چُلّو بھر پانی کے سہارے ضربیں مارنا اور شکر بجا لانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تمہاری عقل و فراست کے کنگورے ہفت اقلیم کو چھوتے ہیں۔ جب میں تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ خیال کر کے سر دُھنتا ہوں

کہ کیا دریا کو کوزے میں بھرا ہے۔ تمہاری ہمایونی کے چرچے یہاں ہوتے ہیں اور ملائکہ عش عش کرتے ہیں۔

تمہاری خیریت کا طالب
اسد اللہ خاں غالب
۱۵ فروری ۱۹۶۱ء

غالبؔ کا خط میاں علی عباس حسینی کے نام

تاراجِ ادب کے شاہد عینی، میاں علی عباس حسینی کو غالبِ ستم جاں کا سلام و دعا پہنچے!

میاں! باری تعالیٰ کے حضور میں تمہاری شب بیداری اور میری روز و شب مے خواری و سیاہ کاری مسلّم۔ پیمانۂ عدل میں تمہاری نیک اعمالیوں سے میری بداعمالیوں کا پلڑا بھاری۔ میں نے نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ نہ زکوٰۃ دی نہ فطرے کی رقم ادا کی۔ پھر کس منہ سے اپنی مغفرت کے لئے دعا کرتا اور ریاکاری کا ایک اور بوجھ اپنے اوپر دھرتا۔ شراب پیتا اور کباب کھاتا تھا، دوستوں کو خط لکھتا اور شعر کہتا تھا۔ "بس یہی روزگار تھا اپنا"۔ پھر ستم ظریفی یہ کہ اپنی ان تمام نازیبا حرکتوں پر دل ہی دل میں خجالت محسوس کرتا مگر اس کا اظہار یوں نہ کرتا کہ اپنے گناہوں سے اس درجہ خائف تھا کہ کچھ بنائے نہیں بن پڑتا تھا۔ ہائے۔ فرخ بنارسی نے کیا میرے حسبِ حال مقطع کہا ہے۔ سنو۔ ظالم کہتا ہے۔

خجل ہے اپنے گناہوں پہ اس قدر فرخ
کبھی غریب کو دیکھا نہیں دعا کرتے

(نوٹ) عالم برزخ سے مرزا غالب کے جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ حضرات کا انتقال ہو چکا ہے لیکن جس وقت وہ "بیسویں صدی" میں شائع ہوئے تھے اس وقت یہ تمام حضرات بقیدِ حیات تھے۔ (فرقت)

اِن آنکھوں نے غدر کا منظر دیکھا ہے اور اس کا انجام بھی۔ تم نے دوسری جنگ عظیم کا اختتام اور سلطنتِ فرنگ کا آفتاب لبِ بام دیکھا۔ ادب نے دونوں کے اثرات قبول کئے۔ شعر و ادب کے متوالے دونوں میں مارے گئے۔ فرنگیوں نے انگریزی کا پھندا ہندیوں کے گلے میں ڈالا اور آزادیٔ وطن کے بعد اہلِ وطن نے ہندی کا جنیو اُردو والوں کے گلے میں ڈالا۔ اب تمہارے ہندوستان سے "یاحق" کی آوازیں آتی ہیں اور عالمِ برزخ کو آنے والی ریلیں اُردو شعرا کو وگین بھر بھر کر عدم آباد پہنچا جاتی ہیں۔ غدر میں عبورِ دریائے شور کی سزا پاتے تھے یا پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے۔ اب عبورِ دریائے حیات کی سزا پاتے ہیں یا ہندی کے دار پر لٹکائے جاتے ہیں۔ سُنتا ہوں اودھ کے شریف مسلمان گھرانوں تک میں اُردو کا خط پڑھنے والا عنقا ہے، اُردو واں دوا کو بھی نہیں ملتا۔

میاں! میں نے اسی مصلحت سے داڑھی نہ رکھی کہ اوّل غدر کے دور کی پیداوار اور پھر گنہگار۔ قابلِ گرفت چیز کیوں رکھتا؟ غدر میں مسلمانوں کی گرفت داڑھی دیکھ کر ہوتی تھی۔ جتنی لمبی داڑھی ہوتی اُتنی لمبی سزا ملتی۔ ہر شخص داڑھی رکھتے ڈرتا تھا اور اپنے گناہوں کو دو آتشہ بناتے لرزتا تھا۔ داڑھی رکھوں تو شراب نہ چکھوں اور شراب نہ پیوں تو کیونکر جیؤں۔ میرے داڑھی تھی بھی اور نہیں بھی۔ گویا ؎

"ہر چند کہیں کہ تھی نہیں تھی"

زیرو نمبر کی مشین سے مُنڈواتا تھا۔ اُسترے کو یوں قریب نہ لاتا تھا کہ ہمیشہ عاقبت پیشِ نظر تھی صاحب! جو لوگ داڑھیوں سے مسلح ہو کر شراب خانے جاتے ہیں اور خُم کے خُم لنڈھاتے ہیں اُن سے تو بہر حال دور رہوں۔ وہ دوزخ کے جلتے بھُلتے چیلوں پر لوٹیں لگائیں گے۔ مجھ جیسے جہنم کی گرم گرم راکھ پر موسمِ سرما میں اپنا

لہ لٹھوں،

بستر لگائیں گے۔ یہ سارے کے سارے صرف داڑھیوں ہی کے سہارے گرفت میں آئیں گے۔ مشیت کے قربان، ایک ہی چیز وسیلۂ جنت بھی اور جہنم بھی۔

صرف مردوں ہی پر کیا موقوف۔ جنسِ لطیف تک میں فرشتوں کو پکڑ دھکڑ کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ عورت کا سنگار اس کے بال ہی ہیں۔ بال جو زلفِ گرہ گیر بن کر عشاق کو زہر کھلواتے ہیں۔ اور فراق میں انگاروں پر لٹواتے ہیں۔ تو یہی اس کے گنہگار ہونے کی صورت میں فرشتوں کی گرفت میں آتے ہیں اگر فرشتے اُس کی زلفیں پکڑ لیں تو ایک اچھی بھلی عورت کو قدِ آدم لٹکالیں لاکھ جتن کرے مگر چھٹکے کا سوال نہ پیدا ہو۔

میاں! تمہارے لکھنؤ کے شیخوں نے یہ کیا اُڑا رکھی ہے کہ اثنا عشری حافظِ قرآن نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں سیدوں کے ملازم تک حافظ ہوتے ہیں۔ کہاں ہیں تمہارے بھبتی پر چڑھے حافظ[1]۔ ان کو نکالو۔

"اے قبلہ! وہ میں ہی تو ہوں۔ حضور کے آنے کی اطلاع سرکار (حسینی صاحب) کو دیکر حاضر ہوتا ہوں۔"

"گیتی[2] بٹیا! میاں سے فرما دیجیے کہ کوئی بالغ صاحب دلی سے آئے ہیں۔ جب سرکار کے کھانا کھانے کا وقت ہوتا ہے بالغ اور نابالغ (غالب) سب آجاتے ہیں۔ سرکار کو ڈبیہ میں پان لگا کر بھیج دیجیے۔ (غالب سر پر چوگوشیہ پہنے ہاتھ میں ڈنڈا لئے)

"جی ہاں! ابھی لاتا ہوں — ارے میاں حافظ! — حافظ کو بھیج دو۔"

"آداب عرض کرتا ہوں سرکار! تو حضور دلی سے آئے ہیں؟ ماشاء اللہ آج حضور پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

---

[1] حسینی صاحب کے قدیم وفادار ملازم کا نام ہی حافظ ہے اور جو حافظ قرآن بھی ہیں۔
[2] حسینی صاحب کی منجھلی صاحبزادی گیتی آرا جنہوں نے فلاسفی میں ایم۔ اے کیا ہے۔

میاں! ابھی تمہارے حافظ ہیں! سبحان اللہ۔ سید بھی بلا کے ذہین ہوتے ہیں۔ کالا جوتا نہیں پہنتے۔ کالے ملازم رکھتے ہیں اور وہ بھی کیسے بے داغ۔ کھانا بھی پکائیں۔ گھر کا سودا سُلف بھی لائیں۔ جھاڑو برتن بھی کریں اور رات بھی ڈیوڑھی میں بسر کریں۔ میاں! تم تو حافظوں کے آقائے نامدار ہو کیونکہ سیدِ ابرار اور مولیٰ علی کے پرستار ہو۔ سُنا ہے کہ ملازمت سے پنشن پاتے ہی تم نے واڑھی کا کنٹھا گلے میں ڈال لیا۔ میاں حالی ایکدن کہتے تھے کہ علی عباس حسینی تو اب ہمارے سمدھی ہو گئے ہیں کیونکہ میاں غلام السیدین کی لڑکی انہیں کے بڑے صاحبزادے میاں مہدی عباس حسینی سے منسوب ہے۔ خدا مبارک کرے۔ بہو کیا پڑھی لکھی۔ صاحبزادیاں بھی۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ تمہاری پڑھی لکھی اولادیں شاہجہاں پور کے گرہ بازوں کی طرح جس وقت پرواز کریں گی تو عرش سے تارے توڑیں گی۔ ایک بیٹا امریکہ میں۔ دوسرا مرکزی سرکار میں اچھے سرکاری عہدے پر ملازم۔ بڑی صاحبزادی آکاش وانی دلّی میں۔ ماشاءاللہ ہشت پہل باپ ہو۔ اب سُنتا ہوں اپنے بیشتر اوقات اللہ ہو اللہ ہو میں گذارتے ہو۔ نیک اعمال کرتے ہو۔ استغفار پڑھتے ہو۔ سید کی بخشش پر شک کرنے والا کافر۔ دیکھو صاحب! میں اس درجہ بداعمال رہا ہوں کہ تمہارے اعمال کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میاں تمہارے اعمال کی تصدیق کرنے والے اور ان پر مہر ثبت کرنے والے تو حوضِ کوثر پر ہونگے مگر میرے اعمال نامہ پر کون دستخط کرے گا؟ ع

کون سُنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش بہ جانِ درویش

میں نے تو طے کیا ہے کہ اپنے اعمال نامہ کی تصدیق آپ کرلوں گا۔ اور ایک گناہ

---

[1] کشور زیدی جو کشمیر یونٹ میں اکسپرٹ رائٹر ہیں۔

اپنے سر اوڑھ لوں گا۔ اور کہوں گا کہ صاحب گنہگاروں کا ناظم ہوں۔ محکمہ بدی کا ہو یا نیکی کا افسر افسر سب برابر ہیں۔ تم نماز پڑھتے ہو۔ میں شراب پیتا ہوں۔ میرے منہ سے یہ کافر لگی نہیں چھوٹتی۔ تمہارے ماتھے کا داغ میدان حشر میں چمکے گا تو میرے داغ ہائے عصیاں کہاں کے گئے گذرے ہیں جو جواب بن کر گنہگاروں میں نہ دمکیں۔ انعام دونوں پائیں گے۔ تم کو کھرے سکوں میں جو کچھ ملے گا وہی کھوٹے سکوں میں مجھے ملے گا۔ تم مقام علیین پاؤ گے تو میں بھی جہنم کے نچلے حصے میں نہ بیٹھوں گا۔ مقام اعلیٰ ہی پاؤں گا۔ تم نے حافظ کو ملازم رکھا میں نے ڈومنی کو۔ ڈومنی شوہر نہ ہونے پر شوہر دار رہی۔ تمہارے حافظ کی شادی ہونے پر اس کی عصمت برقرار رہی۔ تم سے لیکر تمہارے نوکر تک میرا حساب کتاب برابر رہا۔ تمہاری نیکیوں نے اگر میری بدی کی شناخت کرائی تو میری بدی بھی تمہاری نیکیوں کی شناخت میں کام آئی۔ ہائے عمر خیام کیا کہہ گیا ہے۔ ؎

من بد کنم و تو بد مکافات دہی

پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

میں یہی دو مصرعے پڑھ کر پروانۂ نجات حاصل کر لوں گا اور میدانِ حشر سے چل دوں گا عاقبت دونوں کی حسبِ حال رہے گی۔

میاں اعظم حسین[1] تمہارے حقیقی بھانجے ہوتے ہیں۔ تمہاری کتابیں دے گئے ہیں۔ میں نے ان کتابوں کو سر آنکھوں پر رکھا اور انہیں تکیہ بنایا۔ دیہاتوں سے شہروں تک کے موجودہ معاشرے کا جائزہ لیا تو ہائے کر کے رہ گیا۔ جہاں جہاں کا تم نے نقشہ کھینچا ہے وہاں کی معاشرت کا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ اندازِ بیان کی دلکشی تمہارا ہی حصہ ہے جو پڑھتا ہے تمہاری فن کاری کی داد دیتا ہے۔ میاں ایسے فنکار روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ شاید خدائے سخن میر تقی میرؔ تمہارے ہی لئے یہ کہہ کر آئے ہیں ؎

برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی صاحب۔ صاحب نظر ہوئے ہیں

[1] شمیم کرہانی کے بڑے بھائی اور حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد

"رفیقِ تنہائی[1]" نکالتے ڈرتا ہوں کہ اس عالم برزخ میں کیوں گھر والی سے تُو تُو میں میں ہو۔ وہ رفیقِ تنہائی اپنے تئیں سمجھتی ہے۔۔۔ اور میری رفیق کتابیں ہیں۔ دلی میں میاں عارف کے بچے منٹ منٹ کی خبریں پہنچاتے تھے اور گھر والی سے آٹھ پہر طوفان اُٹھواتے تھے۔ یہاں ملائک اِدھر کی اُدھر لگاتے ہیں اور نبی جمالو بن کر الگ ہٹ جاتے ہیں۔

آجکل سُنتا ہوں کہ انیس کا مقبرہ تعمیر کرانے میں زمین کا گز بنے ہوئے ہو۔ یہ عمر ہی مقبرے بنوانے والی اور مقبروں پر حافظ مقرر کرنے والی ہوتی ہے۔ قویٰ کی کمزوری کا نزلہ ہر دور میں مذہب پر گرا ہے۔ یہی داڑھیاں رکھواتا ہے، نمازیں پڑھواتا ہے اور آخری عمر میں سرخرو کراتا ہے۔

تمہاری دعاؤں کا طالب

اسداللہ خاں غالب

---

[1] حسینی صاحب کے افسانوی مجموعے کا نام۔

غالبؔ کا خط بابائے اُردو مولوی عبدالحقؒ کے نام [1]

مولوی عبدالحق! اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اُردو کا دم ساز اور سب سے بڑا مقدمہ باز کسے کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا مولوی عبدالحق کو۔ کیسا چہ غم۔ کہ جسے نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم۔ نہ شادی نہ بیاہ، نہ منگنی نہ نکاح۔ تمھارا ادھر سے اُدھر جانا برحق مگر جاتے وقت یہ تو سوچتے اور ہوش و حواس کی آنکھیں کھولتے کہ جس مقصد سے جا رہے ہو اور میٹھا زہر کھا رہے ہو اُس میں نفع اور نقصان کتنا ہے؟ اُردو کے حق میں بلا ہو یا فتنہ ہے۔ تم زبان کے میر کارواں رہے۔ ساری عمر اسی دُھن میں رواں دواں رہے۔ بابائے اُردو کہلائے۔ مگر تمہارے یہاں سے جانے نے یہ گُل کھلائے کہ جس انجمن کی بنیاد تم نے ڈالی تھی اور جس کی خاطر اپنی تندرستی تباہ کر ڈالی تھی۔ وہ اب خدا ترسی پر چل رہی ہے۔ سرکاری وظیفے پر پل رہی ہے۔ چھتیس ۳۶ ہزار سالانہ کی رقم سرکار سے مقرر ہوئی ہے۔ اس چھتیس ۳۶ ہزار میں عملے کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات کی مدیں شامل ہیں۔ کہیں اتنی چھوٹی رقم میں اتنے بھاری بھرکم ہاتھی بندھتے ہیں۔ یوں تھوکوں ستو سنتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو زندہ رہنے کا قرینہ اور کیا ہوتا۔ یہی کیا کم ہے کہ تم نے جس پودے کو لگایا تھا اور جس کی خاطر اپنا سر کھپایا تھا وہ زندہ ہے۔ یہ سُن کر تم کو خوشی ہو گی کہ ایک دیوان اس سیاہ کار کا عرشی رام پوری

---

[1] یہ خط مولانا کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

نے ترتیب دیا ہے۔ جس میں تحقیق اور تدقیق کا حق ادا کیا ہے۔ سچ پوچھو تو عرشیؔ نے روح خوش کر دی۔ گلہائے احسان سے میرے قلب کی جھولی بھر دی۔ فرش سے عرش کو پہنچا دیا۔ مرے کو قبر میں اُٹھا دیا۔ مگر تمہارے جانے سے اُردو زبان پر اوس پڑ گئی۔ دقتوں میں ایک دقت یوں بڑھ گئی کہ تقسیم نے ترقی کی ساری راہیں روک دیں۔ گویا اُردو کے جسم میں سوئیاں گھونپ دیں۔ ایمان داری سے بتاؤ کہ تمہارے جانے سے اُردو کو ترقی ہوئی یا تنزل، خار ملے یا گُل؟ زبان کے بولنے سے نئے نئے شگوفے کھلتے ہیں۔ طرح طرح کے شوشے نکلتے ہیں۔ تم جس جگہ گئے ہو، وہاں اگرچہ بڑے بڑے باکمال پیدا ہوئے یعنی ڈاکٹر اقبالؔ پیدا ہوئے۔ مگر وہ خطہ دراصل پشتو، سندھی، پنجابی اور بنگالی کا ہے۔ وہاں اُردو کے لئے کون سا موقع بحالی کا ہے۔ خیر چھوڑو اس بحث سے منہ موڑو۔ یہ حکمرانوں کی باتیں ہیں۔ حکمت عملیوں کی گھاتیں ہیں۔ میں تمہارے ادبی مقدمات جب پڑھتا ہوں تو ایک خاص خوشی محسوس کرتا ہوں۔ ادیبوں اور شاعروں پر ایسے ایسے مقدمے چلاتے ہو کہ مرے مُردے جلاتے ہو۔ بال کی کھال نکالنا اور اچھے بھلوں کو کھنگالنا کوئی تم سے سیکھے۔ وہ مرزا غالبؔ والی فلم تو تم نے دیکھی ہوگی۔ کیا رائی کا پہاڑ بنایا ہے۔ گویا میرے ساتھ ڈومنی کو بھی تگنّے پر چڑھایا ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ اُسے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ صبح و شام چلم بھرتی تھی۔ حُقّہ تازہ کرتی تھی۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ نہ کسی کی ماں تھی نہ کسی کی جائی۔ شعر و سخن سے ذوق رکھتی تھی۔ ہنسی دل لگی کرتی تھی۔ اور دو گال ہنستی تھی۔ اس پر لوگوں نے ایک طوفان جوڑا اور یہ شگوفہ چھوڑا کہ میں فاسق و فاجر اُس پر عاشق ہوں۔ رات دن اس کی یاد میں روتا ہوں۔ دین و ایمان اُس پر کھوتا ہوں۔ وہ تو کہو تمہاری بھاوج نہ ہوئیں، ورنہ ایک آفت لاتیں۔ گھر کی بیٹھک سے بھی نکالا جاتا۔ اور کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا۔ جینا دشوار ہو جاتا۔

میرے بارے میں صحیح انصاف تم کر سکتے ہو۔ جس نے جوانی میں باتھ پیر ہوتے ہوئے بھی
صنف نازک کا بوجھ نہ سنبھالا اور اس باربرداری سے بمراحل دور رہا۔ اسی لئے تمام
عمر بے قصور رہا۔ میں ایک ہی سواری میں چکنا چور تھا۔ دوہری سواری کیا اُٹھاتا اور
ساری عمر اپنے کو اُٹھا بیٹھی کراتا۔ خط ختم کرتا ہوں۔ تم سلامت رہو۔

غالب

غالبؔ کا خط وقار عظیم کے نام

جانِ غالبؔ: وقار! میں مرے پر سپردِ گور ہوا تو تُو کبھی جیتے جی زندہ درگور ہوا۔ میں نے انتقالِ جسمانی کیا تو تُو بھلا کیسے نچلا بیٹھتا۔ تُو نے بھی انتقالِ مکانی کیا۔ تقسیم نے ناخن سے گوشت جُدا کیا۔ گویا ناروا کو روا کیا۔ کیا زبان پر کوہِ الم ٹوٹا ہے کہ نہ تو بیان کی گنجائش ہے اور نہ شکوہ شکایت کا بوتا ہے۔ لاہور کی آب و ہوا سُنتا ہوں کہ تم کو ایسی راس آئی ہے کہ تم نے اب اُسی چوکھٹ پر دھُونی رمائی ہے۔ اپنے لئے ایک عظیم الشان کوٹھی بنوائی ہے اور دن بھر کاغذ پر گھوڑے دوڑاتے ہو۔ گھوڑ دوڑ کے مزے اُڑاتے ہو۔ تمہارے مضامین تنقیدی و غیر تنقیدی پڑھتا ہوں۔ اور تمہاری جُدائی کے تصوّر سے کُڑھتا ہوں۔ داستانوں کا اختصار تم نے کیا چھاپا ہے۔ گویا کئی سمندروں کو پیمانوں سے ناپا ہے۔ "نقوش" کے پرچے آتے ہیں اور دل کو لبھاتے ہیں۔ تم نے طنز و ظرافت نمبر پڑھا۔ میری تصویر پر نگاہ گئی؟ میرا کارٹون کس غضب کا بنایا ہے کہ خود کارٹون بننے والے کو بے اختیار ہنسنا آیا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بڑھاپے میں یہ حال ہوگا اور عضو عضو یوں پامال ہوگا تو جوانی ہی میں مر لیتا ۔۔ کاسۂ حیات کو آبِ فنا سے بھر لیتا۔ عجیب بات ہے کہ جسمانی اعتبار سے جتنے حقیر ہو اُتنے ہی عقل و فہم میں درویش کامل اور فقیر ہو۔ عبادت بریلوی کی ضخیم ضخیم کتابیں دیکھ کر دل میں خیال

پیدا ہوتا ہے کہ کاش تم اُن کی لکھی ہوئی کوئی کتاب ہوتے ۔ یا ضخامت میں طلسم ہوشربا کا
ایک باب ہوتے ۔ یہ جو دُختِ افراسیاب ہوتے چلے جاتے ہو اور لاہور کے باہر کہیں نظر
نہیں آتے ۔ تو اس کا سبب کیا خراب تندرستی ہے یا کسلمندی اور سُستی ہے ۔ اگر دوا
دارُو سے پرہیز ہے اور پہلوان بننے سے گریز ہے ۔ تو ایک طبّی نسخہ بتاتا ہوں اور اس
بات کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر اسے پابندی سے استعمال کرو گے تو ہفتے عشرہ میں اپنی
صحت بحال پاؤ گے ۔ دو ہفتے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی موٹی موٹی کتابوں کا بھپارہ لو ۔
اُسی کا صبح و شام غرارہ لو ۔ اگر گاما پہلوان نہ بنا دوں تو غالب نہ کہنا ۔ بلوان نہ بنا دوں
تو اپنا طالب نہ سمجھنا ۔ امسال اِدھر آموں کی کثرت ہے ۔ اب لے دے کے ایک ہی حسرت
ہے کہ آم ٹب میں بھیگتے ہوں ادیبوں اور شاعروں کے جمگھٹے ہوں ۔ قاشوں پر قاشیں
کٹتی ہوں اور حسبِ مراتب بٹتی ہوں ۔ ہائے اب یہ صحبتیں کہاں میسّر ہوں گی اور یہ
جُدائی کی گھڑیاں کیونکر بسر ہوں گی ۔ آتے ہو تو آؤ نہیں تو ملنے کی کوئی دوسری راہ
بتاؤ ۔ اگر مناسب سمجھو تو اپنی تصانیف بھیج دیا کرو تاکہ اِس تنہائی میں دل بہلے اور وقت
کٹنے کی کوئی صورت نکلے ۔ ایک آہ بھرتا ہوں اور خط کا آخری فقرہ تمام کرتا ہوں ۔

غالب

غالب کا خط جوش ملیح آبادی کے نام

شبیر حسن خاں جوش، خوش پوش و بلانوش۔ گلستان سخن کی بہار، خمخانۂ
ادب کے سرشار، ہندوستان چھوڑ پاکستان بسایا۔ گویا دونوں ملکوں میں نیا جادو جگایا
علی مرتضیٰ شیر خدا کے گرویدہ۔ اُس پر یہ ڈھٹائی اور یہ دیدہ کہ اہلبیت کی محبت میں
گرفتار مگر خدا کے وجود سے انکار۔ ستم ظریفی کی انتہا کرتے ہو۔ پیروں پیغمبروں کو خفا
کرتے ہو۔ جوانی میں اگر مذہب سے کھیلو گے تو بڑھاپے میں مذہب کے پاپڑ بیلو گے۔
اِس رندی کے جادہ پر کب تک چلو گے۔ مذہب سے کب تک جلو گے۔ جوانی میں جتنا
قدم بڑھاؤ گے۔ بڑھاپے میں اُتنی ہی گہری گیروی پوشاک میں نظر آؤ گے۔ ہاتھ میں
بڑے دانوں کی تسبیح ہوگی۔ ہر غلطی کی اسی طور پر تصحیح ہوگی۔ جب جُبّہ و دستار کا پلندہ
بنے مذہبی تھان کے بیچ کا ڈنڈا بنے۔ ضربیں مارتے۔ وسط حلق سے کھنکارتے دکھائی
پڑو گے۔ مصنوعی مذہب میں سرشار۔ رواں دواں، آج یہاں کل وہاں۔ خانقاہیں
آباد کرو گے۔ اُس وقت، غالبِ خستہ کو یاد کرو گے۔ اِس پیر ناتواں کی ہدایت پر ہنستے ہو۔
اُس کی ہر بات کسوٹی پر کستے ہو۔ یہ رندی اور مذہب کی ہنڈی۔ کی چندی کہیں
طرفہ رنگ نہ لائے۔ اور جیسے بھی آفت نہ ڈھائے۔ تمہاری غیبت میں دو ایک بار
جب تمہارا ذکر آیا تو باتوں باتوں میں ایک بزرگ نے فرمایا کہ جوش ایک مذہبی

پکھیرو ہے۔ اچھا بھلا کیسرو ہے۔ جس کا گودا گورا اور چھلکا کالا ہے۔ مجذوبوں جیسی باتیں بناتا ہے۔ اور ملحد کہنے والوں پر قہقہے لگاتا ہے۔ اوپر سے کالا ہے اندر سے عاشقِ باری تعالیٰ ہے۔ سنتا ہوں کہ دشمنوں نے جنرل ایوب کے کان بھرے کہ جوشؔ فتنہ ہے، اسے پاکستان سے نکالو۔ اور اس مصیبت کو یہاں سے ٹالو۔ مگر وہ کب کچی گولی کھیلے تھا، وہ تو بدر و حنین کے معرکے جھیلے تھا۔ اُس نے آخر جوہر کامل کو پہچانا۔ اور جوشؔ کے باطن کو جانا۔ غلط فہمی دور ہوئی۔ عتاب کی آندھی کافور ہوئی۔ تمہارے باطن کی صفائی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک شب جب تمہیں روپے کی ضرورت اور پیسہ ملنے کی نہ راہ نہ صورت تھی۔ تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ضرورت بھر روپیہ پھینک یہ جا وہ جا نظر آیا۔ (اب کے اگست میں جب جوشؔ صاحب دلی آئے تو راقم الحروف سے انھوں نے دو عجیب و غریب واقعے بیان کئے۔ پہلا واقعہ یہ کہ ایک دن انہیں کسی سلسلے میں سات آٹھ سو روپوں کی اشد ضرورت تھی۔ اور دوسرے روز سویرے ہی وہ رقم داخل کرنا تھی۔ شب میں وہ متفکر تھے کہ سویرے سویرے کیونکر انتظام ہوگا۔ اور یہ سوچتے سوچتے سو گئے۔ دو تین گھنٹے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی تو اُن کی آنکھ کھلی۔ اتفاق سے گھر پر مردوں میں اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ اس لئے خود ہی دروازہ کھولنے چلے گئے۔ جب انہوں نے دروازہ کھولا تو ایک سیاہ فام انسان ایک تھیلی پھینک کر یہ کہتا ہوا کہ "لے" یہ جا وہ جا غائب ہوگیا۔)

تمہارے ہم مشربوں نے مجھے بتایا ہے بلکہ بڑے ہماہمی سے یہ بھی یقین دلایا ہے کہ کوئی پان کی ڈھولیاں لاتا ہے اور گھر میں جب پانوں کا کال پڑتا ہے تو مفت دے جاتا ہے۔ (یہ دوسرا واقعہ انہوں نے یہ بتایا کہ وہ منہ اندھیرے کہیں بھی ہوں گھر سے باہر گھومنے نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن گھر میں پان ختم ہو گئے تھے۔ اور

واپسی پر راستہ میں یہ سوچ رہے تھے کہ ناشتہ کے بعد پالنوں کا کیا انتظام کیا جائے گا۔ کہ اچانک ایک سنسان جگہ پر ایک شخص تازہ پالنوں کی دو ڈھولیاں اُن کے سامنے ایک پلندہ کی شکل میں ڈال کر یہ بڑبڑاتا ہوا غائب ہو گیا "اب سالے کو یوں ہی ماروں گا" اُس وقت سے ڈرو جب پاکستان چھوڑ چھاڑ میرے مزار کے مجاور بن کر دھنا دھرو گے۔ ٹخنوں سے اونچا گھٹنا ہوگا۔ اور ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا "یا حق کچھ کہتے ہیں، بابا الم سہتے ہیں" کے نعرے بلند کرتے۔ سینے ٹھنالے۔ پھیکی آہیں بھرتے نظر آؤ گے۔ اور اُسی کو زندگی کی حقیقت بناؤ گے۔ سُنتا ہوں قویٰ مضمحل ہو چلے ہیں۔ گزرے ہوؤں کو یاد کرتے ہو۔ دل کو ناشاد کرتے ہو۔ تم دورِ حاضر کے شہنشاہِ سخن ہو۔ رندوں اور خراباتیوں کے میرِ انجمن ہو۔ زبان پر قدرت رکھتے ہو۔ ادب پر احسانِ عظیم کرتے ہو۔ شاعرِ شباب و انقلاب ہو" احسن الانتخاب[1] ہو"۔ تم رحمت کا قصیدہ پڑھ کر اگر جنّت میں جاؤ گے اور قدرت کو ہنساؤ گے تو میں بھی علی مرتضیٰ شیرِ خدا کا دامن پکڑ کر ساقیِ کوثر سے مغفرت حاصل کر لوں گا۔ رحمتِ باری کے موتیوں سے دامن کو بھر لوں گا۔ بڑے مزے رہیں گے۔ فردوسِ بریں میں مشاعرے کریں گے۔ حورانِ بہشتی پر فقرے کسیں گے۔ یہ سب دل لگی کی باتیں ہیں۔ ورنہ ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غالبؔ

---

[1] احسن الانتخاب مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم کی مشہور تصنیف ،

غالب کا خط شوکت تھانوی کے نام

میاں شوکت! آنکھوں کا چین دلوں کی راحت! یہ شیطان نے تم کو کیا انگلی دکھائی کہ تم کو بھی پاکستان کی سمائی۔ گھر بار چھوڑا۔ نئے دیس سے ناتا جوڑا۔ سنتا ہوں کہ وہاں تم نے شادی کر لی۔ اچھی بھلی سلیپر سے نئی سلیپر بدل لی۔ یہ مولویوں کا پیشہ تم داڑھی منڈوں نے کیسے اختیار کیا۔ اور اپنے کو دہرا بوجھ لادنے پر تیار کیا۔ میں تو ایک ہی شادی کر کے بھر پایا تھا۔ بیوی کے سامنے میؤں میؤں کے سوا کچھ نہ کر پایا تھا۔ ساری زندگی ہانپتا رہا۔ نون، تیل، لکڑی کی نبضیں دیکھ دیکھ کر کانپتا رہا۔ اس کا شکوہ تم سے کروں یا سارا الزام زمانے پر دھروں؟ ہر طرف یہی کام ہو رہا ہے۔ جسے دیکھو یہ تخم بو رہا ہے۔ ریڈیو کا قاضی[1] جب دوسرا نکاح پڑھائے اور اپنے اوپر اچھی بھلی مصیبت لائے تو اسے کون سمجھائے کہ یہ بوجھ انسان کو گھلا دیتا ہے۔ ہنستوں کو رلا دیتا ہے۔ تمہارے فقروں کی آمد میں سستی نہ پیدا ہو گی تو کیا دہری سواری سے چستی پیدا ہو گی؟ ریس کے گھوڑے پر جب دو دو جیکی لادو گے تو کیا ریس کرو گے کیا بھاگو گے؟

---

[1] ریڈیو پاکستان کا ایک فیچر، جسے شوکت تھانوی لکھتے تھے۔

ایک ہی شادی میں انسان کی سانس پھول جاتی ہے مگر جھوٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سودیشی ریل، سے شیش محل، تک جانے والے تمہاری کتابوں میں اب تمہیں تلاش کرتے ہیں تو تم نظر نہیں آتے۔ جب تم نئے نئے گئے تھے تو مجھے تمہارے انتقالِ مکانی کی دوسرے دن خبر لگی۔ میں نے چھٹتے کہا کہ "لو ایک تارا اور ٹوٹا ہنسنے ہنسانے کا سہارا چھوٹا۔ تمہارے دلنواز قہقہوں پر مسکراتا تھا اور سکونِ خاطر پاتا تھا۔ مگر وہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ گویا عشرت کا دور کالعدم ہوا — جب ہندوستان آتے ہو تو اوپر ہی اوپر گذر جاتے ہو۔ جہاں قیام کرتے ہو وہاں سے میری قیام گاہ ٹکے ڈولی ہی تو ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تم مجھے جیتے جی اپنی جدائی سے تڑپاتے ہو۔ اب کے بار ادھر آؤ تو ایک ذی مجھ کو بھی اپنی شکل دکھا جاؤ۔ ورنہ میدان حشر میں نفسی نفسی میں کون کس کا ساتھ دے گا۔ اب جب دلی کی صحبتیں یاد آتی ہیں تو دل کو تڑپاتی ہیں اور خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ اے یوسف مرزا! پھینکو نا۔ کب سے چوا[1] دبائے بیٹھے ہو۔ اب دُگی روک رکھی ہے۔ اسے لیجئے۔ پھینکا بھی تو دہلا۔ ہاں میاں کیا دیکھتے ہو۔ لگا دو نہلے پر دہلا۔!" میرن صاحب! اب آپ کی باری ہے۔ کہئے کیا تیاری ہے؟ بن گئی ہو تو پتے کھولو۔ چپ کیوں ہو؟ بولو بازی ختم ہو۔ نئی بازی شروع ہو۔ کیا رکھے بازی کر رہے ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرن صاحب سویرے سے ایک ہی بٹا ٹائپ[2] کر رہے ہیں تو ٹائپ ہی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسے دیکھئے! اسوقت[3] گھیسٹی ہے تو ایسی کہ نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ ارے صاحب! کہو تو غلام سر کروں۔ اور اکّا روکے رکھوں۔ مرزا صاحب! معاف کیجئے گا۔ بولنے کی نہیں ہوتی۔" "اچھا صاحب

---

[1] تاش کے غالب بھی لتی تھے اور شوکت بھی "رمی" "اور فلش" پر جان دیتے تھے [2] تاش میں رمی کھیلنے والوں کی ایک اصطلاح [3] لکھنؤ کی اصطلاح میں خاموش ہو جانے کو کہتے ہیں۔

آپ کا کہنا سر آنکھوں پر۔ اے لیجئے آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ میاں شوکت! یہ ہاتھ یوں بنا۔ اور دیکھئے پوری رمی یوں بنتی ہے۔ کہو۔ ہوئی؟ اچھا تو شوکت میاں آپ کے ذمے دو آنے اُدھار رہے۔" جی ہاں مرزا صاحب بگلے گلے پانی تک۔ اے لو۔ میر مہدی آ گئے۔ ارے بھئی میر مہدی! اچھے تو ہو؟ اچھا ذرا رکو۔ آخری فقرہ ختم کر لوں تو بات کروں۔

تمہاری درازیٔ عمر کا طالب
اسداللہ خاں غالب

غالب قاتلانِ آم کے نرغے میں

مولانا خیر بہوروی کی تحریک پر مولانا محمد حسین شمس پروپرائٹر الوار بک ڈپو لکھنؤ نے اپنے دولتکدے واقع نعمت اللہ روڈ پر پروفیسر احتشام حسین کے اعزاز میں آموں کی دعوت کی اور اس دعوت کا عنوان "غالب اور آم" تجویز کیا۔ مولانا شمس آموں کے اس درجہ شوقین ہیں کہ سال بھر دونوں وقت اُن کا دسترخوان آموں کی مختلف الوان چٹنیوں، مربوں اور اچاروں سے مزین رہتا ہے۔ آموں کی فصل شروع ہونے سے پہلے جب آم کے درخت میں بور آنا شروع ہوتا ہے تو یہ "بور" کی پھنکی بنوا کر صبح و شام پھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب اُس میں ننھی ننھی کیریاں آنے لگتی ہیں تو انھیں چھالیا کی طرح کتروا کر پان میں کھانا شروع کرتے ہیں۔ جب کیریوں میں گٹھلیاں پڑ جاتی ہیں تو اُن کی سخت گٹھلیوں کو تڑوا کر اُبلواتے ہیں اور ہاضمہ درست کرنے کے لئے انھیں کھاتے ہیں۔ اُس کے خول کو سر گھٹوا کر چندیا پر رگڑواتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے سر کی ساری خشکی بھوسی بن کر نکل جاتی ہے۔ بڑی کیریوں کی پال ڈلوا کر سویرے شام آم کھانے کا ریہرسل فرماتے ہیں اور جب سیپ ٹپک جاتی ہے تو اُس کی جھیپی سے دانت مانجھ کر فرماتے ہیں کہ "دانتوں کے کیڑے مارنے کی اس سے بہتر کوئی دوا حکیم ڈاکٹر آج تک تیار نہ کرسکے اور پھر دن میں دو دو تین تین بار آموں پر اس طرح یورش کرتے

ہیں جس طرح ہمارے ملک کے نیتا عہدوں پر اور دیش کی جنتا راشن پر۔

راقم الحروف نے بار بار مولانا کو اُن کی عاقبت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ دیکھو یار! کسی بے زبان پر اتنا ظلم نہیں کرتے کیونکہ خدا نا کردہ اگر میدانِ حشر میں ان آموں میں جان پڑ گئی تو ہر آم داورِ محشر سے فریاد کرے گا۔ کہ ہر محفل میں مولانا نے ہمارا چوسا اس طرح کھینچا ہے کہ کانگریسی دور میں جنتا اپنا چوسا کھینچوانا بھول گئی تھی۔ اس پر مولانا پر "جوں" تک نہ رینگی۔ اور انھوں نے ہماری نصیحت کی طرف سے اس طرح منہ پھیر لیا جس طرح ملک کے ارباب حل و عقد جنتا کی مشکلات اور عام گرانی کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔! ہم نے کہا "یار دیکھو مولانا! میدانِ حشر میں آم تم پر وہ ڈنڈے بازی کریں گے کہ بس۔ یو پی اسمبلی کے ممبران اپنی جوتم پیزار اور گھونسہ بازی بھول جائیں گے۔ مگر سہ

کون سنتا ہے فغانِ درویش

اس جلسے میں پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر عبد الاحد خاں خلیل، ڈاکٹر شجاعت سندیلوی، منظر سلیم، پروفیسر نجم الدین نقوی، مولانا شبیر احمد غوری اور دوسرے قاتلانِ انبہ شریک تھے اور صدارت کے فرائض مقبول احمد لاری انجام دے رہے تھے۔ اپنے جسم کی رعایت سے "یا مائدہ" کی تلاوت کرتے جا رہے تھے۔ غرض شکار گاہ میں کچھ "فجری"، کچھ کھجری، کچھ تخمی، کچھ قلمی، کچھ پال کے، کچھ ڈال کے اور کچھ بے بدیاں قسم کے انبہ نما ادیب شریک تھے۔ ان میں صرف مولانا شمس جنہوں نے آموں کی نسل کشی فرمانے کا انتظام کیا تھا۔ اور آم کھاتے کھاتے اس درجہ ریشہ دار ہو گئے تھے کہ آموں کے ریشے اُن کے دونوں گلوں کو پھاڑ کر داڑھی کی شکل میں باہر نکل آئے تھے اور یہ غالباً کسی تخمی آم کا صبر تھا جو اُن کے چہرے پر اس شکل میں نمودار ہوا ہے۔ اس بزم میں جسے آموں کی رزم گاہ یا قتل گاہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خیر صاحب، پروفیسر

احتشام حسین اور ربابدولت کو غالب اور آم کے موضوع پر تقریریں کرنا تھیں۔

مولانا خیر نے غالب کو تمام عمر اس کثرت سے استعمال کیا تھا اور اس قدر پڑھا تھا کہ اُنھیں آخر عمر میں مجبوراً بنارس میں ایک فیکٹری غالب اکیڈیمی کی شکل میں قائم کرنی پڑی۔ غالب کی نادر تحریریں پڑھتے پڑھتے وہ غالب کی اُس تصویر سے ملنے لگے تھے جس میں وہ سوالیہ جملے کا نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے پاس غالب کی قلمی تصاویر، اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط، ان کے اعضائے جسمانی کی نشست و برخاست کے اوقات، داڑھی مونچھوں کی بناوٹ، ان کے دہانے کی ناپ، ان کی کمر کی چوڑائی، شب میں سونے والے انگوچھے کے دھاگے اور ان کے جام سفال کے ٹکڑے تک محفوظ ہیں۔ جو وہ بہت کم لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ کیا عجب ہے جو حضرت آدم کی منگنی کے خط کی نقل، بی حوا کی رخصتی کی تفصیل، اُن کی اولادوں کے عشقیہ خطوط اور داورِ محشر کے اُس حکم کی نقل بھی موجود ہو جس کے تحت آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا۔ غرض خیر صاحب کی جھولی میں اس دُنیا کی تشکیل سے پہلے اور مابعد کی اتنی چیزیں محفوظ ہیں کہ اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ آدم جنت سے بجائے خوشۂ گندم کے ثمر بہشت لے کر بھاگے تھے تو کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ ان کے اس دعوے کی تردید کر سکے۔ کیونکہ ان کے پاس یقیناً اس کا کوئی تحریری ثبوت موجود ہوگا۔

اس بزم میں مولانا خیر نے اپنی تقریر آموں کی وجہ تسمیہ سے شروع کی اور بتانا شروع کیا کہ رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں آم، امر کہلاتا تھا۔ بلکہ رامائن میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ اُنھوں نے پُران اور ویدوں کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اُس زمانے میں کس کس قسم کے آم پائے جاتے تھے۔ کن کن دیوتاؤں کو آم پسند تھے۔ کتنے دیوتا قلمی آم کھاتے تھے اور کتنوں کو تخمی مرغوب تھے۔ وہ آم گھلا کر کھاتے تھے یا کاٹ کر۔ بیٹھ کر کھاتے تھے یا کھڑے۔ امیر خسرو آم کھا کر

گٹھلیاں پھینک دیتے تھے یا اُنہیں نظام الدین اولیاء میں کنوئیں یا حوض کے قریب بو دیتے تھے۔ غرض وہ جس وقت تقریر کر رہے تھے تو میری نگاہ اُن کونڈوں ماٹوں اور دیگوں پر پڑ رہی تھی جس میں برف کے پانی میں مختلف البطن اور حسب نسب سے درست آم بھیانک ہو ہو کر اور پانی سے مُنہ نکال نکال کر خیر صاحب اور دوسرے قاتلانِ انبہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو ادیبوں کی بھگل بنائے آموں کے بارے میں تقریریں سُن رہے تھے۔ تمام آم یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھئے کب اِن تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ اور کب سارے ادیب جا تو لے کر اُن کی گردن پر اس طرح سوار ہو جاتے ہیں جس طرح بقرعید کی نماز پڑھنے کے بعد ہر قصائی بکرے پر چڑھ بیٹھتا ہے اور وہ غریب "بھیں" کر کے رہ جاتا ہے۔

ایک دسہری آم جو خاصا لحیم شحیم تھا۔ مسٹر نجم الدین نقوی کے دیوہیکل اور سُرخ و سفید جسم اور ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر بار بار پانی میں مُنہ چھپائے لے رہا تھا کہ کہیں وہ ایک دم بسم اللہ نہ شروع کر دیں۔ وہ دیگ کی تہہ میں چھُپ کر بیٹھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ کل مجمع میں سب سے بڑا پہلوان اور شہزادہ گلفام یہی ہے۔

کچھ لنگڑے جو کونڈوں میں تیر رہے تھے وہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی پر نگاہیں گاڑے مسمریزم کی مشق کر رہے تھے اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ کاش بجائے آموں کے اس وقت ہم بکرے ہوتے جنہیں عام طور پر لنگڑا ہونے کی صورت میں شرعاً ناقابلِ قربانی سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے مگر وہ ڈاکٹر صاحب کے نحیف الجثہ ہونے کے سبب زیادہ خوفزدہ نہ تھے۔ اور اِس غلط فہمی میں مُبتلا تھے کہ یہ شخص معدے کی کمزوری کا بہانہ کر کے کسی آم پر دستِ ستم دراز نہ کرے گا۔ اور تقریریں ختم ہوتے ہی شربت کا گلاس پی کر مولانا کے سامنے سلام کرائی کی رسم ادا کرتا ہوا چل دے گا۔

ایک مالدہ جو کامراج کے نکالے ہوئے وزیروں سے بھی زیادہ کھسیاہٹ محسوس کر رہا

تھا - دل ہی دل میں احساسِ کمتری محسوس کرتے ہوئے "مقبول احمد لاری" کی طرف ٹکٹکی
جمائے ہوئے ۔۔۔ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ یہ شخص مجھے اپنا نوزائیدہ بچہ سمجھ کر
چھری کا رُخ دوسرے آموں کی طرف پھیر دے گا اور اُس کی جان بچ جائے گی ۔

ایک سفیدہ آم بیک وقت ڈاکٹر خلیل اور ڈاکٹر شجاعت سندیلوی کی طرف دیکھ دیکھ
کر دانت پیس رہا تھا اور چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ جس کی بدولت یہ آج سُرخ و سفید بنے ہوئے
ہیں، اُسی پر دانت تیز کر رہے ہیں - ان کی حیثیت آموں کی نظر میں اُن باغی کانگریسی
لیڈروں سے کم نہ تھی جو کانگریس کی بدولت بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر راجہ پورس کے
ہاتھیوں کی طرح اب اپنی ہی فوج کو روندنے پر آمادہ ہیں اور جس برتن میں کھاتے ہیں
اُسی میں چھید کرتے ہیں - اور ایسے بھولے بھالے ہیں کہ ہمہ تن گوش بنے تقریریں سُن
رہے ہیں لیکن ہم خوب سمجھتے ہیں - ؏

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

ایک آم جس کی ولدیت خود اُسے یاد نہ تھی مولانا شبیر احمد خاں غوری کو بغور
دیکھ رہا تھا کہ یہ بیچارے ان قاتلوں میں کیسے پھنس گئے کیونکہ یہ تو اس رشوت ستانی
کے دَور میں بھی رشوت کی طرف سے پیٹھ کر کے "الدرہمُ ما اللہ ہو" کے عادی ہیں - اور
اب سے تیرہ سو برس پہلے کے مسلمان معلوم ہوتے ہیں - جنہیں فرشتوں کی فروگزاشت
کے تحت غلط موقع پر اور غلط جگہ پیدا کر دیا گیا ہے - ایسے صوم و صلوٰۃ کے پابند
معصوم صفت انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں جو زبان درازوں پر ہاتھ اُٹھانا
نہیں جانتے بھلا وہ ہم بے زبانوں پر کیا ہاتھ اُٹھائیں گے - اور یہ واقعہ ہے کہ غوری
صاحب تخمی آم سے زیادہ نرم اور گداز دل والے انسان ہیں بھی ۔۔۔ اسی لئے
آموں کو یقین تھا کہ جس وقت اشقیا اُن پر ہر چہار طرف سے ہلّہ بولیں گے اسوقت یہ
خدا اور رسول کا واسطہ دیتے ہوئے پورے مجمع کا رُخ کلام پاک کی آیتیں پڑھ پڑھ کر

دوسری جانب موڑ دیں گے۔ چنانچہ وہ دوسرے گھبرائے ہوئے آموں پر خندہ زنی کر رہا تھا۔

آموں کے پورے مجمع میں حیرت انگیز بات یہ دیکھنے میں آئی کہ ہر آم منظر سلیم سے حد درجہ خوفزدہ اور متنفر تھا اور ایک دوسرے کو انتہائی یتیمانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سراسیمگی میں یوں حق بجانب تھے کہ منظر سلیم آموں کا زیادہ سے زیادہ خون خرابہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ "قومی آواز" میں انہیں احمد آباد سے بڑے قتلِ عام کی خبر لکھنے کو مل جائے۔ اسی لئے کیا قلمی اور کیا تخمی سبھی آم چاہتے تھے کہ یہ شخص زیادہ سے زیادہ اپنا کلام سامعین کو سنا کر واہ واہ سے پیٹ بھر لے اور کسی طرح ان پر دستِ ستم دراز کرے۔ جب ان سے دوسری غزل پڑھنے کی فرمائش کی گئی تو تمام آموں نے اطمینان کی سانس لی اور ان کے ہر شعر پر "لبیک" کہا۔ انہیں دوسری غزل پر پہلی غزل سے زیادہ داد ملی اور تمام تخمی اور قلمی آموں میں ایک مالدہ ہی کے خلاف سازش کر کے یہ طے کیا کہ منظر سلیم صاحب کے اولین وار کو روکنے کے لئے مالدہ ہی کو قربانی کا بکرا بنایا جائے۔

لیکن مولانا شمس کو آموں کا پورا مجمع اس وجہ سے بآوازِ بلند صلواتیں سنا رہا تھا کہ انہیں کے زیرِ اہتمام یہ مقتل برپا ہونے والا تھا اور ہر آم یہ طے کئے بیٹھا تھا کہ مولانا جس آم کی گٹھلی چوسیں گے وہ آم بلا رد رعایت اپنی گٹھلی مولانا کے حلق میں جام کر دے تاکہ مولانا آم کھانے کے لئے لوگوں سے زیادہ اصرار نہ کر لیں۔

پروفیسر احتشام حسین جب تقریر کرنے ۔ ۔ ۔ کھڑے ہوئے تو انہوں نے تقریباً پینتالیس منٹ ایسی عالمانہ تقریر کی کہ تمام قاتلانِ انبہ یہی بھول گئے کہ انہیں آم کھانے کی دعوت دی گئی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے معلومات کے دریا بہاتے ہوئے غالب اور آموں سے متعلق غالب کے ایسے خطوط کے حوالے دیئے کہ مولانا خیر کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے بڑھنا شروع ہو گئیں وہ بار بار آنکھوں تک رومال لیجا کر انہیں اپنی جگہ لانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی تقریر

میں غالب کے ایسے ایسے خطوط کے حوالے دیئے جن میں یہ تک درج تھا کہ غالب نے کن کن لوگوں کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں آموں کی ہنکائی کرنے اور آموں کو اُن کی شکارگاہ تک لانے کے لئے تعینات کر رکھا تھا اور آموں کی فصل شروع ہونے سے کتنے عرصے پہلے وہ لوگوں کو خطوط لکھنا شروع کر دیتے تھے کہ

اِس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے!

اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ کتنے لوگ آموں کے ٹوکرے جوڑ بٹور کر بھیجتے تھے۔ کتنے ٹوکرے آم بذریعہ ٹرین آتے تھے اور کتنے ریلوے والے آج کل کی طرح آموں کی جگہ پوری دیانتداری سے آموں کی پیٹیوں میں کنکر پتھر بھر دیا کرتے تھے یا یہ کہ غالب کی زندگی میں آموں کے کتنے دانے راستے میں سڑ کر ضائع ہو جاتے تھے اور کتنے اُنہیں ثابت و سالم پہنچتے تھے۔

احتشام صاحب کو قلمی اور تخمی آم بحیثیت چوٹی کے تنقید نگاروں کے جانتے تھے اس لئے اُنہیں خیال تھا کہ سب سے پہلے وہ الہ آباد کے امرودوں اور ملیح آباد کے آموں کو سائنٹیفک تنقید پر کسیں گے اور بحیثیت پھل دونوں کی افادیت پر ترقی پسندانہ انداز میں روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ مارکسی ترقی پسند دونوں پھلوں میں سے کس پھل کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ روس والے امرودوں اور آموں کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں پھلوں میں کون سا پھل کمیونسٹوں کو مرغوب ہے۔ اور اُس کے بعد بتائیں گے کہ آم کا چھلکا زیادہ ترقی پسند ہوتا ہے یا اُس کا گودا۔ مزدوروں کو موجودہ کانگریسی دور میں آم کی گٹھلی پر زندگی بسر کرنا چاہیئے یا اُس کے چھلکوں پر۔ سماجی قدریں آم کی گٹھلی میں زیادہ پائی جاتی ہیں یا اُس کے چھلکے میں۔

احتشام صاحب کی تقریر جتنی زیادہ طویل ہوتی جاتی تھی آم اُتنے ہی زیادہ مگن تھے اور پانی میں غوطے لگا لگا کر داد دے رہے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ

دیر تک اُنہیں اس دُنیا میں سانس لینے کا موقع مل جائے۔ احتشام صاحب کا چہرہ گول ہے اِس لیے جو آم ذرا گول تھے، وہ یہ سوچ کر مطمئن تھے کہ احتشام صاحب گولائی کی رعایت سے اُن پر ہاتھ نہ ڈالیں گے۔ اور ایک دو آم کھا کر اور روس کی مثال دیکر امن کا پرچم لہرا دیں گے۔ اور نفیس قسم کے آم کھانے کو سرمایہ دارانہ ذہنیت قرار دیں گے۔ ان معرکتہ الآرا تقریروں کے بعد جب خاکسار نے دیکھا کہ آم اور غالب کے موضوع پر جو کچھ کہنا تھا وہ سب کچھ یہ دونوں صاحبان کہہ چکے تو .... بغلیں جھانکنے کے سوا اس خاکسار کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا، بار راقم الحروف نے کہا۔

"حضرات! میں اس حقیقت سے ہرگز ہرگز روگردانی نہ کروں گا کہ جہاں تک آموں کے قتلِ عام .... کا تعلق ہے۔ غالب اپنے دَور میں ہلاکو اور چنگیز خاں سے کسی طرح کم ظالم نہ تھے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پروفیسر احتشام حسین جن کے اعزاز میں آموں کا یہ قتلِ عام ہونے جا رہا ہے۔ ان کے مقابلے میں غالب کی حیثیت ایک طفلِ مکتب سے زیادہ نہ تھی اور نہ صرف آموں کا مقتل بپا کرنے میں غالب ہمارے معزز مہمان سے میلوں پیچھے تھے بلکہ دوسری صلاحیتوں میں بھی ان کا اور غالب کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ آپ حضرات نے غالب کے خطوط کا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان کی "دربارِ مغلیہ" اور "دربارِ رام پور" سے وابستگی کی تفصیلات بھی پڑھی ہیں لیکن آپ حضرات میں سے کیا کوئی صاحب کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں جس میں غالب کو اُن کی زندگی میں کسی ایک رئیس یا مولانا نے اتنی گرانی کے زمانے میں اتنے نفیس اور لحیم شحیم آموں پر اتنے لوگوں کے ساتھ مدعو کیا ہو؟ اور اپنے ہاتھوں سے حسین سے حسین اور قیمتی سے قیمتی آم کے قتل کی آنکھ بند کر کے اجازت دیدی ہو۔

غالب پروفیسر احتشام حسین سے زیادہ معمر ہونے کے باوجود بے روزگار۔

ے دیکر ایک مرتبہ دلی کالج میں معلمی کے لئے درخواست لکھ کر فنیس میں تشریف لے گئے تھے۔
لیکن صرف بھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہے اور جیسے گئے تھے ویسے اپنے گھر واپس
آگئے۔ جبکہ پروفیسر احتشام حسین نے ایم۔ اے کرتے ہی لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو لکچرر کی
جگہ حاصل کرلی اور اب الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ غالب نے تمام عمر فارسی اُردو،
حکمت اور نجوم پڑھا مگر ایم۔ اے تو بڑی بات، ہائی اسکول بھی تھرڈ ڈویژن نہ پاس کرسکے۔
غالب نے اگرچہ زندگی بھر مکتوب نگاری اور شاعری کی لیکن زندگی میں اُنہیں وہ شہرت حاصل
نہ ہوسکی جو پروفیسر احتشام حسین نے ۴۵ سال کی عمر میں حاصل کرلی۔ غالب نے اتنی بڑی
عمر میں صرف چند کتابیں اور لے دیکر ایک دیوان مُرتب کیا۔ وہ بھی اُن کی زندگی میں شائع
نہ ہوسکا۔ لیکن پروفیسر احتشام حسین کی درجنوں کتابیں اب تک شائع ہوچکی ہیں۔
غالب اُردو فارسی کے شاعر تھے یا زیادہ سے زیادہ مکتوب نگار۔ لیکن پروفیسر احتشام
حسین بیک وقت شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ ادیب بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ انگریزی
میں بھی مضامین لکھتے ہیں اور ہندی میں بھی۔ اس معاملے میں بھی غالب ان سے
سبقت نہ لے جاسکے۔ غالب اپنی عمر میں زیادہ سے زیادہ رام پور، لکھنؤ، کلکتہ یا زیادہ
سے زیادہ اکبر آباد سے دلی یا دلی سے اکبر آباد آتے جاتے رہے اور اس سفر میں بھی اُنہیں
بیل گاڑی یا زیادہ سے زیادہ فینس مل سکی لیکن پروفیسر احتشام حسین کو جس سفر کے لئے
جیسی سواری کی ضرورت ہوئی اُنہیں ملتی رہی۔ گھر سے یونیورسٹی جانے کے لئے رکشہ،
تانگہ اور سائیکل۔ لکھنؤ سے دلی، الہ آباد، سری نگر، ناگپور، کلکتہ اور بمبئی وغیرہ جانے
کے لئے ہوائی جہاز یا فرسٹ کلاس کا ریل کا ڈبہ، ہندوستان کی شاید ہی کوئی یونیورسٹی
ہو جہاں انہیں ماڈریٹر یا وائیوا کے سلسلے میں نہ بلایا گیا ہو۔ لیکن غالب کو زندگی بھر وائیوا
تو بڑی چیز کسی انٹرویو تک میں نہیں بُلایا گیا۔ پروفیسر احتشام حسین نے درجنوں مشاعروں
کی صدارت اور سیکڑوں کانفرنسوں کا افتتاح کیا مگر غالب کو کانفرنس تو بڑی چیز کسی محلّہ کی

پنچایت تک میں بحیثیت صدر دعوت نہیں دی گئی - پروفیسر احتشام حسین امریکہ، لندن اور نہ جانے کتنے مغربی ممالک میں ہوائی جہاز پر دورہ کر آئے لیکن غالب کو ایک محلہ سے دوسرے محلہ تک جانے کے لئے معمولی اُڑن کھٹولہ تک میسر نہ ہو سکا - اسی طرح بحیثیت انسان کے پروفیسر احتشام حسین نے زندگی بھر اپنے خاندان اور اپنے کُنبے کی کفالت کی - لیکن غالب کسی زمانے میں خود اپنے کفیل نہ بن سکے - احتشام صاحب نہ کبھی شراب پی نہ جوئے کے سلسلے میں جیل بھیجے گئے اور نہ کسی والیٔ ریاست کی قصیدہ خوانی کی اور نہ کسی بغاوت کے الزام میں ماخوذ ہوئے - برخلاف اس کے غالب کی تمام عمر اس طرح کی فضول باتوں میں گزر گئی - احتشام حسین کے سامنے ۴۷ء کا اندوہ بھی تھا - کینیڈ سٹوں کی پکڑ دھکڑ بھی ہوئی لیکن وہ ہمیشہ ایک شریف شہری کی حیثیت سے یہی کہتے رہے کہ میرا حصہ دُور کا جلوہ!

مولانا شمس آموں سے خوب سیر ہو کر مہمانوں کو رخصت کرنے لگے تو آموں کے چھلکوں پر اُن کا پیر پھسل گیا - اس پر ایک صاحب نے کہا، حضرت اتنا کھانے کے بعد بھی آپ آموں پر پھسلے پڑ رہے ہیں! اس پر مولانا کے پیٹ کی طرف دیکھ کر پروفیسر نجم الدین نقوی نے کہا

یارب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی!

اور قاتلانِ انبہ کی یہ کانفرنس قہقہوں کی گونج میں برخاست ہوئی!!

مرزا غالب کا مکتب

جب اوائل فروری ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی منائے جانے کا شور بلند ہوا اور ہندوستان کی راجدھانی دلّی میں عظیم الشان پیمانے پر سرکاری اور غیر سرکاری طور پر تیاریاں شروع ہونے لگیں تو راقم الحروف نے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کو مشورہ دیا کہ اگر اس تقریب کو دُنیا کی ایک عظیم الشان تقریب بنانا چاہتے ہیں تو وہ سب سے پہلے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں حاضر ہو کر اُنھیں مشورہ دیں کہ وہ مرزا غالب کو چند روز کے لیۓ عالمِ برزخ سے بلوالیں۔ میری یہ تجویز سنکر فاروقی صاحب میری طرف حیران ہو کر اس طرح دیکھنے لگے جس طرح مسز اندرا گاندھی جنابِ نجلنگپا کو ان کے ہر بیان پر دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں یا مسٹر چھاگلہ کے بیانات پڑھ کر مسلمان انکی دماغی کیفیت پر غور کرنے لگتے ہیں۔ میں نے کہا اس پر حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ جنابِ صدر سے کہیں کہ وہ بھارت کے سفیر ڈاکٹر سید حسین مرحوم متعینہ عالمِ برزخ کو بذریعہ وائرلیس ہدایت کریں کہ چونکہ بھارت امسال مرزا غالب کی صد سالہ برسی عالمگیر پیمانے پر منانے جا رہا ہے لہٰذا وہ بارگاہِ ایزدی سے آٹھ دس اِس ہفتوں کے لیۓ مرزا صاحب کے بھارت آنے کی اجازت حاصل کر لیں تاکہ مرزا صاحب بنفسِ نفیس اپنی صد سالہ تقریبات میں شریک ہو سکیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سفیر مرحوم سے یہ بھی کہدیں کہ وہ چلتے وقت مرزا صاحب کو واپسی کا ٹکٹ بھی دیدیں تاکہ واپسی کے کرایہ کے لئے مرزا صاحب کو ایک ایک کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اور یہ اس وجہ سے کہ تقریب ختم ہونے کے بعد بہت ممکن ہے کہ مرزا صاحب کی حیثیت ایک ووٹ گزارے ہوئے ووٹر کی سی ہو جائے جسے ووٹ گزارنے کے بعد کوئی پانی تک پلانے کا روادار نہیں ہوتا اور اب چونکہ ہندوستان میں ایسے والیانِ ریاست بھی نہیں ہیں جو مرزا صاحب کی مدد کر سکیں کیونکہ ان کا جیب خرچ بھی عنقریب

بند ہونے والا ہے اس لئے وہ بھی مرزا صاحب کی کوئی مالی اعانت نہ کر سکیں گے۔ اور جہاں تک خود ہمارے ملک کا سوال ہے وہ بھی سردست غیر ملکی قرضے پر گذر بسر کر رہا ہے۔ جس کی ادائیگی کے سلسلہ میں مختلف منصوبہ بندیوں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ بہر صورت یہ روپیہ حکومت اسی وقت ادا کر سکے گی جب وہ اُن تمام قرضوں کو جو اربوں کی صورت میں ہے ادا کر چکے گی۔

چنانچہ اس پر عمل درآمد کرنے کے بعد جب یہ یقین کر لیا گیا کہ بارگاہِ ایزدی میں اس درخواست کو شرفِ قبولیت حاصل ہو جائے گا۔ تو حکومتِ ہند نے روس اور امریکہ کے اُن سائنسدانوں کو جو ابھی حال میں چاند کی تحقیق کر کے واپس ہوئے ہیں۔ امریکی اور روسی حکومتوں سے اپنے یہاں طلب کر لیا۔۔ اور ان سے فرمائش کی کہ وہ مرزا صاحب کو کسی قسم کی گیس استعمال کر کے کم از کم آٹھ دس ہفتوں کیلئے زندہ کر دیں تاکہ وہ اپنی صد سالہ برسی کی تقریبات میں شریک ہو سکیں۔ ان سائنسدانوں نے حکومتِ ہند کی فرمائش کو منظور کر لیا۔۔ چنانچہ نظام الدین اولیاء کے مزار کے احاطے میں مرزا غالب کی قبر کے گرد و پیش ایک میلا سا لگا ہوا ہے اور مرزا صاحب کی قبر میں روسی اور امریکی سائنسدانوں نے مختلف قسم کے موٹے موٹے ربڑ کے ٹیوب دوڑا دیے ہیں جن کے ذریعہ ان کے سو برس پرانے کرم خوردہ جسم کو دوبارہ اپنی اصلی شکل میں لانے کے لئے مختلف قسم کی گیسیں استعمال کی جا رہی ہیں۔

ایک روسی سائنسداں جو چہرے بشرے سے بہت زیادہ تجربہ کار نظر آ رہا ہے اس نے کچھ سوچ کر ایک گیس کی پوری شیشی ایک ٹیوب میں اُنڈیل دی اور مرزا صاحب کی قبر پر اس طرح ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا ہے کہ جیسے وہ قبر کی نبضیں دیکھ رہا ہو۔ اُس کے اس عمل کو چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک قبر کے اندر سے مرزا صاحب کی آواز "یا علیؑ" کہتی بلند ہوئی اور قبر بُری طرح ہلنا شروع ہو گئی۔ روسی سائنسداں نے

یہ آواز سُنتے ہی نہ جانے کون سی گیس قبر پر انڈیل دی کہ قبر کے اوپر کا حصّہ ایک دم دور جا گرا۔ اور قبر کے اندر مرزا صاحب اپنا جسم اس طرح ٹٹولتے نظر آنے لگے کہ جیسے وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جسم پر سے وہ کپڑے کیا ہوئے جو مرتے وقت وہ زیب تن کیئے ہوئے تھے اور اس کے بعد ہی مرزا صاحب کی آواز یہ کہتی فضا میں گونج گئی۔

"ارے لوگوں میرے جسم کے وہ کپڑے کیا ہوئے جسے پہن کر میں ابھی رات سویا تھا۔ آخر میرے سارے کپڑے کس نے اُتار لیئے؟" اس کے بعد انہوں نے زور زور سے چلاّنا شروع کیا۔

مرزا صاحب :- نیاز! او نیاز!! ارے جلدی چل۔ کوئی شقی رات سوتے میں میرے جسم کے تمام کپڑے اُتار کر بھاگ گیا ہے اور میں بالکل ننگا بیٹھا ہوا ہوں، خدا کے لئے جلدی سے میرے صندوق سے دوسرے کپڑے نکال کر مجھے دیدے

حکومت ہند نے پہلے ہی سے اس خیال کے پیش نظر کہ اگر مرزا صاحب دوبارہ زندہ ہو گئے تو وہ قبر میں برہنہ ہوں گے۔۔۔ مرزا صاحب کے لئے ایک نہایت نفیس جوڑا تیار کرا لیا تھا۔ اور اس جوڑے کو مالک رام صاحب جو غالبیات کے ماہر ہیں اور ترکی میں حکومت ہند کے ٹریڈ کمشنر رہ چکے ہیں اور اب ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری ہیں۔ اس جوڑے کو لئے مرزا صاحب کی قبر کے پاس موجود تھے، چنانچہ جوں ہی مرزا صاحب نے قبر میں کپڑوں کی فرمائش کی انھوں نے ہاتھ بڑھا کر مرزا صاحب کو اُن کا نیا جوڑا حوالے کرتے ہوئے کہا "مرزا صاحب! آپ اطمینان سے کپڑے بدل لیں ہم سب لوگ دوسری طرف منہ پھیرے کھڑے ہیں"

مرزا صاحب نے کپڑے پاتے ہی جلدی جلدی اُنہیں بدلنا شروع کر دیا اور تھوڑی سی دیر بعد کپڑے بدل کر نہایت خجل اور شرمندہ صورت بنائے قبر سے باہر آئے اور سارے مجمع سے معافی مانگتے ہوئے بولے "حضرات! میں اپنی اس

بے پردگی اور گستاخی پر حد درجہ نادم ہوں اور آپ سب حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں "مولا علی" کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ شب میں میں ننگا ہو کر نہیں سوتا۔۔۔ اور وہی پورا لباس پہنے رہتا ہوں جسے دن میں استعمال کرتا ہوں۔ مگر سونے میں نہ جانے کون ملعون میرے سارے کپڑے اُتار کر چلتا بنا اور مجھے نیند کی غفلت میں اس کا کبھی ہوش نہ رہا کہ کوئی شخص میرے کپڑے اُتار رہا ہے۔ اس کی تصدیق آپ میری محترمہ سے بھی کر سکتے ہیں۔"

اس پر سارے مجمع نے قہقہہ لگا کر تالیاں پیٹنا شروع کر دیں اور پورے مجمع نے مرزا صاحب کو بآوازِ بلند اس بات کا یقین دلایا کہ اُن میں سے کسی نے مرزا صاحب کو ننگا نہیں دیکھا۔ اس کے بعد پورے مجمع نے روسی اور امریکی سائنسدانوں کو اُن کی اس حیرت انگیز کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے پھولوں کے ہار اور گجروں سے لاد دیا اس پر ان لوگوں نے بھی ہاتھ ہلا ہلا کر پورے مجمع کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد غالب اکیڈمی کے صدر حکیم عبدالحمید صاحب۔۔۔ مرزا صاحب کو غالب اکیڈمی کی نئی عمارت میں لے گئے۔ جو انہوں نے مرزا صاحب کی صد سالہ برسی کی یادگار کے طور پر بنوائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارا پروگرام حکومت ہند سے مشورہ کرنے کے بعد پہلے ہی سے تیار کر لیا گیا تھا۔ اور مرزا صاحب کے قیام و طعام کے سلسلے میں ان کی بنوائی ہوئی اس نئی عمارت کو مخصوص کر دیا گیا تھا۔

مرزا صاحب کے دوبارہ پیکرِ وجود میں آنے کی خبر جب دِلّی کے آل انڈیا ریڈیو نے اس مصرعہ کے ساتھ نشر کی کہ؎

"یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور"

تو ساری دِلّی میں ایک دھوم مچ گئی اور اُس روز دِلّی بھر میں جتنے بچّے پیدا ہوئے

تھے اُن کے والدین نے اپنے بچوں کے ناموں کے آگے پیچھے بلاتخصیص مذہب وملت غالب کا نام لگانا شروع کر دیا۔ مثلاً غالب رام، غالب دتی، غالب آماء، غالب حسین، غالب الدہر، غالب پرشاد، غالب نرائن وغیرہ وغیرہ، اور اس کے بعد غالب اکیڈمی کی نئی عمارت کے گرد و پیش سویرے سے شام تک لوگوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔

ملک کا اُردو داں طبقہ مرزا صاحب کی اس خلاف توقع ولادت پر اس وجہ سے خوش تھا کہ دوبارہ وجود میں آنے کے بعد مرزا صاحب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جس زبان کو وہ مرتے دم دِلّی اور لکھنؤ میں پھلتا پھولتا چھوڑ گئے تھے۔ آزادی کے بعد وہ کس منزل سے گذر رہی ہے اور ملک کا اُردو داں طبقہ سردست کن حالات سے دوچار ہے۔ اور حکومت اس زبان کی ترویج کے سلسلہ میں کیسے کیسے زبانی دعوے کرتی رہتی ہے۔ مرزا صاحب کو زندہ کرانے کے بعد حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا۔۔ کہ ایک دن ملک کے "اسٹرائیک" کرنے والے طلباء کو جو اُردو زبان سے بھی واقف ہوں۔ دِلّی میں جمع کر کے ان کے سامنے مرزا صاحب کی "اخلاقیات پر" سات روز تقریریں کرادی جائیں۔ تاکہ طلباء کی اخلاقی حالت میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکے اور ان کی توڑ پھوڑ، سرکاری عمارتوں کی تباہی و بربادی، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ہفتوں اور مہینوں بند کرانے کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو۔ کیونکہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد طلباء کے اخلاق کی جگہ آزادی کچھ اس بُری طرح سرایت کر گئی ہے۔ کہ انھوں نے آزادی سے بدحواس ہو کر اپنے اپنے اساتذہ کی مارپیٹ شروع کر دی ہے جس کی وجہ سے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہفتوں اور مہینوں تعلیم کا سلسلہ بند رہتا ہے۔ مرزا صاحب سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ طلباء کو اپنی تقریر میں بتائیں کہ آزادی وطن کی راہ میں

دیس کے محبانِ وطن نے کتنی قربانیاں دیکر ملک کو غلامی سے نجات دلائی ہے اور انہیں کس طرح ان رہنماؤں کے نقشِ قدم پر چل کر ملک کے تعمیری کاموں میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ ہمارے ملک میں اس کی پبلسٹی کی جا چکی ہے کہ فلاں، فلاں، تاریخ مرزا صاحب طلباء کے سامنے لیکچر دیں گے اور اس سلسلہ میں راجدھانی کے ایک بہت بڑے ہال میں اُن اُردو داں طلباء کو جمع کیا گیا ہے جو ایسے چند صوبوں سے آئے ہیں جہاں ابھی تھوڑی بہت اُردو زبان کا چلن ہے اور جہاں چند اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم باقی رہ گئی ہے طلباء اور طالبات کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مرزا صاحب کا لکچر سُننے کے بعد اپنے اپنے صوبے کے طلباء میں اخلاقیات کی تبلیغ کریں۔

پہلا دن

جس ہال میں مرزا صاحب کا یہ لیکچر ہونے جا رہا ہے - اس میں بنچیں اور ڈیسکیں پڑی ہیں اور طلباء مرزا صاحب کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں - اتنے میں مرزا صاحب بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ کی دی ہوئی خلعت میں ملبوس ایک چوگوشیہ ٹوپی سر پر رکھے ہال میں داخل ہوتے ہیں - یہ خلعت مرکزی حکومت کے وزیر اوقاف میاں فخر الدین علی احمد کے پاس جو مرزا صاحب کے "خاندان" سے ہیں مرزا صاحب کی "یادگار" کے طور پر سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی اور ان وزیر سلطنت کی حقیقی بہن حمیدہ سلطان نے جو دلی کی انجمن ترقی اُردو کی ایک سرگرم رکن ہیں - بڑے احتیاط سے اپنے پاس اسے ایک صندوق میں رکھ چھوڑا تھا -

مرزا صاحب کو ہال میں آتا دیکھ کر ہال کے سارے طلباء اپنی اپنی بنچوں پر لیٹ جاتے ہیں - مرزا صاحب جب ہال میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہیں اور کسی طالب علم کو بیٹھا نہیں پاتے تو بے حد جُز بز ہو کر فرماتے ہیں -

مرزا صاحب : لاحول ولا قوۃ ، یہاں تو دُور دُور تک کوئی طالب علم نظر نہیں آتا پھر میں تقریر کس کے سامنے کروں ؟"

مرزا صاحب کے یہ الفاظ سُن کر تمام بنچوں سے آوازیں بلند ہوتی ہیں -

"مرزا صاحب! آپ گھبرائیں نہیں ہم سب حاضر ہیں۔ لیکن کئی ہفتوں سے چونکہ دن رات ہم لوگ اسٹرائیک کرانے میں مبتلا رہے ہیں اس لئے بہت تھک گئے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنا لکچر شروع کیجئے ہم سب لیٹے لیٹے اُسے سُنتے رہیں گے۔"

مرزا صاحب: میاں یہ تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کہیں آج تک دُنیا میں طالب علموں نے لیٹ کر بھی کوئی تقریر سُنی ہے؟

کئی آوازیں: مرزا صاحب! اگر آپ کو کوئی زحمت ہو رہی ہو تو آپ بھی میز پر لیٹ کر تقریر فرمائیں۔ ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔

مرزا صاحب: حضرات! میں لیٹ کر تقریر کرنے کا کبھی عادی نہیں رہا ہوں لہٰذا میں آپ حضرات سے گذارش کروں گا کہ آپ میری تقریر اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر سُنیں۔

کئی آوازیں: مرزا صاحب! تقریر سُننے کا یہ طریقہ جو آپ فرما رہے ہیں وہ انگریزوں کے دَورِ غلامی میں رائج تھا۔ اب چونکہ ہمارا دیس آزاد ہو چکا ہے اس لئے ہم کو لیٹ کر ہی تقریر سُننے میں مزا آتا ہے۔ ہم بیٹھ کر لکچر سُننے کو اوّل تو ایک قسم کی اخلاقی گراوٹ سمجھتے ہیں دوسرے گزشتہ بیس اکیس سال سے ہم اس کے بالکل عادی نہیں رہے ہیں۔

مرزا صاحب: مگر میں بھی تو لیٹ کر تقریر کرنے کا عادی نہیں ہوں۔

کئی طلباء: تو حضور! آپ کرسی پہ بیٹھ کر لکچر دیں ہم لوگ اس کو بھی برداشت کر لیں گے۔

ایک آواز: مرزا صاحب! لیٹنے اور بیٹھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ کیونکہ لیٹنا اور بیٹھنا دونوں اضافی قدریں ہیں اس لئے ہم آپ سے پھر بصد التماس گذارش

کریں گے کہ آپ پُرانی قدروں کو زندہ کرکے ہم کو دَورِ غلامی کی یاد نہ دلائیں۔ آپ اگر ہم لوگوں کے اس مطالبہ کو منظور نہ کریں گے تو ہم سب احتجاجاً اپنے اپنے گھروں میں جاکر چارپائیوں پر لیٹ رہیں گے۔

مرزا صاحب: اچھا آپ زیادہ برہم نہ ہوں کیونکہ مجھے تو آپ کی سرکار کا حکم بجالانا ہے۔

"حکمِ حاکم مرگِ مفاجات"

البتہ میں یہ ضرور چاہوں گا کہ میں آپ لوگوں سے اپنا تعارف کرادوں، کہ میں کون ہوں؟ میاں مجھے اسداللہ خاں غالب کہتے ہیں۔

ایک لڑکا: اچھا وہ جن کی ایک مرتبہ اُردو زبان میں فلم آئی تھی جس کے ٹائیٹل پر ہندی لکھا تھا اور جس میں مرزا صاحب کو رنڈیوں کے کوٹھے پر آتے جاتے دکھایا گیا ہے۔

تیسرا لڑکا: ہاں ہاں۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب ایک خدالگتی بات آپ سے پوچھوں۔ آپ بُرا تو نہ مانیں گے؟۔

مرزا صاحب: نہیں بیٹا! ایک نہیں تم دو باتیں مجھ سے پوچھو بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔

وہی لڑکا: مرزا صاحب! یہ جو زبان آپ بول رہے ہیں اس کا کیا نام ہے؟

مرزا صاحب: ارے بھئی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یہ وہی ریختہ یعنی اُردو ہے جس میں میں نے شعر کہے ہیں اور جس سے متاثر ہو کر آج آپ کا ملک میری صدسالہ برسی منا رہا ہے۔

وہی لڑکا : مگر مرزا صاحب آپ کو شاید اس کا علم نہیں کہ اب ہمارے ملک میں اس قسم کی کوئی زبان نہیں بولی جاتی - آزادی حاصل ہونے کے بعد اس کی نس بندی کردی گئی ہے کیونکہ یہ بھی ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جارہی تھی اور ہمارے ملک کو اس کا خطرہ لاحق ہو چلا تھا کہ کہیں یہ ملک کی ساری زبانوں کو نہ کھا جائے کیونکہ یہ ایسی بلانوش ہے کہ جس زبان کا جو لفظ اس کو پسند آتا ہے اُسے ہضم کر لیتی ہے - اور اس کے بول ایسے میٹھے ہوتے ہیں کہ جو لوگ مٹھاس کے عادی نہیں ہیں وہ بھی اس کے بول سُن کر اپنے ہونٹ چبانے لگتے ہیں اسی لئے اس کی فلموں کی بھی نس بندی کی جارہی ہے - اس کے چٹورپن کا اندازہ آپ اس سے کریں کہ بغیر پوچھے گچھے یہ دیسی زبانوں کے خوش ذائقہ الفاظ اور فقرے تو چاٹتی ہی تھی - اس کے بعد اس نے غیر ملکی زبانوں کی ناندوں میں بھی مُنہ ڈالنا شروع کردیا -

دوسرا لڑکا : اور مرزا صاحب اس کے مشاعروں سے تو اللہ بچائے - اس کے شاعر جب کسی مشاعرے میں جمع ہو کر اس کی تانیں لگاتے ہیں تو انسان تو انسان جانور تک دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں - کُتّے اس کے شعراء کا کلام سُن کر بھونکنا بند کر دیتے ہیں اور بلیاں اس کے اشعار سُن کر رونا بھول جاتی ہیں - آپ نے ہز میجسٹی والا گراموفون اگر خریدا ہوگا تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس بھونپو سے اس کا موسیقی کار اپنے نغمات نشر کرتا ہے -- اس کے سامنے کُتّا تک سوالیہ نشان بن جاتا ہے -

تیسرا لڑکا : اور مرزا صاحب یو - پی اور بالخصوص لکھنؤ جو کسی زمانہ میں اس زبان کا گڑھ تھا اور جہاں دُور دُور ملکوں سے لوگ اس کے نغمات سُننے آتے تھے وہاں اس کے بولنے والے تو آپ کو ملیں گے مگر اس کے لکھنے والے دَدا

کو بھی میسر نہ آئیں گے۔ کیونکہ وہاں تمام تعلیمی اداروں کی ایسی نس بندی کی گئی ہے کہ اُن اداروں میں پڑھنے والے طلباء اور طالبات کے مخارج تک مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔

مرزا صاحب: تو پھر آجکل آپ کے یہاں کون سی زبان بولی جاتی ہے۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب! بولی تو یہی زبان جاتی ہے۔ مگر اب اُسے ایسے انجکشن دیئے جا رہے ہیں جو عام طور پر جنس بدلنے والوں کو دیئے جاتے ہیں جن سے لڑکا لڑکی بن جاتا ہے اور مرد عورت کی جنس اختیار کر لیتا ہے۔

مرزا صاحب: تو یہ کیا کوئی نئی زبان ہے جو ایجاد کی جا رہی ہے؟

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب! آزادی حاصل ہونے کے بعد ہمارے رہنما اپنے ملک کے رہنے والوں میں ایک ایک فرد کو ہر معاملہ میں اتنا آزاد دیکھنا چاہتے ہیں کہ دُنیا کے تمام آزاد ممالک نہ صرف ہمارے ملک کی آزادی پر رشک کریں بلکہ ہمارے ملک کے افراد کی آزادی کو دیکھ کر دم بخود رہ جائیں۔ چنانچہ آزاد ہندوستان کے لئے جو جدید زبان وضع کی جا رہی ہے وہ اپنے میں اس درجہ انفرادیت رکھتی ہے کہ ہر فرد جو زبان بولتا ہے اُسے وہ خود تنہا سمجھتا ہے۔ اور ہم چونکہ اہنسا پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے دوسروں کو اپنی زبان سمجھنے کی زحمت بھی نہیں دینا چاہتے۔ ہاں اسی زبان کی رعایت سے ہم نے آزاد ہونے کے بعد جو طریقۂ تعلیم جاری کیا ہے وہ اس درجہ بلند پایہ ہے کہ ہم نے اپنی گذشتہ بیس سالہ آزادی میں اتنے مستند جاہل پیدا کر دیئے ہیں کہ دُنیا کے دوسرے ممالک ابتدائے آفرینش سے اب تک اتنے مستند پڑھے لکھے نہیں پیدا کر سکے۔

مرزا صاحب: مگر زبان تو ایسی چیز ہے جس کا ایک ایک لفظ جب مدّتوں بولا جاتا ہے تب کہیں جا کر عوام کے دربار سے شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے۔

تیسرا لڑکا: مگر مرزا صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم ہر کام دُنیا کی عام روش سے ہٹ کر کرتے ہیں۔ اسی لئے دُنیا کی زبانوں کی ترویج کے طریقے میں اور ہمارے طریقے میں فرق ہے۔ ہمارے یہاں عوامی سرکار ضرور ہے مگر زبان کے معاملہ میں ہماری سرکار عوام کی پابند نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جس سرعت سے انگریز ہمیں آزاد کر کے اپنے وطن کو بھاگ گیا تھا اسی سرعت کو ہم نے اپنے ہر فعل و عمل میں شامل کر لیا ہے۔ ہم کاتا اور لے دوڑی کے قائل ہیں۔ ہم پُرانے اور دقیانوسی طریقوں کو پسند نہیں کرتے۔ آپ کے زمانہ میں کسی لفظ کو ایجاد کر کے اس کے مستعمل ہونے کا انتظار کیا جاتا تھا جس میں خاصا وقت ضائع ہوتا تھا۔ ہم ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ ہماری زبان کے محقق بال کی کھال نہیں نکالتے وہ کھال کی بال نکال لیتے ہیں۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب! آپ کے بارے میں تو یہ مشہور تھا کہ آپ مر چکے ہیں پھر آپ دوبارہ کیسے نمودار ہو گئے۔

مرزا صاحب: جی ہاں! میں ذرا مر تو گیا تھا مگر آپ کے دیس میں اس سال جو میری صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے اس سلسلہ میں آپ کی سرکار نے کچھ سائنسدانوں کی مدد سے مجھے دو ایک ماہ کے لئے زندہ کرا لیا ہے تاکہ میں اپنی صد سالہ برسی میں شریک ہو سکوں اور آپ کے سامنے اخلاقیات پر تقریر کروں۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب! اخلاقیات کسے کہتے ہیں؟

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ کے مرنے کے کم و بیش اسّی سال بعد جب ہمارا ملک آزاد ہوا تو اس وقت اخلاقیات کا کبھی تو جنازہ نکل گیا تھا پھر کیا آپ اُسے کبھی اپنے ہمراہ زندہ لائے ہیں؟

مرزا صاحب: مگر مجھے تو اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ میں آپ کے سامنے صرف اخلاقی قدروں پر روشنی ڈالوں گا جو میرے زمانہ میں رائج تھیں۔

کئی آوازیں: مرزا صاحب! کیا ان پر روشنی ڈال کر آپ ہم سبھوں کی زندگیاں تلخ کر دیں گے۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب! کیا اب دوبارہ زندہ ہو کر آپ یہیں رہنا شروع کر دینگے؟

مرزا صاحب: نہیں بیٹا۔ مجھے تو صرف چند روز کے لئے سائنسدانوں نے زندہ کیا ہے اس کے بعد میں پھر مر جاؤں گا۔

دوسرا لڑکا: پھر تو آپ کو دوبارہ مرنے میں بڑی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی؟

تیسرا لڑکا: نہیں بھائی! ایک مرتبہ مرنے کے بعد مرزا صاحب کو چونکہ مرنے کا تجربہ ہو چکا ہے لہٰذا اس مرتبہ ان کو مرنے میں زیادہ زحمت نہ ہوگی۔

پانچواں لڑکا: اچھا مرزا صاحب آپ اپنی تقریر شروع کیجئے۔

مرزا صاحب: تو بیٹا! پہلے تو میں تم کو یہ بتا دوں کہ جس زمانہ میں میں زندہ تھا اس وقت میں اسی احاطہ کالے صاحب میں رہتا تھا۔

ایک طالب علم: جو ہمدرد دواخانہ کے پاس ہے؟

مرزا صاحب: جی ہاں۔ وہی گلی قاسم جان کے برابر والا احاطہ۔

دوسرا لڑکا: ارے جس کے بارے میں پہلے مشہور تھا کہ آپ کی صد سالہ برسی کے موقع پر اُسے خرید کر پھر سے بنوایا جائے گا۔ مگر بعد میں اُسے درست کرانے سے انکار کر دیا گیا۔

تیسرا طالب علم: مرزا صاحب! ہمدرد دواخانے کے مالک حکیم عبدالحمید صاحب ہی نے تو آپ کے نام پر غالب اکیڈمی قائم کرائی ہے۔

مرزا صاحب: اچھا! مگر میں تو سنتا تھا کہ میری یادگار کے طور پر کوئی سرکاری عمارت تعمیر کرائی جائے گی۔

ایک لڑکا : جی ہاں مرزا صاحب ! حکیم صاحب نے یہ عمارت اپنے طور پر بنوائی ہے البتہ اب جو آپ کے مزار کے سامنے قبرستان برابر کیا گیا ہے سُنا جاتا ہے وہاں کوئی نئی عمارت تعمیر ہونے والی ہے ممکن ہے یہ وہی عمارت ہو جسے آپ فرما رہے ہیں ۔ چونکہ ہماری دلّی میں بہت سے ہوٹل اور عمارتیں ایسے ہی مقامات کو برابر کر کے دلّی کی خوبصورتی کو دوبالا کیا جا رہا ہے اس لئے آپ کی یادگار کو خوبصورت بنانے کے لئے یہ زمین حقیقتاً بڑی مناسب ہے ۔

مرزا صاحب : تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی حکومت کو اُردو ادب اور اس کی شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی ہے ۔

دوسرا لڑکا : جی ہاں ہماری قومی حکومت جب سے قائم ہوئی ہے ۔ اُسے اُردو زبان سے اتنی زبانی ہمدردی ہے کہ ملک کا سارا کا سارا اُردو داں طبقہ حیرت میں مبتلا ہے کیونکہ اُردو زبان سے ایسی ہمدردی تو آپ کی سلطنت مغلیہ نے بھی اپنے دَور میں کبھی ظاہر نہیں کی تھی ۔

ایک لڑکا : مگر مرزا صاحب ! یہ آپ زندہ کیسے ہوگئے ؟

مرزا صاحب : بیٹا ! مجھے اس کی خبر نہیں کہ مجھے کیونکر زندہ کیا گیا میری حیثیت تو یہ ہے کہ بیٹھے کو کھڑا کیا کھڑا ہے ۔ (ہر طرف سے قہقہے)

آٹھواں لڑکا : مرزا صاحب ! اگر آپ ہم کو کسی ترکیب سے دوبارہ زندہ ہونے کا نسخہ بتا دیتے تو اِدھر اسٹرائیک کے سلسلہ میں پولیس نے جو جگہ جگہ فائرنگ اور لاٹھی چارج کر کے ہمارے کئی ساتھیوں کو مار ڈالا ہے اُنہیں ہم دوبارہ زندہ کر لیتے اُن سے اوّل تو ہمیں دوبارہ ملنے کا موقع مل جاتا دوسرے ابتک مرنے کا جو خوف ہماری اسٹرائیکوں کو ناکام بناتا رہا ہے وہ بھی ہمارے دلوں سے دُور ہو جاتا ۔

مرزا صاحب : بھئی میں تو صرف دوبارہ زندہ ہونے کا گنہگار ہوں البتہ ابھی جب میں آپ کے یہاں آرہا تھا تو رستے میں کچھ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ مرزا صاحب کو اُردو داں طبقے کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے پھر سے زندہ کرایا گیا ہے

کیا یہ بات صحیح ہے۔؟

کئی آوازیں: اجی۔ ہم لوگوں نے یہ بھی بات سُنی ہے کہ کچھ نیتاؤں نے مل کر آپ کے ساتھ یہ چال چلی ہے۔ مگر مرزا صاحب۔ اب کانگریس ہے کہاں؟ وہ تو گاندھی جی کے ساتھ چلی گئی صرف ہمارے دیش میں نیتاؤں کو چھوڑ گئی ہے جو آجکل درمیانی مُدت کے الکشن لڑتے میں لگے ہیں اور قومی سرمایہ کی ناندوں میں منہ ڈال کر پڑے رہنے کی فکر میں ہیں۔

مرزا صاحب: بھئی۔ میں یہ فضول کی باتیں تو جانتا نہیں میں صرف تم لوگوں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے اپنے اُن مہاتما گاندھی کو دیکھا ہے جنہوں نے تمہارے دیس کو آزاد کرایا تھا؟

بہت سی آوازیں: ہم نے کہیں کہیں اپنے نیتاؤں کی تقریروں میں اُن کا نام سُنا ہے مگر کبھی دیکھا نہیں۔

مرزا صاحب: مگر تم نے اُن کی تصویر تو دیکھی ہوگی۔؟

ایک لڑکا: حضور! ہم نے تو ان کی تصویر بھی نہیں دیکھی ہم صرف اپنے دیس کے الکشنی نیتاؤں کو پہچانتے ہیں اور ان کو جگہ جگہ سیاہ جھنڈے بھی دکھا چکے ہیں۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب۔ میرے محلہ میں ایک جگہ گاندھی جی کی تصویر اب تک لگی ہوئی ہے۔

تیسرا لڑکا: میرے ابّا کے پاس بھی مہاتما جی کی ایک تصویر ہے انہوں نے اسے صندوق میں بند کر رکھا ہے کیونکہ وہ بھی اب ملک میں تیزی سے غائب ہو رہی ہے۔

مرزا صاحب: یہ تو بہت بُرا ہو رہا ہے۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب! بات یہ ہے کہ اب ہمارے دیس میں ہر اچھائی کی جگہ بُرائی کو پسند کیا جاتا ہے اسی لئے جتنی اچھی اچھی تصویریں ہیں وہ سب غائب ہوتی جا رہی ہیں۔

مرزا صاحب: بھئی۔ مہاتما جی جیسے لوگ کہیں روز روز پیدا ہوتے ہیں یہ مہاتما

جی ہی کی ذات تھی جنہوں نے اہنسا کے ذریعہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکال باہر کیا۔

ایک لڑکا: مگر مرزا صاحب! اہنسا کس چیز کو کہتے ہیں؟ آپ سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کی زبان سے مہاتما جی کے نام کے ساتھ ساتھ ہم نے اہنسا کا نام سُنا ہے کیا یہ مہاتما جی کا تخلص تھا؟

مرزا صاحب: ارے نہیں تم ہندوستان میں رہ کر مجھ سے اہنسا کے معنی پوچھتے ہو۔ اور اُسے مہاتما جی کا تخلص بتلاتے ہو یہ لفظ تو تمہارے دیس ہی سے نکلا ہے اور اسکے معنی ہیں عدم تشدد۔

(سارے لڑکے قہقہے لگانا شروع کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اہنسا اہنسا کہہ کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ مرزا صاحب حیران ہو کر ایک ایک لڑکے کا چہرہ دیکھنے لگتے ہیں۔)

ایک لڑکا: حضور! جس طرح ہمارے دیس کے نیتا مہاتما جی کا نام سُنکر ہنستے ہیں اُسی طرح ہم لوگوں کو اُن کے بتائے ہوئے لفظ اہنسا پر ہنسی آتی ہے۔ ہم لوگ اہنسا والا کام کبھی نہیں کرتے اور نہ ہم اس لفظ سے واقف ہیں۔

مرزا صاحب: مگر تمہارے مہاتما جی کی ساری تحریکوں کی بُنیاد صرف اہنسا پر تھی اور وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

ایک لڑکا: تو کیا وہ سیاستدان نہیں تھے۔؟

مرزا صاحب: نہیں میاں! وہ خالص سیاستدان اور سچے انسان تھے۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سیاسی بھی تھے اور سچ بھی بولتے تھے۔ سچ کا سیاست سے کیا تعلق؟

مرزا صاحب: سچ سے یہ مُراد ہے کہ گاندھی جی ہمیشہ ٹھیک ٹھیک بات کہتے تھے۔

ایک لڑکا: تو پھر کوئی ان کی بات سُنتا بھی نہ ہوگا۔

مرزا صاحب: نہیں ان کے تمام ساتھی جب تک وہ زندہ رہے سچ بولتے رہے اور

سچائی اور صدق دلی کے ساتھ ان کے کہنے پر عمل کرتے رہے اُنھوں نے صداقت، سچائی اور اہنسا کے ہتھیاروں سے آزادی کی جنگ جیت کر انگریزوں کو دیس سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ انگریزوں کی اُن کی سچائی اور اہنسا سے روح فنا ہوتی تھی۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب! کیا سچ اور اہنسا سے لوگ بھاگنا شروع کر دیتے ہیں؟

دوسرا لڑکا: ارے یہ مرزا صاحب سے پوچھنے کی کوئی بات ہے خود ہمارے دیس میں دیکھ لو کہ کس طرح لوگ سچ سے بھاگ رہے ہیں۔

چھٹا لڑکا: مگر مرزا صاحب معاف کیجئے گا۔ یقین مانئے ہم اپنا ملک چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہتے اس لئے ہمارے سامنے سچ کا نام نہ لیجئے۔ ہم تو پہلے نیتا بنیں گے اور جب ہمیں جھوٹ بولنے کی اچھی مشق ہو جائے گی تو حکومت پر قبضہ کر لیں گے۔ اب تو توڑ پھوڑ کرنے کے بعد ہی آدمی اچھے عہدے پر پہنچتا ہے۔ ہمارے دیش میں کتنے ہیں جو زبردست توڑ پھوڑ کر کے وزیر بنے ۔۔ ہیں۔

مرزا صاحب: بیٹا! دیکھو ایسی باتیں نہیں کرتے۔ سچ میں فائدہ ہے، اسی لئے تمہارے باپو کی دُنیا میں اتنی عزت کی جاتی ہے یاد رکھو! سچ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور سچ بولنے سے عمر بڑھتی ہے اور جھوٹ صرف وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب۔ اسی لئے تو ہم وہی چیز اختیار کریں گے جو ہماری زندگی کا ساتھ دے ہماری زندگی بھی عارضی ہے اور جھوٹ بھی وقتی اور عارضی ہوتا ہے لہذا کیوں نہ ہم وہ چیز اختیار کریں جو ہماری زندگی کی طرح عارضی ہو دوسرے ہم اتنی عمریں بھی بڑھانا نہیں چاہتے کیونکہ جیسی جیسی ہماری عمریں بڑھیں گی ویسی ویسی گرانی بھی بڑھے گی اور گرانی کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ بھی بڑھے گی اور آخر میں کھانے کی چیزوں کی جگہ زہر بکنے لگے گا۔ اس لئے ہم زہر کھا کر مرنا نہیں چاہتے۔

جس زمانہ میں لوگ سچ بولتے ہوں گے اُس زمانہ میں کھانے پینے کی چیزیں بھی خالص اور سستی ہوتی ہوں گی، دوسرے گاندھی جی کو سچ بولنے کے جُرم ہی میں تو گولی ماری گئی تھی

مرزا صاحب: اچھا - اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگ تھک گئے ہیں
لہذا اب میں کل اسی وقت پھر حاضر ہو کر ملک کے ایک ایسے لیڈر کا حال آپ کے سامنے
بتاؤں گا جنہیں آپ لوگوں میں سے بہت سے دیکھ بھی چکے ہیں - !!

اس لئے سچ بول کر ہم گولی کھانے کو تیار نہیں ہیں۔

(کئی لڑکے جو ان تمام طلبہ کے سربراہ معلوم ہوتے ہیں چپکے چپکے ایک دوسرے سے) مرزا صاحب اب بور ہوئے جا رہے ہیں لہذا ایک کنارے سے تالیاں پیٹ دو۔ (ہر طرف سے تالیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں اور تالیوں کی گونج اور شور کی آواز میں مرزا صاحب ہال سے نکل کر اکیڈمی کی راہ لیتے ہیں)

دُوسرا دِنْ

ہندوستان کے ہر صوبے سے پچاس پچاس لڑکے اور لڑکیاں مرزا صاحب کا اخلاقیات کا ریفریشر کورس کرنے آئی ہوئی ہیں۔ ان میں ہندی کے بہت سے مقامی شرپسند طلبہ اور طالبات بھی شریک ہو گئی ہیں جن کے سبب درجہ میں طرح طرح کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ایک طرف بہت سے طالب علم "ہندی، ہندو، ہندوستان" کے فلک شگاف نعرے بلند کر رہے ہیں دوسری طرف جنوبی ہندوستان سے آئے ہوئے طلبہ اور طالبات اینٹی ہندی کے نعرے بلند کر رہی ہیں۔ تیسری طرف کچھ طلبہ ٹمل اور تیلگو میں طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ ڈائس کے قریب کچھ موافق اور مخالف طلبہ میں گُتم گتھا شروع ہو گیا ہے۔ دو لڑکیاں جو شیڈی لباس پہنے تھیں کسی نے .... ان کے چست لباس پر پیچھے سے .... بلیڈ چلا دیا ہے جس کے سبب وہ اکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سینہ چھپائے رو رہی ہیں اسی درمیان میں مرزا صاحب پہنچ جاتے ہیں۔

مرزا صاحب: (برافروختہ ہو کر) یہ آپ لوگوں نے کیا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے؟

کئی آوازیں: ہندی، ہندو، ہندوستان، تاناشاہی نہیں چلے گی۔

انگریزی ختم کرو۔ ہماری دیش بھاشا ہندی ہے۔ ہندی نہیں چلے گی۔ انگریزی نہیں چلے گی۔ آسامی چلے گی۔ بنگالی لے کے رہیں گے۔ ہندی کو مٹا دو۔ ہندی لے کے رہیں گے۔

مرزا صاحب: آپ سب خاموش ہو جائیے۔

(ایک طرف سے لڑکیوں کے رونے کی آواز)

مرزا صاحب: یہ کون رو رہا ہے۔ آپ لوگ خاموش ہو جائیں (لڑکوں کے مجمع کو چیرتے پھاڑتے مرزا صاحب اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں دو پٹے کٹی لڑکیاں رو رہی ہیں) آپ لوگ کیوں رو رہے ہیں۔؟

ایک لڑکا: یہ لڑکے نہیں لڑکیاں ہیں۔ کسی نے بلیڈ سے ان کا جمپر کاٹ دیا ہے۔

دوسرا لڑکا: یہ اوپر سے بالکل ننگی ہو گئی ہیں۔

ایک آواز: بڑا مزہ آرہا ہے۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ اپنی شال ان کو دیدیجئے۔

مرزا صاحب: لاحول ولاقوۃ۔ اِن لڑکیوں کو یہاں کون لایا ہے؟

ایک آواز: سرکار

دوسری آواز: آزادی

تیسری آواز: ہمارے ملک میں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتی ہیں۔

چوتھی آواز: مزہ نہ ہو تو دام واپس۔

مرزا صاحب: ان لڑکیوں کو سامنے والی عمارت میں پہنچا دو۔

بہت سی آوازیں: لڑکیاں نہیں ہٹیں گی۔ تاناشاہی نہیں چلے گی۔ ہم ان کے بغیر کوئی بات نہیں سُنیں گے۔

(دو لڑکے منہ سے سگریٹ نکال کر مرزا صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے) آپ ذرا اسے روکیں ہم دونوں ان کو گود میں اُٹھا کر سامنے والی عمارت میں پہنچا کے آتے ہیں۔ (دونوں لڑکے لڑکیوں کو لاد کر مجمع سے نکلتے ہیں۔ ہر طرف سے تالیوں کی گونج میں نعرے لگتے ہیں۔"انقلاب زندہ باد — آزادی زندہ باد — مرزا صاحب زندہ باد — لڑکیاں لیکر رہیں گے۔"

مرزا صاحب: یہ آپ کیا لغویت کر رہے ہیں؟ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟

کئی آوازیں: ہم سب بھارت کے سپوت ہیں۔ ہم آپ کی صورت دیکھنے آئے ہیں۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب آپ اس شور سے پریشان نہ ہوں۔ یہ چکلس تو ہمارے ہاں ہر جگہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کلاس شروع ہونے سے پہلے ہوا ہی کرتا ہے۔

ایک آواز: ہمارے مُلک میں بیداری پھیل رہی ہے۔

مرزا صاحب: آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی؟

دوسری آواز: پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔

ایک دوسرا لڑکا: ہمارے یہاں آجکل زبان کا مسئلہ چل رہا ہے۔ اور سیکلر اسٹیٹ ہونے کی وجہ سے ہم سب کو ہندی پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

چوتھا: — یہ برا اہمن راج ہے۔ مرزا صاحب۔

مرزا صاحب: اچھا جو لڑکے جس صوبے سے آئے ہیں وہ اپنے اپنے صوبے کے لڑکوں کے ساتھ گروپ بنا کر بیٹھ جائیں اور جو کچھ میں کہوں اُسے بغور سنیں۔

ایک دور کی آواز: لڑکیوں سے منع کر دیجئے کہ وہ ہمیں گھوریں نہیں۔

دوسری آواز: شمیم شمیم۔
تیسری آواز: آپ سب خاموش رہیں۔ اب مرزا صاحب کا لکچر شروع ہونے والا ہے۔
ایک طالب علم: مرزا صاحب! کیا عالمِ بالا میں جہاں سے آپ آئے ہیں وہاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتی ہیں؟
مرزا صاحب: نہیں۔ وہاں رُوحیں ہوتی ہیں اُن کے جسم نہیں ہوتا۔ سب روحیں ساتھ رہتی ہیں۔
ایک لڑکا: وہاں کون سی زبان بولی جاتی ہے؟
مرزا صاحب: وہاں روحیں ہر زبان کو سمجھتی ہیں اِس لئے کسی کی زبان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔
ایک لڑکا: مگر ہمارے یہاں تو زبانوں کی نس بندی ہو رہی ہے۔
دوسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ کے یہاں غلّہ کس بھاؤ ہے؟
مرزا صاحب: وہاں غلّہ نہیں ہوتا۔ روحیں ہَوا کھاتی ہیں۔
ایک آواز: ہمارے مُلک میں غریب لوگ بھی ہَوا کھاتے ہیں۔
ایک آواز: ان غریبوں کو آپ اپنے ساتھ لیتے جائیے گا۔
مرزا صاحب: یہ جو زبان میں آپ لوگوں کے سامنے بول رہا ہوں آپ اِسے سمجھتے ہیں؟
کئی آوازیں: یہ زبان پہلے اُردو کہلاتی تھی مگر جب سے ہمارا ملک آزاد ہوا ہے اِسے ہندی کہہ کر سب بولتے ہیں۔
مرزا صاحب: تو کیا اب آپ کے یہاں اُردو نہیں پڑھائی جاتی؟
ایک لڑکا جو یو۔ پی سے آیا تھا: ہمارے صوبے میں اُردو قریب قریب ختم

کردی گئی ہے۔ اب صرف الکشنوں میں مسلمانوں اور اُردو جاننے والوں کے ووٹ لینے کے لئے اُسے استعمال کیا جاتا ہے۔

مرزا صاحب: مگر میں تو اُردو کا شاعر ہوں پھر میری صد سالہ برسی کیوں منائی جا رہی ہے؟

دوسرا لڑکا: آپ کی صد سالہ برسی درمیانی مدت کا الکشن جیتنے کے لئے منائی جا رہی ہے۔

مرزا صاحب: مجھ سے اور الکشن سے کیا واسطہ؟

ایک لڑکا: آپ ہمارے ملک کے بہت مقبول کوی ہیں اور جنتا میں جو لوگ اُردو نہیں پڑھ پاتے ان کو بھی آپ کی کویتائیں پسند ہیں اس لئے الکشن کے موقع پر وہ پارٹی جو اُردو کی سب سے بڑی دشمن ہے آپ سے حد درجہ عقیدت اس وجہ سے ظاہر کرتی ہے تاکہ اُردو داں طبقہ کے ووٹ اُسے مل جائیں۔

مرزا صاحب: یہ الکشن کیا بلا ہے؟

ایک لڑکا: حضور! الکشن ایک قسم کی سٹہ بازی ہے جس کے ذریعہ جنتا کو بیوقوف بنا کر لوٹا جاتا ہے۔ اس میں پہلے ملک اور قوم کے نام پر نعرے لگائے جاتے ہیں پھر جاہل ووٹروں کو گدھا سمجھ کر وقتی طور پر باپ بنا لیا جاتا ہے اس کے بعد کسی آدمی کو جو جنتا میں اپنی دیانت داری، شرافت اور نیک چلنی میں مشہور ہوتا ہے اس کے کندھے پر الکشنی بندوق رکھ کر چھڑائی جاتی ہے اور نیتا لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔ یہ ناٹک ہر پانچ سال کے بعد الکشن کے نام سے ہمارے ملک میں کھیلا جاتا ہے۔

مرزا صاحب: تو بھائی میں نے ان لوگوں کا کون سا باپ مارا تھا جو مرنے کے بعد مجھے اس جھگڑے میں پھنسا یا گیا۔ ۔ ۔

دوسرا لڑکا: حضور! اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں ہے۔ بلکہ ساری خطا آپ کے کلام کی مقبولیت کی ہے۔ اور آپ کو اس وجہ سے پکڑا گیا ہے کہ اب جس فرقے کے ووٹ لینا ہیں اُن پر تمام داؤں استعمال ہو چکے ہیں اور جو پارٹی آپ کو اس درمیانی مدت کے الکشن میں استعمال کر رہی ہے اب وہ سیاسی بجو کا کام کر رہی ہے اور قبرستان سے اُن مشہور و معروف سیاسی اور غیر سیاسی مُردوں کو لا کر الکشنوں میں استعمال کر رہی ہے۔۔۔ جن کے نام پر لوگ ووٹ دے دیتے ہیں۔

مرزا صاحب: تو میرے علاوہ اور لوگ جو زندہ ہیں اُنہیں استعمال کر لیا ہوتا۔

دوسرا لڑکا: زندوں میں تو جتنے لوگ تھے وہ سب استعمال ہو چکے ہیں۔

مرزا صاحب: مثلاً؟

وہی لڑکا: مثلاً جب تک اس پارٹی کے بانیوں میں جو دیانتدار، ایماندار، اور محب وطن لوگ زندہ رہے ان کو استعمال کیا جاتا رہا۔ اس کے بعد جب ایک ایک کر کے وہ ختم ہو گئے تو ایک زمانے تک جو آخری دیندار بچے انہیں استعمال میں لایا گیا اور جنتا آنکھ بند کر کے ان کے نام پر ووٹ دیتی رہی۔ اس پارٹی کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کسی کتے کو اپنا ٹکٹ دیدیتی تھی، تو جنتا اُسے بھی ووٹ دیدیتی تھی اور یہ سلسلہ سالہا سال تک قائم رہا۔

ایک لڑکا: پھر آخر میں اس پارٹی کے جو چند بے حد دیانتدار اور مخلص لوگ رہ گئے تھے اُنہوں نے مل کر ایسا زور مارا کہ ملک آزاد ہو گیا اور آخر میں جب نیتوں میں کھوٹ پیدا ہوئی تو ایک شخص نے اس مردِ مجاہد کو شہید کر دیا جس کی قیادت میں ملک آزاد ہوا تھا۔

مرزا صاحب: ہاں ایک دن عالم بالا میں یہ واقعہ میں نے بھی سُنا تھا۔ مگر

اس کے بعد کیا ہوا؟

دوسرا لڑکا: حضور! اس مردِ مجاہد کے مرنے کے بعد پارٹی میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔ بداعمالیاں بڑھنے لگیں۔ پارٹی کے بعض لیڈروں نے پرانی روش چھوڑکر اور ملک و قوم کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کر اپنے ذاتی اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لئے اس مردِ مجاہد کے خون میں لقمہ ڈبو کر کھانا شروع کیا اور آزادی کے بعد دو تین الکشن اس مردِ مجاہد کی شہادت پر مگرمچھ کے آنسو بہاکر جیتے اس کے بعد جب جنتا ان کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی تو انھوں نے نہ صرف اُس کی تعلیمات کو بھلا دیا بلکہ اس کے بتائے ہوئے اُصولوں کی مخالفت کرنے لگے۔ پارٹی میں اس کے دوچار عقلمند رہ گئے تھے ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے کچھ خود غرضوں نے کھدّر کے چولے بدلوا کر اور اپنے آدمیوں کو داخل کر کے پوری جماعت پر قبضہ کرلیا۔ اور دائیں بائیں لوٹ مار شروع کردی۔

مرزا صاحب: یہ پنڈت جواہر لال نہرو کون تھے؟

ایک کھدّرپوش: مرزا صاحب! وہ اُس پارٹی کے ایک مخلص اور انتہائی دیانتدار بانیوں میں سے ایک کے لڑکے تھے۔ اور جیسے وہ خود دیانتدار تھے ویسے ہی اُن کے صاحبزادے تھے۔ آزادی کے بعد اُنھیں کو مہاتما جی نے ملک کا وزیراعظم بنانا پسند کیا تھا۔ اُن میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک مخلص قوم پرست میں ہونی چاہئیں۔ اُنھوں نے مرتے مرتے قوم کو ہر قسم کی ذلّت سے بچانے کی کوشش کی مگر مرنے والے اور ذلیل ہونے والے کو کس نے روکا ہے۔

مرزا صاحب: تب ہی ایک دن وہ میرے ہندوستان آنے سے پہلے اپنے باپ کے ہمراہ میرے پاس آئے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا صاحب چونکہ مجھے ہمیشہ سے آپ سے عقیدت رہی ہے اس لئے آپ میرے وطن تو تشریف لئے جا رہے ہیں مگر اپنے طور پر

انتظام کر کے جائیے گا کیونکہ آپ کی صد سالہ برسی میں بیشتر وہ حضرات شریک ہیں جو اس قسم کے ڈھونگ کھڑے کر کے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ آپ کی صد سالہ برسی درمیانی مُدّت کے الکشنوں سے قبل منانے کی تجویز ہے اسلئے مجھے اور بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

دوسرا لڑکا: پنڈت جی کس قسم کا خطرہ بتاتے تھے؟

مرزا صاحب: اُنہوں نے کچھ ایسے گول مول طریقہ پر کہا کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکا البتہ مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے پیسہ سے مضبوط ہو کر جائیے گا کیونکہ مُلک حد درجہ مقروض ہے اور والیان ریاست کا جیب خرچ بھی خطرہ میں پڑا ہوا ہے ایسی صورت میں وہ راجگان اور مہاراجگان جن کے آبا و اجداد آپ کی وقتاً فوقتاً کفالت کرتے رہتے تھے وہ بھی شاید آپ کی کوئی مالی اعانت نہ کر سکیں۔

تیسرا لڑکا: تو کیا آپ اس قسم کا کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہیں؟

مرزا صاحب: بات یہ ہے کہ جب تک میں عالم بالا میں تھا اس وقت تک تو میری برسی سے متعلق جو خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں اُنہیں پڑھ کر میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ شاید ابتدائے آفرینش سے آج تک اتنے بڑے پیمانے پر کسی شاعر کی برسی نہیں منائی گئی ــ مگر یہاں آنے سے قبل جب میں نے آکاش وانی سے خبر سُنی کہ میری یادگار قائم کرنے کے لئے جو سنگ بُنیاد راجدھانی میں رکھا گیا تھا اس پر کوئی ٹرک چل گیا اور اس پتھر کے ٹکڑوں سے کئی روز تک گرد و پیش کے آپس میں ڈھیلے بازی کرتے رہے اور حکومت تک اسکی خبر تک نہیں پہنچی تو اس کے بعد سے مجھے کچھ اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ ممکن ہے کہ چلتے وقت میری آمد و رفت کا کرایہ بھی خطرہ میں پڑ جائے۔

چوتھا لڑکا: تو آپ تو ہماری حکومت کے مہمان ہیں؟

مرزا صاحب: نہیں سردست تو میاں حکیم عبدالحمید ہمدرد دواخانے والے نے جو میرے نام کی اکیڈمی قائم کی ہے اُس میں مقیم ہوں اس اکیڈمی کے سکریٹری میاں عتیق صدیقی جو میرے عقیدت مندوں میں ہیں انہوں نے ماراللحم کی کئی بوتلیں دواخانے سے لاکر دی ہیں اور کہا ہے کہ حکیم صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ انہیں سویرے شام استعمال کریں تاکہ آپ میں قوتِ برداشت پیدا ہو تاکہ اگر خدا ناکردہ کوئی ناخوشگوار واقعہ اُردو زبان کے ساتھ پیش آئے تو آپ کے قلب پر اس کا اثر نہ ہو۔ کیونکہ اُردو زبان کے ساتھ جو معاندانہ برتاؤ آزادی کے بعد سے ہمارے ملک میں ہو رہا ہے اُسے اُردو داں طبقہ ماراللحم پی پی کر برداشت کر رہا ہے۔

تیسرا طالب علم: تو ابھی تک تو آپ کو کوئی دُکھ اس سلسلہ کی کسی خبر سے نہیں پہنچا۔؟

مرزا صاحب: ہاں سردست صرف ایک خبر سے قدرے تھوڑی دیر کے لئے دل میں ایک اختلاجی کیفیت پیدا ہوئی تھی مگر وہ پوری خبر پڑھ کر دور ہو گئی۔

چوتھا لڑکا: آپ وہ خبر بتائیے ہم حتی الامکان آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔

مرزا صاحب: ہماری زبان کے نام سے ایک پرچہ یو۔ پی کے شہر علی گڑھ سے نکلتا ہے اُس پرچہ کی ایک پُرانی کاپی جس کمرہ میں میں مقیم ہوں اُس میں پڑی ہوئی تھی اُس میں ایک خبر ضرور ایسی تھی جسے پڑھ کر صدمہ ہوا۔

نوہی لڑکا: بتائیے بتائیے۔ اس خبر میں کیا تھا؟

مرزا صاحب: اس اخبار میں جو خبر شائع ہوئی اُس کا عنوان تھا: "اُردو میں انسانی حقوق کا چارٹر تقسیم نہ کرنے پر پارلیمنٹ میں ہنگامہ" اور اس کے

اندر لکھا تھا کہ پارلیمنٹ میں اس وقت سخت ہنگامہ ہوا جب اسپیکر بلخوا ریڈی نے انسانی حقوق سے متعلق اقوامِ متحدہ کا چارٹر پڑھ کر ایوان میں سُنایا اور اعلان کیا کہ یہ چارٹر ہندوستانی زبانوں میں ہی ممبروں کو دیا گیا ہے۔ مگر اُردو زبان میں اُسے مُہیا نہیں کیا گیا اور جب میاں اسحاق سنبھلی نے اس پر احتجاج کیا تو وزیر امورِ پارلیمان نے وعدہ کیا کہ چارٹر کا ترجمہ اُردو میں بھی مہیّا کیا جائے گا۔

وہی لڑکا: تو اب تو آپ کو اطمینان ہے نا؟

مرزا صاحب: ہاں بیٹا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایک صاحب بتا رہے تھے کہ درمیانی مدّت کے الکشن جب تک ختم نہیں ہوتے اس وقت تک تو یہ سارے وعدے وعید ہو رہے ہیں اور اُردو داں طبقہ کو بٹایا جا رہا ہے اور میری برسی منانے کے سلسلہ میں جلسے مشاعرے اور کانفرسیں ہو رہی ہیں مگر جوں ہی الکشن ختم ہوں گے اس کے بعد کوئی مرزا صاحب کو گھاس نہ ڈالے گا۔

وہی لڑکا: نہیں مرزا صاحب۔ میں نہرو خاندان سے تعلق رکھتا ہوں میری موجودگی میں ایسی کوئی صورت پیش نہ آئے گی دوسرے آجکل ہمارے ملک میں پنڈت نہرو کی صاحبزادی وزیر اعظم ہیں وہ ایسی کوئی بات نہ ہونے دیں گی جس سے آپ کو تکلیف پہنچے۔ کیونکہ اُنہیں معلوم ہے کہ اُن کے باپ اور دادا کو آپ سے کس درجہ عقیدت تھی۔ بھلا ان کی موجودگی میں کیا مجال ہے جو آپ کو کوئی تکلیف ہو۔ اگرچہ وہ ہندی بولتی ہیں مگر اُردو سے اُن کو بیر نہیں ہے۔

جنوبی ہندوستان کے کئی لڑکے: مرجا جی اگر آپ کو اس میں ذرا بھی کھاد بھید معلوم ہو تو آپ ہمارے یہاں۔ کیرالا، مدراس چلے آئیے گا ہم آپ کو اپنے خرچے سے عالم بالا پہنچا دیں گے۔

بمبئی کے آئے ہوئے بہت سے لڑکے: آپ ہمارے یہاں چلے آئیے گا ہم

آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ ہماری حکومت بھی اُردو کی دوست ہے۔

بنگال کا آیا ہوا حجتا: مرزا صاحب آپ ہماری طرف بنگال چلے آئیے گا۔ وہاں ہماری حکومت آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دے گی۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔

ایک جن سنگھی: جب تک درمیانی مدت کے الکشن چل رہے ہیں۔ آپ اپنے وطن اکبر آباد یا لکھنؤ چلے آئیے گا وہاں بھی کانگریسی آپ کو تکلیف نہیں ہونے دیں گے مگر الکشن کے بعد ہی آپ واپس چلے جائیے گا۔ ورنہ پھر وہاں لوگ ریڈیو کی زبان بولنا شروع کر دیں گے جسے سنکر آپ کے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔

مرزا صاحب: ارے بھئی میں مرنے سے کوئی ڈرتا تھوڑے ہوں مرنے کا تجربہ رکھتا ہوں۔ اور ایک بار مر چکا ہوں۔

دُور کی آواز: یو۔ پی میں کانگریس کے یا جن سنگھ کے جیتتے ہی آپ کا گلا گھونٹ دیا جائیے گا۔ آپ وہاں ہرگز مت جائیے گا۔

کئی آوازیں: یہ کون مرزا صاحب کو ڈرا رہا ہے۔ (مرزا صاحب سے) نہیں مرزا صاحب! آپ اطمینان سے رہیں۔ آپ اِن سالوں کو بکنے دیجئے۔ اِس ایک مہینے کے اندر کچھ نہیں ہونے دیا جائے گا۔

ایک طالب علم: مرزا صاحب! آپ زبان وبان کے جھگڑے میں مت پڑیئے یہ بتائیے کہ وہاں پنڈت جواہر لال جی تو خوش ہیں؟

مرزا صاحب! نہیں! وہ تو اُس وقت سے جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑی تھی اپنے دیش والوں سے بیحد ناراض ہیں کہتے تھے کہ اگر میں زندہ ہوتا تو ہرگز ہرگز یہ شرمناک حرکت نہ ہونے دیتا۔

دوسرا طالب علم: اور مہاتما جی کیا کہتے تھے؟

مرزا صاحب: مہاتما جی تو پنڈت جی سے بھی زیادہ اپنے ملک والوں سے ناراض تھے۔ اور انھوں ہی نے تو بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر دُعا کی تھی کہ لال بہادر شاستری جی کو کسی بہانے عالم بالا بھیجدیا جائے چنانچہ مہاتما جی کی دُعا قبول ہو گئی۔

ایک لڑکا: شاستری جی کو بلانے میں اتنی جلدی کیوں کی گئی؟

مرزا صاحب: بات یہ تھی کہ وہ ایسے لوگوں میں بُری طرح پھنس گئے تھے جنکو ملک و قوم سے کوئی دور کا لگاؤ نہ تھا۔ وہ ایک صلح کل انسان تھے مگر ان کو اتنا تنگ کیا گیا کہ مجبوراً اُنہیں جنگ میں کودنا پڑا۔ جب یہاں جنگ چھڑی ہے اُسوقت عالم بالا میں جو انگریز آبادی ہے اُس نے بڑا جشن منایا اور گھروں گھروں چراغاں کیا۔ حالت یہ تھی کہ ادھر پنڈت جی اور مہاتما جی کسی سے آنکھ چار کرنے کے قابل نہ تھے اور اُدھر مسٹر جناح ملائیکہ سے کترا کر نکل جاتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو تو کس طرح دو بھائی آپس میں ایک دوسرے کی قتل و غارت گری پر اُتر آئے ہیں ملائیکہ بھی طنز کرتے تھے اور جو بے گناہ دونوں طرف سے لڑائی میں مر کر وہاں پہنچ رہے تھے اُن کو وہاں کے لوگ معصوم ٹھہراتے تھے اور کہتے تھے کہ بیچارے بلا سبب قبل از وقت مارے جا رہے ہیں۔ ہر طرف لڑانے والوں کو لوگ بُرا کہہ رہے تھے۔ مرنے والوں کے ساتھ ہر شخص کو ہمدردی تھی۔

ایک لڑکا: پھر تاشقند کے معاہدہ میں کیا ہوا؟

مرزا صاحب: ہوا کیا آخر میں دونوں کو اپنی اپنی جگہ اُس وقت اور زیادہ شرمندہ ہونا پڑا جب ایک تیسرے فریق نے دونوں کو اپنے یہاں بلوا کر سمجھا بجھا کر گلے ملوایا۔

ایک آواز: مرزا صاحب! یہ لڑائی نہیں گلی ڈنڈا تھا۔

مرزا صاحب: ہاں واقعی یہ لڑائی کیا گلّی ڈنڈا ہی تھا جو سیاستدان دونوں طرف کی جنتا کو کھلوا رہے تھے۔ بھلا لاٹھی مارے کہیں پانی جدا ہوتا ہے۔ ایک دن وہ آئے گا جب پھر یہ دونوں گلے مل جائیں گے۔

دوسری آواز: پھر شاستری جی کو کیوں بلوایا گیا۔ ایوب خاں کو کیوں نہیں بلوایا گیا؟

مرزا صاحب: شاستری جی کو یوں بلوایا گیا کہ وہ بیچارے بلا وجہ اس جھگڑے میں ناتھ دیئے گئے تھے اور جن لوگوں میں یہ گھر گئے تھے وہ نہ تو ملک و قوم کے دوست تھے اور نہ سیاست سے واقف تھے لہذا اگر شاستری جی دوستی کرنے کے بعد گھر واپس جاتے تو نہ جانے ان کے ساتھ وہ لوگ کیا سلوک کرتے۔ دوسرے شاستری جی بھی تاشقند سے اپنے ملک جانے کو تیار نہ تھے۔ اس کے علاوہ مہاتما جی نے جو بارگاہِ ایزدی میں دُعا کی تھی وہ بھی قبول ہو چکی تھی اس لئے شاستری جی کو اللہ کا پیارا ہونا پڑا۔

ایک آواز: ارے بھئی کوئی مزے کی بات مرزا صاحب سے پوچھو کہاں سیاست میں اُلجھا دیا ہے۔ وہ شاعر آدمی ہیں ان کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟

ایک لڑکا: مرزا صاحب! ایک بات پوچھوں مگر سچ سچ بتائیے گا۔ وہاں کبھی کچھ پینے پلانے کا معاملہ ہے یا یوں ہی پڑے پڑے ہوا کھاتے گذرتی ہے؟

مرزا صاحب: میاں صاحبزادے وہاں جسم کا سوال ہی نہیں صرف روح ہی روح ہوتی ہے اس لئے وہاں شراب کس سے مانگی جائے جو اُسے پی کر روح تازہ کی جائے وہاں تو صرف ہوائیں کھانے کو ملتی ہیں۔

دوسرا لڑکا: اُن ہواؤں میں کوئی مزہ بھی ہوتا ہے۔ یا ایسی ہی ہوا ہوتی ہو جیسی یہاں غریبوں کو کھلائی جا رہی ہے؟

مرزا صاحب: اُس میں خوش ذائقہ بد ذائقہ ہر قسم کی ہوائیں ہوتی ہیں۔

ایک لڑکا: یہ جو بلیک مارکیٹیر، ذخیرہ اندوز، سیاسی منڈی کہلائے جاتے ہیں اُن سالوں کو کہاں رکھا جاتا ہے؟

مرزا صاحب: ایسے لوگ مجھے وہاں دکھائی نہیں دیئے۔

دوسرا لڑکا: اِن سالوں کے تو وہاں گدھا مار ماری جاتی ہوگی اور ایسی جگہ رکھے جاتے ہوں گے کہ سالے گھُٹ گھُٹ کر مر یں اور سانس لینے کو ہوا کو ترس جائیں۔

تیسرا لڑکا: کیا وہاں بھی ایسی ہڑتالیں اور اسٹرائکیں ہوتی ہیں جیسی آج کل ہمارے یہاں چل رہی ہیں اور وہاں بھی اسی طرح پولیس لاٹھی چارج اور گولی چلاتی ہے۔

مرزا صاحب: وہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہونے پاتی کیونکہ اس قسم کی حرکتیں وہاں کوئی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب۔ یہاں آکاش وانی سے جو خبریں نشر ہوتی ہیں کیا اُنہیں وہاں کے لوگ سُنتے ہیں۔؟

مرزا صاحب: وہاں سب زبانوں کے جاننے والے موجود ہیں مگر ایک زبان جو آزادی کے بعد سے آپ کے یہاں رائج ہوئی ہے اس کا سمجھنے والا ابھی تک۔۔۔ کوئی نہیں ہے جب آپ کے یہاں اس زبان میں کوئی بولتا ہے تو مختلف زبانوں کے جو محققین عالم بالا میں ہیں وہ بھی سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ملائکہ گاندھی جی اور جواہر لال سے آکر جب دریافت کرتے ہیں کہ آزادی کے بعد یہ کون سی زبان آپ کے دیس میں بولی جانے لگی ہے تو وہ بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں "تھی"، "تھا" اور "ہے" کے علاوہ اور

کوئی لفظ کسی کے پلّے نہیں پڑتا۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب۔ کیا وہاں بھی کوی سمیلن اور مُشاعرے ہوتے ہیں؟

مرزا صاحب: ہاں آل عالمیں مشاعرے اور کوی سمیلن ہوتے ہیں جن میں بہاری، تُلسی داس، کالی داس اور ہندی اُردو کے بڑے بڑے شاعر اور کوی شریک ہوتے ہیں اور انہیں بڑی داد ملتی ہے مگر جو زبان آزادی کے بعد سے آپ کے یہاں چلی ہے اس کا سمجھنے والا وہاں کوئی نہیں ہے — یہ کون سی زبان ہے؟

ایک آواز: یہ ایسی زبان ہے جسے خود اُس کا بولنے والا بھی نہیں سمجھتا۔

مرزا صاحب: اس زبان کا کیا نام ہے؟

دوسرا لڑکا: اس کا نام ہے ہندی کی چندی — یہ اپنی کہتی ہے دوسروں کی نہیں سُنتی۔

مرزا صاحب: یہ زبان کس نے ایجاد کی ہے؟

ایک آواز: یہ ہمارے یہاں بعض خود غرض سیاست دانوں کی بنائی ہوئی زبان ہے جس کے کندھے پر بندوق رکھ کر یہاں کے سیاستداں دوسری زبانوں پر چلاتے ہیں اور زبان کے نام پر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ اِس زبان کے پیچھے آجکل دیس کی ساری زبانیں ڈنڈا لئے پھر رہی ہیں اور مُلکی سیاست اس کا شکار بنی ہوئی ہے۔ یہ مجبوروں اور کمزوروں پر لادنے والی زبان ہے۔

دوسری آواز: یہ راجہ پورس کی ہتھنی ہے جو اپنی ہی فوج کو مار رہی ہے۔ اور جس زبان سے یہ نکلی ہے اُسی کو کھائے جا رہی ہے۔

تیسری آواز: یہ ملک کی آزادی کو کھانے کے لئے بنی ہے۔

چوتھی آواز: یہ ہمارے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کروانے کیلئے بنی ہے

پانچویں آواز: اس کے ذریعہ میں ہر چوپائے کی زبان سمجھ سکتے ہیں

چھٹی آواز: یہ صرف سننے والی زبان ہے اسکا سمجھنے سے کوئی تعلق نہیں

ساتویں آواز: یہ ہمارے دیس کی میر جعفر ہے۔

ایک دور کی آواز: اس سے معدے کی اصلاح ہوتی ہے۔

مرزا صاحب: اچھا بھائی اب میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی سوال کرتے کرتے تھک چکے ہوں گے اور میں بھی آپ کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے پست ہو گیا ہوں۔ اب جو کچھ مجھ سے پوچھنا ہو کل پوچھئے گا۔ اب میں غالب اکیڈمی کے دفتر جا کر تھوڑا ما ءاللحم پی کر سو جاؤں گا۔ خدا حافظ۔

سب لڑکے تالیاں بجا کر مرزا صاحب کو رخصت کرتے ہیں۔!!

تیسرا دِن

مرزا صاحب کے آنے میں دیر ہے۔ سارے صوبوں کے لڑکے جمع ہیں اور ملک کے مختلف صوبوں میں طلبہ اور اساتذہ کی جو اسٹرائک چل رہی ہے اس پر آپس میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ آج اُن طلبہ میں ملک میں ہونیوالی اسٹرائکوں کے لیڈر بھی شامل ہو گئے ہیں، ایک لڑکا : آج تو بنارس یونیورسٹی میں اپن کے ساتھیوں نے جو کام دکھایا ہے اُس سے تو پولیس والوں کو دِن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے ؟

دوسرا : ابے! سُنا ہے کہ کسی نے وائس چانسلر سالے کو ٹھونک دیا اور اس کے بنگلہ میں آگ لگا دی۔

تیسرا : جب راجدھانی میں ہم لوگوں نے اسٹرائک کی ہے تو سالے کئی یونیورسٹی کے اُستادوں کے اتنے جھانپڑ مارے ہیں کہ سب سالوں کے گلے کئی دِن تک سُوجے رہے۔

چوتھا : ابے تُجھے اپنے اُستادوں کو پیٹتے شرم نہیں آئی۔ استادوں کا رتبہ باپ کے برابر ہوتا ہے۔

پانچواں : ابے جا بے صحیح باپ کی اولاد۔ سُن لڑائی اور پریم میں ہر بات جائز ہے۔ اس میں باپ بیٹے کی نہیں چلتی۔ کبھی کبھی بیٹے کو باپ بھی بننا پڑتا ہے۔

ایک لڑکا : یہ سالہ مسلم یونیورسٹی کا پڑھا کچھ پینڈیا معلوم ہوتا ہے ؟

چھٹا : تین سرکاری بسوں کو تو میں نے اور میرے دو ساتھیوں نے پٹرول چھڑک کر پھونک دیا اور سالے کنڈکٹروں کو تو وہ گدھا مار ماری ہے کہ سالوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔ جب پروائی چلے گی تب مزے لیں گے۔

ساتواں لڑکا : مگر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ والے سب بزدلے نکلے سالوں نے کچھ نہیں کیا صرف وائس چانسلر کو مار کر رہ گئے۔

کئی لڑکے : وہاں کے لونڈے سب سالے بزدل ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی کلچر لیکر چلے ہیں۔ ابے آزادی کے زمانہ میں ۔۔۔ ہم کلچر لیکر چاٹیں گے ؟

دوسرا لڑکا : مگر سالے بڑے حرامی نکلے یہ علی گڈھ والے۔ جب ہم لوگوں نے بنارس یونیورسٹی میں آگ لگائی اور پولیس نے لاٹھی چارج اور گولی چلائی تو سالوں نے اپنے یہاں اسٹرائک تک نہ کی۔ ان کی ۔۔۔۔۔۔ ؟

چوتھا : اور جب دلی یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی میں بلوہ ہوا تھا تب بھی ان سالوں نے ہمارا کوئی ساتھ نہیں دیا اور شریف بنے رہے بزدلے کہیں کے۔ صرف ایک وائس چانسلر کو ٹھوک کر رہ گئے۔ اور پھر معافی بھی مانگ لی۔ ہم نے کتنے وائس چانسلروں کو ٹھونک پیٹ کر رکھ دیا اور سرکاری عمارتوں اور بسوں میں آگ لگا دی۔

ایک لڑکا : ابے تیرا کھونٹا مضبوط تھا اس لئے تو بچ گیا اُن کی جگہ اگر تو ہوتا تو معلوم ہوتا۔

پانچواں : آزادی اسے کہتے ہیں یا اُسے کہ صرف ایک وائس چانسلر کو مار کر رہ گئے اور اس کے بعد سالوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔

کئی لڑکے : ابے یہ ہم لوگوں کا ممبر ہے کہ ابھی تک ، سالوں سے اُٹھا بیٹھی

کرائی جا رہی ہے اور قصور معاف ہونے نہیں آتا۔ اب جو بل پارلیمنٹ میں آ رہا ہے
اُس میں علیگڑھ میں جتنے کالج ہیں اُن سب کے امتحانات وہاں کی یونیورسٹی میں ہوا کرینگے
اب سالوں کو پتہ چلے گا۔ ہم سے کہتے ہیں کہ استاد کی عزّت کرو۔ جبکہ یو۔ پی میں خود
اُستادوں کی جیلوں میں جوتے کاری ہو رہی ہے۔ اور ان کی مہلاؤں تک کی ڈنڈے
سے خبر لی جا رہی ہے۔ وہ زمانہ لد گیا جب استادوں کی عزّت ہوتی تھی اب تو
پہلے استاد ہماری عزّت کریں تب اُن کی عزّت ہو گی۔ آزادی ملی ہے کوئی مذاق
تھوڑے ہوا ہے کہ اب بھی ہم استادوں کی عزّت کریں۔ جو کچھ مُسلم یونیورسٹی میں
ہو رہا ہے وہ ذرا لکھنؤ، بنارس، الہ آباد یا ناگپور یا پٹنہ یونیورسٹی میں کرکے دیکھیں
پھر دیکھئے ہم کیسا تنگنی کا ناچ نچاتے ہیں۔ اب تو جو ہم چاہیں گے وہ ہو گا۔

ایک لڑکا: ابے اگر تو کسی لونڈیا سے عشق کرے گا تو کیا وہ تیری بات
مان لیں گے؟

وہی لڑکا: ابے! ماننا پڑے گا۔ اگر سالوں کو ووٹ لینا ہے تو جو کچھ ہم
کہیں گے وہ کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہم کسی ایک سالے کو تو ممبر بننے نہیں دیں گے۔
دیکھو لکھنؤ یونیورسٹی میں جس نے توڑ پھوڑ میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا اور لڑکوں
سے بلوہ کرایا تھا اُسے یو۔ پی اسمبلی کا ٹکٹ ملا یا نہیں۔ اور وہ جو اسٹرائک میں
پیش پیش تھے اور جنہوں نے پولیس کو مارا تھا ان کا منہ بھر اگیا یا نہیں؟ اور آج
وہ بڑے بڑے فارم کھولے مزے کر رہے ہیں کہ نہیں پھر ہم ان سالوں سے کون سا
پتلا موتتے ہیں۔

دوسرا لڑکا: ابے دبنے والے کی بات یہ دیکھ کہ یہ جو درمیانی مدّت کے الکشن
چل رہے ہیں اُس میں ایک پارٹی کوئی نئی بنی ہے۔ اس نے الکشن میں اپنا چُناؤ
نشان چاند تارے رکھا تھا مگر اُسے نہیں دیا گیا۔

تیسرا : کیوں اُنہیں یہ نشان کیوں نہیں دیا گیا ؟

چوتھا : ابے اس وجہ سے نہیں دیا گیا کہ کہیں سالے چاند تاروں کا نشان بناتے بناتے چاند تاروں پر قبضہ نہ کرلیں اور یہ پر گدا در ریا چلائے گھنٹے بجاتے رہ جائیں۔

پانچواں لڑکا : ابے آج جب مرزا صاحب آئیں تو اُن سے یہی باتیں چھیڑی جائیں بڑی چکلس رہے گی۔

ایک لڑکا : ابے بہت دیر ہوگئی آج معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب ٹال گئے۔

دوسرا : بوڑھے آدمی ہیں کل سوالوں کا جواب دیتے دیتے ان کے دیوالے بھی تو کھسک گئے تھے۔

تیسرا : ابے کہیں مَر وَر تو نہیں گئے ؟ یا ایسا تو نہیں ہوا کہ جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کی یادگار کا جو سنگ بنیاد رکھا گیا تھا اس پر ٹھیلہ چل گیا تو وہ یہ سوچکر کھسک گئے ہوں کہ ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے اور برسی ورسی سب ڈھونگ ہے۔

چوتھا : مگر ابھی کل تو پیدا ہوئے تھے۔ کے آمای کے پیر مشدی۔

پانچواں : ابے بوڑھے تو پیدا ہی ہوئے تھے۔ پھر ان کے لئے مرجانا کون سی بڑی بات ہے۔

چھٹا : مگر سالے سائنسدانوں کا کرشمہ دیکھو کہ جتنی عمر میں مرے تھے اتنی ہی عمر میں ٹھیکم ٹھیک ان کو پھر پیدا کروا دیا۔

ساتواں : دلی میں جو ایکسی ڈنٹ ہوتے ہیں ان میں دیکھا ہوتا کہ ایسا تو نہیں کہ یہاں سے نظام الدین سے آتے کسی ٹرک کے نیچے آ گئے ہوں۔

پہلا : کہاں کی اُڑا رہا ہے میرے یار — وہ دیکھ تیرے باوا جان آ رہے ہیں۔

دوسرا : ابے آج تو کل سے بھی زیادہ بوڑھے لگ رہے ہیں ۔

تیسرا : بڑے دام لگے ہوں گے اِن کے دوبارہ پیدا کرانے میں ۔ جو چندہ ان کے نام سے نام نہاد کانگریسیوں نے الکشن لڑنے کے لئے وصول کیا ہے اُس کا آدھا تو روس کے سائنسدانوں نے لیا ہوگا ۔

چوتھا لڑکا : ابے سائنسدانوں سے بھی قرضے پر کام چلایا گیا ہوگا ۔

(مرزا صاحب درجہ میں پہنچ جاتے ہیں اور ہر طرف سے تالیاں پٹنے لگتی ہیں)

مرزا صاحب : میاں صاحبزادو ! مجھ بوڑھے پر تم کو تالیاں پیٹنا تھا تو مجھے بلایا ہی کیوں تھا ۔

ایک لڑکا : مرزا صاحب ! ہم کوئی مذاق تھوڑے کر رہے ہیں ۔ آپ کا تالیوں سے سواگت کر رہے ہیں ۔

مرزا صاحب : اچھا کہو تمہارے ماں باپ نے ہمارے دوبارہ پیدا ہونے پر کچھ خوشی ظاہر کی ؟

ایک لڑکا : یہ سب لوگ تو باہر کے آئے ہوئے ہیں ۔ ہم پانچ طلبہ یہاں کے ہیں ۔ ہم نے جب آپ کے دوبارہ پیدا ہونے کا واقعہ انہیں بتایا تو انہیں یقین ہی نہ آیا ۔

دوسرا لڑکا : میری اماں نے کہا کہ آج ذرا مرزا صاحب کو چھو کر دیکھنا کہ اصلی ہیں بھی یا انہیں نقلی بنا کر سائنسدانوں نے لا کھڑا کیا ہے ۔

مرزا صاحب : ارے بھائی میں بالکل ہی اصلی ہوں ۔ میری لال قلعہ میں جو تصویر ہے اُس سے ملا لو ۔

ایک لڑکا : مگر مرزا صاحب اب تک اردو میں آپ پر اتنی کتابیں لکھی

جا چکی ہیں کہ شاید ہی کسی زبان کے ایک شاعر پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہوں۔

مرزا صاحب: ہاں بمبئی میں نے وہ ببلوگرافی دیکھی ہے جو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے دلّی یونیورسٹی میں اپنی نگرانی میں تیار کرائی ہے۔ اس میں مجھ پر اتنی کتابیں اور مضامین لکھنے والوں کے نام درج ہیں کہ اگر اتنی تعداد میں اینٹیں لیکر میرا مقبرہ تعمیر کیا جائے تو شاید دلّی کا قطب مینار اس کے سامنے بچہ معلوم ہو۔ کاش ایسا ہوتا کہ پاکستان میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے جو اُردو یونیورسٹی تیار ہو رہی ہے اسی طرح کا میرا مقبرہ ہندوستان میں تیار ہوتا۔

ایک لڑکا: وہاں کس طرح کی یونیورسٹی تیار کی جا رہی ہے؟

مرزا صاحب: وہ یونیورسٹی عوام کے چندہ سے بن رہی ہے اور اس میں یہ جدّت رکھی گئی ہے کہ جس جس نے اس کے لئے چندہ دیا ہے اس کا نام ایک ایک اینٹ پر لکھ دیا گیا ہے اور ان تمام اینٹوں سے یونیورسٹی تعمیر ہونے جا رہی ہے۔

ایک لڑکا: مگر یہاں جو چندہ جمع ہوتا ہے اس میں کچھ تو یارانِ طریقت اپنے الکشن پر خرچ کر رہے ہیں اور جو بچ رہا ہے اس کا مقبرہ اپنی اپنی جیبوں میں بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابھی تک چند جیبوں کی اطلاع تو مجھے ہے جہاں آپ کے مقبرہ کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ اصلی کام تو بچ بچ کے چھپے ہوئے ردّی والے حکیم جی کر رہے ہیں۔

مرزا صاحب: حیرت ہے۔ کیا مُردے کے نام پر چندہ جمع کر کے یہاں لوگ کھا جاتے ہیں؟

دوسرا لڑکا: ارے صاحب یہاں بس نہیں جو پورے مُردے کو کھالیں۔ آپ چندہ کو لیکر چلے ہیں۔ مرزا صاحب! ہم کو درجۂ نو آبادیات نہیں ملا ہے پورن سوراج ملا ہے اس لئے ہمارے یہاں ان چیزوں کو بھی پوری آزادی دیدی گئی جن پر آزاد ملکوں میں پابندیاں لگی ہوتی ہیں مثلاً رشوت ستانی۔ بے ایمانی، لوٹ مار، ذخیرہ

اندوزی، فسادات وغیرہ وغیرہ۔ یوں آزاد ہونے کو تو دُنیا میں سب ہی مُلک آزاد ہیں
مگر جو ذائقہ ہماری آزادی میں ہے وہ کسی ملک کی آزادی میں نہیں ہے اور اس ذائقہ
کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ ہمارے دیس کا ایک معمولی نیتا جس کے پاس
آج کچھ نہیں ہے اگر آپ اُسے کُل پانچ سال کیا صرف ایک ہی سال کے لئے کسی
کارپوریشن یا میونسپل بورڈ کا ممبر بنا دیجئے تو اُس کے جسم پر سال بھر کے اندر
اتنی موٹی کھال چڑھ جائے گی کہ اس کی کھال کے سامنے مگرمچھ یا گینڈے کی کھال
بے حقیقت نظر آئے گی۔ اور وہ اتنا چھوڑ کر مرے گا کہ اس کی دو تین پشتوں کے لئے
کافی ہو گا۔ اور قبلہ یہ آپ کی صد سالہ برسی اسی جیا ؤ کی ایک کڑی ہی تو ہے۔

ایک لڑکا: ارے بھائی ان باتوں پر مرزا صاحب کا وقت ضائع نہ کرو۔ اب
مرزا صاحب سے یہ پوچھو کہ دنیا میں دوبارہ آکر انہوں نے اپنے زمانے کے اور اس زمانہ
کے بالا ب ماحول میں کیا فرق محسوس کیا۔؟

ایک لڑکا: (اپنے بغل والے لڑکے سے) اب چند گھنٹوں میں تو مرزا صاحب
لکھ پتی ہو جائیں گے۔

مرزا صاحب: تو جوں ہی یہاں کے لکچر ختم ہوں آپ لوگ مجھے اپنے ہمراہ
دورہ پر لے چلیں۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ اپنا روپیہ اپنے پاس رکھیئے گا نہیں تو آپ نے
اگر اُسے کسی بنک وینک میں جمع کرایا تو۔ اوّل تو بنک والے لاکھوں کروڑوں روپیہ
دیکھ کر اپنے بنک کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیں گے اور سارا روپیہ لاوارثوں کا
مال سمجھ کر مار دیں گے اور دوسری طرف آپ پر نئی نئی وضع کے ٹیکس لگائے جائیں
گے اور ڈیتھ ٹیکس کے نام سے دو تہائی رقم سے زیادہ آپ کی بحق سرکار ضبط ہو
جائے گی۔

ایک لڑکا : مرزا صاحب ! اکبر آباد جا کر الکشن شروع ہونے سے پہلے آپ اگر کسی حلقہ کی فہرست میں اپنا نام شامل کرالیں تو پھر تو مزہ آجائے ۔ اُس حلقہ سے کھڑے ہونے والے امیدوار تو آپ پر اس طرح گریں گے جیسے شہد پہ مکھیاں گرتی ہیں ۔ کیونکہ جب آپ اُس حلقہ سے اپنا ووٹ ڈالنے جائیں گے تو اس کے سارے کے سارے ووٹر محض آپ کے احترام میں اُس امیدوار کو ووٹ دیدیں گے جس کی طرف سے آپ اپنا ووٹ ڈالیں گے ۔

تیسرا لڑکا : مگر مرزا صاحب آپ تو مرچکے ہیں آپ کا ووٹ فہرست میں شامل کیسے ہو سکتا ہے ؟

چوتھا لڑکا : ابے کہاں کی باتیں اُڑا رہا ہے ۔ کون سا مُردہ ووٹ ہے جو آجکل الکشنوں میں گذر نہیں جاتا ۔

پانچواں : مگر مرزا صاحب آپ تو صرف دو مہینے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں لہٰذا آپ عمر کے اعتبار سے تو ابھی بالکل ہی نابالغ ہیں ۔ بلکہ دودھ پیتے ہیں پھر کیا صورت کی جائے ۔ ؟

چھٹا : ابے اس دور میں کیا نہیں ہو سکتا ؟ اکبر آباد کے کسی نام نہاد کانگریسی نیتا کے ذریعہ جو پارلیمنٹ کا ممبر ہو کیا کچھ نہیں ہو سکتا ۔

مرزا صاحب : تو پھر یہی طے رہا کہ یہاں کے لکچر ختم ہونے کے بعد ہی آپ لوگوں کو لیکر اکبر آباد روانہ ہو جائیں ۔

(چھوٹے لڑکے آپس میں باتیں کرتے ہوئے ۔ ابے مرزا صاحب کو باتوں میں لگائے رکھ آج آم دام لائے ہیں بہت خوش ہیں ان سے صرف آموں ہی کی باتیں کر)

ایک چھوٹا لڑکا : مرزا صاحب ، آم جیتلی قبر پہ دُھنا حلوائی کے برابر جو دوکان

ہے وہاں سے لیا کیجیئے بڑے سستے اور بڑے میٹھے ہوتے ہیں - پرسوں ہمارے ابا اماں کے لئے دو سیر لائے تھے دو دو ہم کو بھی دیئے تھے - بڑے مزے کے تھے -

دوسرا لڑکا: (جو اس سے عمر میں ذرا بڑا ہے - چپکے چپکے) ابے - کیا اماں ابا لگائے ہے ہر وقت مرزا صاحب سے اماں اماں کرتا رہتا ہے - ابے کہیں مرزا صاحب تیری اماں کو گھر نہ بٹھا لیں -

مرزا صاحب: خیر وہ آئے ہوں گے مگر اب باتیں بند کرو اور جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو -

ایک لڑکا: (دوسرے لڑکے سے چپکے سے) بڑے سیانے ہیں مرزا صاحب -

مرزا صاحب: اچھا یہ بتاؤ کہ آجکل تمہارے یہاں آٹا کیا بھاؤ ہے ؟

دوسرا لڑکا: معلوم نہیں ہمارے ابا تو ہمیشہ قرض لاتے ہیں -

مرزا صاحب: اچھا جس کے ابا قرض نہ لاتے ہوں وہ بتائے -

سب چھوٹے بچے: ہم سب کے ابا قرض لاتے ہیں -

مرزا صاحب: اچھا بڑے لڑکوں میں سے کوئی آٹے کا بھاؤ بتا سکتا ہے ؟

ایک لڑکا: روپے کا چودہ اور سولہ چھٹانک -

مرزا صاحب: اور گھی ؟

دوسرا لڑکا: چھ روپے سیر -

تیسرا لڑکا: اور تیل بھی تقریباً اسی بھاؤ ہے -

چوتھا: اور شکر تو پانچ روپے سیر ہے -

مرزا صاحب: اور اب سے دس سال پہلے یہ چیزیں کس بھاؤ بکتی تھیں ؟

پانچواں لڑکا: اس سے پہلے ان چیزوں کا بھاؤ اب سے مقابلتاً بہت کم تھا -

چھٹا لڑکا: جب سے ہم کو آزادی ملی ہے اُس وقت سے صرف آزادی کا بھاؤ جتنا جتنا گرتا گیا اتنا اتنا ضروریات زندگی کا بھاؤ بڑھتا گیا۔

مرزا صاحب: بیٹا! میرے زمانے میں تو گھی چھ آنے سیر اور آٹھ آنے سیر بکتا تھا۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب! پانی بکتا ہوگا۔ اب تو اسٹیشنوں پر پانچ پیسے کا ایک گلاس پانی ملتا ہے۔

تیسرا لڑکا: اور گیہوں کس بھاؤ تھا؟

مرزا صاحب: گیہوں ہمارے زمانے میں ایک روپیہ کا چالیس سیر بکتا تھا۔ اور جب قحط پڑتا تھا تو بیس سیر بکنے لگتا تھا۔

ایک چھوٹا لڑکا: (دوسرے لڑکے سے چپکے سے) مرزا صاحب بڑے جھوٹے ہیں ابے کہیں چالیس سیر کا غلہ بک سکتا ہے۔ آج کل مٹی بھی تو اس بھاؤ نہیں ملتی۔ ابھی پرسوں اماں نے سر دھونے کے لئے ایک گدھا مٹی ڈلوائی تھی۔ اُس کے چودہ آنے دینا پڑے۔

دوسرا لڑکا: اور مرزا صاحب دودھ کس بھاؤ بکتا تھا۔؟

مرزا صاحب: خالص دودھ ایک آنے سیر تھا اور پانی ملا دودھ تو بکتا ہی نہیں تھا۔

ایک چھوٹا لڑکا: (بغل والے لڑکے سے) ابے! مرزا صاحب جتنی عمر کے ہیں اتنا ہی لمبا جھوٹ بول رہے ہیں۔

پانچواں لڑکا: مرزا صاحب آپ کوئی دوسری باتیں کیجئے آٹے دال کا رونا تو ہم دن بھر ہی رویا کرتے ہیں۔

مرزا صاحب: ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ اب سے دس سال پہلے ہمارے

ایک وزیر جن کا نام رفیع احمد قدوائی تھا اور علی گڈھ کے پڑھے ہوئے تھے انہوں نے ان سب چیزوں کا بھاؤ کم کر دیا تھا۔

ایک لڑکا: کیا وہ واقعی وزیر تھے؟

مرزا صاحب: ہاں وہ تمہاری مرکزی حکومت میں وزیر خوراک تھے۔

تیسرا لڑکا: تو وہ وزارت سے نکال دیئے گئے ہوں گے۔ کیونکہ اب تو وہی وزیر رکھا جاتا ہے جو ساری چیزوں کے بھاؤ بڑھائے۔

ساتواں لڑکا: کیا وہ اسی علیگڈھ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے تھے جسے اب قومی یونیورسٹی بنا کر اُس کا نام بدلا جا رہا ہے؟

مرزا صاحب: ہاں یہ بات میں نے بھی یہاں آ کر سُنی ہے اور نہ جانے کون کہتا تھا۔ کہ کوئی بل پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا ہے۔ جس کے پاس ہونے کے بعد اس کی شکل) عام یونیورسٹیوں جیسی ہو جائے گی۔

ایک لڑکا: کیا رفیع احمد قدوائی کوئی شاعر تھے؟

مرزا صاحب: نہیں۔ وہ آپ کے مُلک کے ایک بہت بڑے سیاستدان تھے جو بیچارے مر گئے مگر آجتک لوگ اُن کو یاد کرتے ہیں۔

ایک لڑکا: اُن کو زہر دے دیا گیا ہو گا۔ کیونکہ وہ جنتا کی بھلائی کے لئے کام کرتے تھے اور اُن کے جیسے لوگوں کو آجکل زندہ رہنے نہیں دیا جاتا۔

پانچواں لڑکا: مرزا صاحب! وہ ضرور اچھے آدمی رہے ہوں گے کیونکہ جتنے اچھے آدمی تھے وہ سب ایک ایک کر کے مر گئے اور جو زندہ ہیں اُن کو بھی بُرا سمجھا جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی سے بیزار ہیں۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب۔ کیا اب وہ دوبارہ زندہ کیے جا سکتے ہیں؟ اگر وہ زندہ ہو جائیں تو شاید وہ ساری چیزوں کے بھاؤ کم کرا دیں گے — آپ

دو مہینے بعد جب واپس جائیے گا تو اُن کو ضرور بھیج دیجئے گا کیونکہ ہم نے بہت دِنوں سے گیہوں کی روٹی نہیں کھائی ہے۔ ابّا روز دونوں وقت چنے بھُنوا بھُنوا کر دو دو مُٹھی ہمیں کھلواتے ہیں جس سے ہمارے پیٹ میں بڑا درد ہوتا اور پیٹ بھی نہیں بھرتا ہے۔ وہ آجائیں گے تو ہم کو دونوں وقت گیہوں کی روٹی مِلنے لگے گی۔

ایک چھوٹا بچہ: (بغل والے سے کہنی مار کر) ارے کیا ابّا ابا لگائے ہے ابا نے یہ نہیں کیا ابا نے وہ نہیں کیا۔ تیرے ابا دِن بھر کیا کرتے ہیں؟

وہی لڑکا: ہمارے ابّا دن بھر خود فاقے کرتے ہیں۔ اور جب ہم پیسے مانگتے ہیں تو ہم کو مارنے دوڑتے ہیں۔

ایک لڑکا: اے چُپ رہ، وہ دیکھ مرزا صاحب ہم لوگوں کو گھُور رہے ہیں۔۔۔

دوسرا لڑکا: اے مرزا صاحب سے پوچھو کہ مرتے وقت اُن کے کِتنے لڑکے تھے؟

پہلا لڑکا: مرزا صاحب! یہ پوچھتے ہیں کہ آپ کتنے لڑکے چھوڑ کر مَرے تھے؟

مرزا صاحب: بیٹا۔ میرے کوئی لڑکا نہیں تھا۔

ایک بڑا لڑکا: تو کیا آپ نے بھی نس بندی کرائی تھی؟

مرزا صاحب: میرے زمانہ میں اس قِسم کی بیہودہ حرکتیں نہیں ہوتی تھیں۔۔۔ اور نہ لڑکے اِس قِسم کے بیہودہ سوالات اپنے بزرگوں سے کرتے تھے۔

دوسرا لڑکا: اب تو نس بندی کے مُشاعرے ہوتے ہیں اور شاعر لوگ نس بندی پر بڑی بڑی نظمیں لِکھتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے نس بندی کی

کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ اُن میں عورتیں مرد سب شریک ہوتے ہیں اور نس بندی کی تعریف میں جو شاعر سب سے اچھی نظم لکھتا ہے اُسے انعام ملتا ہے۔ نس بندی پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

تیسرا لڑکا: اور اب تو نس بندی کے سبق تک ہمارے اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ریڈیو سے تقریریں ہوتی ہیں۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب! آپ کے آنے سے چھ سات سال پہلے ایک وزیر صحت مسز سوشیلا نائر تھیں وہ ریڈیو سے نس بندی کے اُتار چڑھاؤ بتاتی تھیں اور لوپ کی قامت، اُس کی فٹنگ، اور اُس کے پریشر پر اِس طرح روشنی ڈالتی تھیں کہ اُس کے استعمال کی تصویر ہُو بہو آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی تھی اور اُسے سُن کر بڑی بڑی نائکائیں شرم و حیا سے گردن جھکا لیتی تھیں۔

مرزا صاحب: لاحول ولا قوۃ۔ بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔ یہ باتیں تمہاری عمر والوں کو زیب نہیں دیتیں۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب کیا یہ بھی کوئی گالی کی بات ہے؟ یہ تو ہمارے یہاں شادی شدہ اور کنواری لڑکیوں کو بتایا جاتا ہے۔

مرزا صاحب: شریفوں کے بچے گالیاں نہیں بکتے۔ ہمارے زمانہ میں چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی ایسی گالیاں نہیں بکتی تھیں۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب! آپ خلاف قانون بات نہ کیجیے نہیں تو پکڑے جائیے گا۔

مرزا صاحب: اِس میں خلاف قانون کون سی بات ہے؟

تیسرا لڑکا: آپ کو معلوم نہیں کہ چمار کو چمار کہنا اب قانوناً جرم ہے۔

دوسرا لڑکا: اب انہیں اچھوت اور ہریجن کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ابھی

کچھ دن ہوئے جب پارلیمنٹ میں کسی ممبر کے منہ سے چمار کا لفظ نکل گیا تھا تو اُن کو اپنے الفاظ واپس لینا پڑے تھے اور اُن کی بڑی لے دے ہوئی تھی۔ آپ کے زمانہ میں سُنا ہے کہ ہریجنوں کے لڑکے گلی ڈنڈا اور کبڈیاں کھیلتے تھے اور شرفا ان کھیلوں کو بہت ذلیل سمجھتے تھے مگر اب گذشتہ بیس سال سے جب سے ہمارا ملک آزاد ہوا ہے۔ ان کھیلوں کو قومی کھیل قرار دیا گیا ہے۔

مرزا صاحب: میرے زمانہ میں تو شرفا، گنجفہ، شطرنج اور چوسر وغیرہ قسم کے کھیل کھیلتے تھے۔

ایک آواز: مرزا صاحب جب سے شرافت کی جگہ آزادی نے لے لی ہے اُس وقت سے ہمارے ملک میں ہر شخص اپنے آپ کو ہر معاملہ میں آزاد سمجھتا ہے اور اب شرافت اور رذالت دونوں کو برابر کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور اب سب چیزیں ایک سطح پر آ گئی ہیں۔

مرزا صاحب: مساوات تو بہت اچھی چیز ہے۔ مگر ایسی مساوات تو آج میں پہلی بار سُن رہا ہوں۔

دوسری آواز: مرزا صاحب! اور اس کے لئے قانون بھی بن گئے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر شخص ہر معاملہ میں اپنے کو آزاد سمجھتا ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو قانون کی خلاف ورزی کرنے میں بھی آزاد گردانتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر بُرائی کو بھی لوگوں نے آزادی کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے سماج میں برائیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

مرزا صاحب: تمہارے منہ سے یہ باتیں سُن کر میں حیران ہوں میرے زمانہ میں تو تمہاری عمر کے لڑکے بزرگوں کے سامنے بولتے ڈرتے تھے۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب ہمارا ملک اب آپ کے زمانہ سے ہزاروں کوس

وہ رنکل آیا ہے اور اسی لئے ساری دُنیا میں بڑا نام پیدا کر رہا ہے۔

مرزا صاحب: مگر اس پائے کی آزادی شاید جانور بھی اپنے بچوں کو نہ دیتے ہوں گے۔

چوتھا لڑکا: اب مرزا صاحب آپ پر اور آپ کے کلام پر صد سالہ برسی کے سلسلہ میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اُسے اگر آپ سُن لیں تو شاید دانتوں میں اُنگلیاں دبالیں۔

مرزا صاحب: میرے بارے میں کس قسم کی تحقیق ہو رہی ہے؟

ایک لڑکا: پہلی تحقیق تو یہ ہو رہی ہے کہ آپ کے اور بیوی کے تعلقات جیسا کہ آپ کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کچھ زیادہ اچھے نہ تھے پھر آپ نے اپنے خطوط میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے سات آٹھ بچے ہوئے لہذا تعلقات خراب ہونے کی صورت میں بچوں کی پیدائش کیا معنی؟ چنانچہ ہمارے محققین ان بچوں کی پیدائش کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ دوسرے محققین اس بات کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں کہ آپ جو یخنی سویرے شام پیتے تھے وہ کس نسل کے بکرے یا بکری کی ہوتی تھی اور ایسی بکریاں اب کیوں نہیں پیدا ہوتیں؟ اس سلسلہ میں محققین کا ایک طبقہ اس کھوج میں لگا ہوا ہے کہ اُسے اُس بزِ قصاب کا نام معلوم ہو جائے جس کے یہاں سے آپ کے لئے گوشت آتا تھا اُس کی دوکان کہاں تھی اور وہ بکریاں کہاں سے خریدتا تھا۔

مرزا صاحب: حد ہو گئی۔

دوسرا لڑکا: ابھی تو یہ معمولی تحقیق تھی جسے سُن کر آپ حیران ہیں اس کے علاوہ جو تحقیق ہو رہی ہے اُس کو سُن کر تو شاید آپ دنگ ہو جائیں گے۔

مرزا صاحب: اس سے فائدہ اور اس کا ادب سے کیا تعلق ہے؟

تیسرا لڑکا: صاحب ہمارے مُلک میں موجودہ آزادی کے تحت اگر ایسی تحقیق

نہ کی جائے تو ہماری آزادی اور دوسرے ملک کی آزادی میں پھر فرق ہی کیا رہا ہے۔

چوتھا لڑکا: آپ کی ذات پر تحقیق کرنے والوں میں ایک گروہ اس تحقیق میں لگا ہوا ہے کہ آپ کو جس کوتوال شہر نے جوا کھیلنے کے الزام میں جیل بھیجا تھا وہ جیل کہاں واقع تھی۔ اُس جیل میں کتنے قیدیوں کی گنجائش تھی جس بارک میں آپ کو رکھا گیا تھا وہ کے نمبر کی بارک تھی۔ اس میں کتنی چارپائیاں بچھ سکتی تھیں۔ وہاں پہنچنے پر کس قسم کی پابندیاں آپ پر لگائی گئی تھیں۔ دوست احباب کے علاوہ آپ کی بیوی آپ سے مِل سکتی تھیں یا نہیں۔ کون کون لوگ آپ سے جیل میں ملنے آتے تھے۔ اُس کوتوال شہر کی موت کس مرض میں واقع ہوئی، مرتے وقت اس کا مُنہ کیسا تھا؟ اس کے خاندان کا کوئی فرد زندہ ہے یا نہیں۔ جیل میں کتنے پھاٹک اور کتنے ملازمین تھے۔ آپ کو کس قسم کی غذائیں فراہم کی جاتی تھیں۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ کون تھا اُس سے آپ کے تعلقات کیسے تھے۔ آپ کو جیل میں شراب ملتی تھی یا نہیں۔ کھانا اگر گھر سے جاتا تھا تو کلو نوکر لیکر جاتا تھا یا ڈومنی۔ ڈومنی کے ماں باپ کا کیا نام تھا۔ ڈومنی آپ کی جُدائی میں دن رات کیسے گذارتی تھی۔

مرزا صاحب: ارے بھائی یہ سب میرے ساتھ کیا مذاق ہو رہا ہے۔

پانچواں لڑکا: حضور! اس سے بڑھ کر اس بات کی تحقیق کی جارہی ہے کہ آپ جس کمرہ میں شب کو استراحت فرماتے تھے اُس میں آپ تنہا ہوتے تھے یا آپ کی بیگم صاحبہ بھی استراحت فرماتی تھیں۔ آپ مسہری پر سوتے تھے یا چارپائی پر؟ چارپائی اور مسہری کس وضع قطع کی تھی۔ اگر چارپائی پر سوتے تھے تو اُس چارپائی کی بُنوائی کیا دی جاتی تھی اس کے بان کہاں سے اور کس بھاؤ منگواتے تھے۔ اَدوائن ڈھیلی ہونے پر اُسے آپ کا نوکر کَستا تھا یا آپ کی ڈومنی یا بیگم صاحبہ۔ بان جس دکان سے آتے تھے وہ دوکاندار کنوارہ تھا یا شادی شدہ؟

مرزا صاحب: لاحول ولاقوۃ۔

چھٹا لڑکا: اس بات کی بھی تحقیق کی جا رہی ہے کہ آپ جس لوٹے کو آفتابہ کہتے تھے اس کا کیا وزن تھا۔ نوکروں میں قدمچے پر آفتابہ کون رکھتا تھا۔ قدمچے کس وضع قطع کے تھے۔ اُن کا رُخ اُتر دکھن تھا یا پورب پچھم۔ آپ تہبند باندھ کر لیٹرین جاتے تھے یا پجامہ پہن کر۔ پجامے کس درزی سے سلواتے تھے تہبند کہاں سے خریدتے تھے۔ ان سب چیزوں کی قیمت خریدتے وقت یکمشت ادا کر دیتے تھے یا مہینے مہینے حساب ہوتا تھا۔ پنشن بند ہو جانے پر آپ کو کن کن لوگوں سے قرض لینا پڑا؟ قرض دینے والوں میں زیادہ تر ہندو تھے یا مسلمان؟

مرزا صاحب: ارے بھائی یہ ساری باتیں کرید کرید کر کیوں میری عاقبت خراب کی جا رہی ہے؟

ساتواں لڑکا: اور مرزا صاحب سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جو آپ نے لکھا نہیں ہے کہ "جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے" اس کے بارے میں بھی تحقیق کی جا رہی ہے کہ آپ جس کُلھڑ میں شراب پیتے تھے وہ کس کمہار کے یہاں سے خرید کر آتے تھے۔ شراب آپ گھڑی دیکھ کر پیتے تھے جیسا کہ جوش ملیح آبادی پیتے ہیں یا اکدم جام پر جام چڑھانا شروع کر دیتے تھے۔ جیسے کہ آج کل کے مفت خور شاعر جیمس فورڈ کلب کے مشاعروں میں پیتے ہیں۔ شراب پینے کے بعد آپ پر کیا کیفیت طاری ہوتی تھی آپ ہُلّڑ مچاتے تھے یا چپکے دم سادھے اپنے بستر پر پڑے رہتے تھے۔ ایک صاحب نے اس بات کی بھی تحقیق کی ہے کہ جتنے عرصہ تک آپ کی بیوی حاملہ رہتی تھیں آپ اپنا دیوان صاف کیا کرتے تھے جیسا کہ آجکل بہت سے ادبا کرتے ہیں۔ ایک محقق نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس درمیان میں بیوی میکے سے جو خطوط آپ کو لکھتی تھیں آپ اُن کا جواب تک نہ دیتے تھے۔

مرزا صاحب: صاحب یہ کون صاحب ہیں جو میری اس قسم کی گھریلو باتیں منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں؟

دوسرا لڑکا: مگر مرزا صاحب اس میں حرج ہی کیا ہے؟

مرزا صاحب: حرج ہو یا نہ ہو اس میں میری رسوائی کتنی ہے۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب اگر رسوائی کا خیال اس دور میں کیا جاتا تو آپ کی صد سالہ برسی منا کر آپ کے نام پر چندہ کیوں جمع کیا جاتا۔ اب رسوائی یا شرم و حیا کی باتوں کا تصور ہمارے یہاں ایک دقیانوسی بات سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ ساری کی ساری چیزیں اضافی سمجھی جاتی ہیں۔ آپ جتنی شرم و حیا محسوس کریں گے اُتنے ہی مصائب میں مُبتلا ہوتے چلے جائیں گے۔

مرزا صاحب: اس کے معنی یہ ہیں کہ اب آزادی کے بعد سے وہ قدریں جنم لے رہی ہیں جن کا میرے زمانہ میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ میاں صاحبزادو یہ قدریں تم لوگوں کو مبارک ہوں۔ اب میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں اس لئے اب جن جن لوگوں کو میرے متعلق جو باتیں دریافت کرنا ہوں وہ اُن سے لکھوا کر اپنے ہمراہ لیتے آئیں میں ان کا آپ لوگوں کو زبانی جواب دیدوں گا آپ ان کے گوش گذار کر دیجئے گا۔ اب آپ حضرات مجھے معاف کریں۔ آج ہمدرد دواخانے کے حکیم صاحب کی طرف سے دوپہر کے کھانے پر مجھے مدعو کیا گیا ہے اور وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

سب لڑکے: مرزا صاحب ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں ہم لوگ بھی بھوکے ہیں سویرے صرف معمولی ناشتہ کر کے آئے ہیں۔ مرزا صاحب مُسکراتے ہوئے درجے سے چلے جاتے ہیں۔

چوتھا دن

(درجہ میں بڑا شور ہے۔ آج مرزا صاحب پر جو محققین مرزا صاحب کی صد سالہ برسی کے موقع پر تحقیقاتی کام کر رہے ہیں اُنھوں نے طلبہ کے ذریعہ مرزا صاحب سے بہت سی باتیں دریافت کی ہیں اور وہ سوالات کی صورت میں اُن محققین کی دریافت طلب باتوں کو لکھ کر لائے ہیں۔ اتنے میں دور سے مرزا صاحب، حکیم عبدالحمید صاحب، عتیق صدیقی سکریٹری غالب اکیڈمی، کی معیت میں موٹر پر آتے نظر آتے ہیں۔ موٹر دِلّی یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے ہال کے سامنے رُک جاتی ہے۔ جہاں پھاٹک پر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اُردو دِلّی یونیورسٹی جو مرزا صاحب کا انتظار کر رہے ہیں مرزا صاحب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی: (مرزا صاحب سے ہاتھ ملاتے ہُوئے) حضور میں آپ کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ اور ہال میں طلبہ بھی بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ آج دِلّی یونیورسٹی کے اُردو کے طلبہ بھی آپ سے بہت سی باتیں دریافت کرنے کے لئے ان اُردو داں طلبہ میں شریک ہیں جو مختلف صوبوں سے آئے ہوئے ہیں۔

مرزا صاحب: (حکیم صاحب سے) آپ کی تعریف ؟

حکیم صاحب: آپ خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی ہیں اور آپ کی ذات گرامی پر اب تک جتنے مضامین یا کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان کی ببلوگرافی تیار کرانے میں تقریباً ایک سال سے لگے ہوئے ہیں۔

مرزا صاحب: صاحب آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریختہ گو شعراء میں میں وہ پہلا خوش نصیب شاعر ہوں جس کے مرنے کے بعد اس کی اتنی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ حالانکہ خدائے سخن میر تقی میرؔ علیہ الرحمہ مجھ سے زیادہ اس اعزاز کے مستحق تھے۔

خواجہ صاحب: حضور! میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے بعض ساتھیوں کو بھی آپ کا دیدار کرا دوں جو آپ سے ملنے کے لئے ایک زمانہ سے بے حد مشتاق ہیں۔

مرزا صاحب: ضرور ضرور۔

خواجہ صاحب: (ڈاکٹر محمد حسن سے) آیئے حسن صاحب آپ کو مرزا صاحب سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا لیجئے آپ کی آرزو پوری ہو گئی۔ مرزا صاحب! آپ ڈاکٹر محمد حسن ہیں جنہوں نے آپ کی صد سالہ برسی کے موقع پر آپ کی زندگی کو ایک ڈرامہ کی شکل میں دلی یونیورسٹی کی طرف سے پیش کیا ہے جس پر آپ کو پندرہ سو روپیہ بطور انعام بھی ملا ہے اور آپ کے کلام کے عاشقوں میں ہیں بلکہ اکثر شب میں آپ کو یاد کر کے روتے ہیں جسکے سبب آپکی رفیقۂ حیات آپکے بارے میں سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو گئیں؛

مرزا صاحب: ارے صاحب آپ جیسے صاحب فکر لوگوں کی قدردانی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

ڈاکٹر محمد حسن: (مرزا صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے) آپ کے دیدار کے

لئے تو ہم لوگ ہمیشہ سے آنکھیں بچھائے ہوئے تھے۔ رُوسی سائنسدانوں کا دُنیا والوں پر یہ احسان عظیم ہے۔ جنہوں نے آپ جیسی عظیم ہستی کو اس دُنیا میں دوبارہ زندہ کر کے ایک معجزہ کر دکھایا۔

مرزا صاحب: ہاں صاحب حقیقتاً اسے آپ سائنسدانوں کا... معجزہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ سو برس پہلے کے ایک مرے ہوئے بڈھے کو جس کی ہڈیاں تک قبر میں گل گئی ہوں اُسے جوڑ گانٹھ کے پیدا کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔

ڈاکٹر محمد حسن: ہاں صاحب یہ بات تو ہم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ کبھی ایسی صورت پیدا ہو سکے گی۔ مگر یقین مانئے مرزا صاحب! جب کبھی میں کوئی مضمون آپ کی ذات گرامی یا آپ کی شاعری کے بارے میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ زندگی میں تو آپ سے کاہے کو ملاقات ہونے لگی البتہ میدان حشر میں خواہ کتنی نفسی نفسی کیوں نہ پڑی ہو آپ سے اور میر تقی میر للہ مقامہ سے ضرور ملوں گا۔ سردست ایک سوال آپ سے پوچھنے کی اجازت چاہوں گا اور وہ یہ کہ دوبارہ زندہ ہونے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ اور اس وقت آپ اپنے آپ کیسا محسوس کر رہے تھے؟

مرزا صاحب: میاں۔ مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کیسے زندہ ہو گیا۔ البتہ ہوش و حواس میں آنیکے بعد مجھے ایک سنسناہٹ سی ضرور محسوس ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں بڑی غفلت کی نیند سے اُٹھا ہوں۔ اور جب اپنے گرد و پیش میں نے کچھ گورے چٹے لوگوں کو کھڑا دیکھا تو میں سمجھا کہ شاید نکیرین کو کچھ سوال پوچھنا رہ گئے تھے اس لئے وہ اب دوسرا چولا بدل کر دوبارہ آئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن: تو اس وقت تو آپ اپنے میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتے؟

مرزا صاحب: بالکل نہیں۔ البتہ جس وقت زندہ کیا گیا تھا۔ اُس وقت دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہوئی کہ اگر کہیں سے ایک وہسکی کا پیگ مل جاتا تو یہ جو جسم میں سنسناہٹ ہو رہی ہے کم ہو جاتی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد میں بالکل چاق وچوبند ہو گیا اتنے میں مولانا قاضی سجاد حسین اور حکیم عبدالحمید صاحب اپنی موٹر لیکر پہنچ گئے اور مجھے میری قیام گاہ پرلے آئے۔

ڈاکٹر محمد حسن: تو قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد تو آپ کی وہ خواہش پوری ہو گئی ہو گی؟

مرزا صاحب: جی ہاں۔ پہلے تو حکیم صاحب نے اپنے دواخانہ کا نفیس ماءاللحم پلوایا اُسکے بعد لالا سجاد نے اُس خواہش کی بھی تکمیل کر دی۔ میں حکیم صاحب اور ان کے رفقاء کا بیحد ممنون ہوں اور اُس سے زیادہ پنڈت جواہر لال نہرو کی صاحبزادی اندرا کا ممنون ہوں جو سویرے شام میری خیریت پوچھنے میری قیام گاہ پر آتی رہتی ہیں اور جن کی کوششوں سے میں دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔

ڈاکٹر محمد حسن: آپ سے جب پہلی مرتبہ اندرا گاندھی صاحبہ ملنے آئی ہوں گی تو آپ کو ان کے پہچاننے میں کچھ دشواری ضرور محسوس ہوئی ہو گی؟

مرزا صاحب: نہیں۔ پنڈت نہرو اور ان کے والد موتی لال نہرو عالم برزخ میں میرے پاس تقریباً ہر ہفتے ملنے آتے رہتے تھے بلکہ ایک مرتبہ مجھ سے انہوں نے اپنی صاحبزادی کا غائبانہ تعارف بھی کرا دیا تھا اس لئے جیسے ہی میں نے ان کو دیکھا اپنی بیٹی سمجھ کر گلے لگا لیا۔

خواجہ صاحب: (ڈاکٹر محمد حسن سے) اگر آپ کو کوئی اور بات دریافت کرنا ہو تو جلدی دریافت کر لیجئے تاکہ میں اپنے بقیہ ساتھیوں کو بھی مرزا صاحب سے ملا دوں۔

ڈاکٹر محمد حسن: نہیں آپ ان کو ملائیے اب مزید جو باتیں دریافت کرنا ہیں وہ اوّل تو میں نے اپنے طلبہ کو سوال کی شکل میں لکھ کر دیدی ہیں دوسرے میں پھر دریافت کرلوں گا۔

خواجہ صاحب: ابھی تو مرزا صاحب کا دو مہینے قیام رہے گا۔ اس درمیان میں قیام گاہ پر جاکر آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن: (مرزا صاحب سے مصافحہ کرکے ہاتھ چومتے ہوئے) اچھا تو پھر کسی دن میں خود آپ کی قیام گاہ پر حاضر ہو جاؤں گا۔

مرزا صاحب: ضرور ضرور مگر ذرا پہلے سے ٹیلی فون کر لیجیے گا کیونکہ قیامگاہ پر تقریباً ہر وقت ادبا اور شعرا کا جمگھٹا سا رہتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن: بہت بہتر ہے۔

خواجہ صاحب: (امیر حسن نورانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آئیے نورانی صاحب اپنی دلی تمنا پوری کیجیے۔ بلکہ آپ تو ایک دن کہہ رہے تھے کہ کاش کوئی ایسی صورت ہوتی جو مرزا صاحب کو اس جشن کے موقع پر زندہ کرلیا جاتا اور وہ خود تمام تقریبوں میں شریک ہوتے اللہ نے آپ کی دُعا سُن لی۔

امیر حسن نورانی: (مرزا صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے) یہ واقعہ ہے کہ اگر صدقِ دل سے کوئی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اُسے ضرور قبول کرتا ہے۔ اور پھر آپ تو نور ہی نور ہیں

خواجہ صاحب: (مرزا صاحب سے) آپ امیر حسن نورانی ہیں۔ عربی اور فارسی کے فارغ التحصیل۔ آپ کو میں نے لکھنؤ سے بلوایا ہے۔ اور علمی اور ادبی کاموں سے آپ کو ایک خاص قسم کا لگاؤ ہے۔ آپ نے آپ کے فارسی کلام کی کلیات بڑی تحقیق اور تدقیق سے مرتب کی ہے۔

نورانی صاحب: (فارسی کی کلیات کا ایک نسخہ پیش کرتے ہوئے) حضور!

اسے اس بیچ ان نے ترتیب دیا ہے۔ لہٰذا اب میں چاہوں گا کہ آپ کسی وقت فرصت میں اس پر ایک نظر ڈال لیں اور جو غلطیاں رہ گئی ہوں ان پر پنسل سے نشان بنا دیں تاکہ اس کے دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردی جائے۔

مرزا صاحب: ضرور ضرور (کتاب لیتے ہوئے) آپ کا بہت بہت شکریہ۔

نورانی صاحب: یہاں آنے سے قبل میں نولکشور پریس میں ادبی مشیر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

مرزا صاحب: اچھا تو آپ سے مجھے اور زیادہ خصوصیت سے ملنا چاہئے کیونکہ زندگی میں میری اور منشی نولکشور کی بڑی خط و کتابت رہی ہے اور انہوں نے میرا دیوان بھی چھاپا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ وہ دلّی میں مجھ سے ملے بھی تھے۔

نورانی صاحب: جی ہاں! ان کے یہاں آپ کے بہت سے خطوط بھی محفوظ تھے مگر اب نہ جانے کیا ہوئے میں نے ان کی بڑی تلاش کی اور سارا کتب خانہ چھان مارا مگر وہ نہ مل سکے۔

مرزا صاحب: مگر نولکشور پریس تو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کان پور میں تھے؟

نورانی صاحب: جی ہاں۔ اس کے بعد منشی جی اُسے لکھنؤ لے آئے تھے۔

مرزا صاحب: اور اب ان کی اولادیں کیا کرتی ہیں؟

نورانی صاحب: بعد میں ان کی موجودہ اولادوں میں کچھ مناقشات پیدا ہو گئے تھے جس کے سبب ساری جائیداد دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہو گئی۔

مرزا صاحب: اور مطبع کا کیا حشر ہوا؟

نورانی صاحب: اس کی کتابیں اور مسوادات بھی دونوں بھائیوں میں برابر برابر تقسیم ہو گئے۔

مرزا صاحب: تو کیا اب بھی نولکشور پریس میں اُسی طرح کام ہو رہا ہے جس طرح میرے زمانہ میں ہوتا تھا؟ ایک مرتبہ جب وہ دلی تشریف لائے تھے تو مجھے بھلے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ نہایت خوش رو خوش پوشاک اور خوش مزاج انسان تھے ایک زمانہ تک میری اُن سے خط و کتابت رہی۔ آپ سے مل کر انکی یاد تازہ ہوگئی کاش آپکی بھی اُتنی لمبی داڑھی ہوتی

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

نورانی صاحب: اُردو کا کام تو اب بھی ہو رہا ہے مگر اُس پیمانہ پر نہیں ہو رہا ہے کیونکہ یو۔ پی میں اُردو کو شجر ممنوعہ قرار دیدیا گیا! اور ایسی زبان بولی جاتی ہے جسے سنکر گدھو نکو بھی جھرجھری آتی ہے۔

خواجہ صاحب: (ڈاکٹر قمر رئیس کا تعارف کراتے ہوئے) حضور! یہ ہمارے شعبہ کے نہایت ذہین اور نوجوان کام کرنے والوں میں ہیں۔ آپ نے منشی پریم چند پر تحقیقی مقالہ لکھ کر اُردو ادب میں اضافہ کیا ہے اور آپ کا وطن شاہجہان پور ہے۔

مرزا صاحب: (ڈاکٹر قمر رئیس سے مصافحہ کرتے ہوئے) صاحب میرے زمانہ میں شاہجہان پور پٹھانوں اور اپنے بہرے گرہ باز کبوتروں کے لئے مشہور تھا۔ اور اب ان کی جگہ نوجوان ادیبوں نے لے لی ہے۔ لہٰذا آپ بھی اونچی اُڑان کے ہونگے۔

خواجہ احمد فاروقی: (ڈاکٹر فضل حق اور ڈاکٹر عبدالحق کا تعارف کراتے ہوئے) اور مرزا صاحب آپ ڈاکٹر فضل حق اور آپ ڈاکٹر عبدالحق ہیں۔ آپ کی ببلوگرافی کے انچارج ڈاکٹر عبدالحق ہیں اور فضل الحق صاحب ان کے دست راست ہیں۔

مرزا صاحب: (دونوں صاحبان سے مصافحہ کرتے ہوئے) آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی (خواجہ صاحب سے مخاطب ہو کر) پہلے آپنے نورانی صاحب اور محمد حسن صاحب سے ملایا۔۔۔ پھر فضل الحق صاحب اور عبدالحق صاحب سے ملاقات کرائی اب صرف اللہ تعالیٰ سے ملنے کی حسرت رہی جاتی ہے آپ نے اُنکو آپنے کہاں

چھپا رکھا ہے؟

(ہر طرف سے قہقہے)

خواجہ صاحب: اور مرزا صاحب! آپ ہیں جناب مغیث الدین صاحب فریدی آپ قطع تاریخ کہنے میں ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ نہایت زود گو اور خوش گو شاعر ہیں اور ہمارے شعبۂ اُردو کو آپ پر ناز ہے۔

مرزا صاحب: (مغیث صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے) حضور آپ سے ملتے تو ڈر ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ جانے کب آپ میری قطع تاریخ کہہ کر مجھے بیک بینی اور دو گوش دُنیا سے چلتا کریں۔ (قہقہے)

رشید حسن خاں: (آگے بڑھ کر) حضور! خاکسار کو رشید حسن خاں کہتے ہیں۔ میں بھی خواجہ صاحب کی نگرانی میں کام کرتا ہوں۔

خواجہ صاحب: مرزا صاحب! رشید حسن خاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کچھ لوگ ادبیوں کی کھال نکالتے ہیں اور آپ کھال کے بال نکالتے ہیں۔ (ہر طرف سے قہقہے)، مرزا صاحب: اس میں "کی" "کھال کا" "راجہ" ہے۔ (قہقہے)

خواجہ صاحب: اور آپ سے ملئے آپ ڈاکٹر ظہیر صدیقی میرے دست راست ہیں۔ آپ کے والد محترم ضیا بدایونی صاحب نے شرح دیوان مومن لکھی تھی۔ اور آپ نے مومن پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

مرزا صاحب: تو یوں کہئے کہ باپ بیٹے دونوں روح القدس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تو دو آتشہ مومن ہیں اس لئے ان کو مجھے اچھی طرح دیکھ لینے دیجئے کیونکہ نہ مجھ جیسے خراباتی کو کوئی جنت میں جانے دیگا اور نہ اس کے بعد ان حضرات سے ملاقات ہو سکے گی۔

خواجہ صاحب: اور آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ آپ اپنے والد ماجد کو

چھوڑ کر حج بیت اللہ کو جا رہے ہیں ۔ اور جنت میں ریڈر شپ حاصل کر کے نوکری تیاری کر رہے ہیں ۔

مرزا صاحب : اس کے معنی یہ ہیں کہ رضوان اور نائب رضوان دونوں سے آپ نے دنیا میں ہی ملاقات کرا دی ۔ میرا خیال ہے کہ اب ان باپ بیٹوں کے پہنچنے پر رضوان اور نائب رضوان دونوں کو اپنی اپنی جگہیں خالی کرنا ہوں گی ۔ (قہقہے) اچھا صاحب اب مجھے اجازت دیجئے وہاں لڑکے ہال میں میرا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں ۔

یہ کہہ کر مرزا صاحب دلّی یونیورسٹی کے اسٹاف سے رخصت ہو کر ہال میں تشریف لے جاتے ہیں اور تالیوں سے مرزا صاحب کا استقبال ہوتا ہے ۔

مرزا صاحب : بھئی آپ حضرات معاف فرمائیں ۔ آج میری وجہ سے آپ کو خاصی دیر انتظار کرنا پڑا ۔

ایک طالب علم : آج ہم لوگ کچھ سوالات آپ کی خدمت میں پیش کریں گے جو آپ کی ذات خاص سے متعلق ہیں اور جنہیں بعض محققین نے جو آپ پر کام کر رہے ہیں ہم کو دریافت کرنے کے لئے دیئے ہیں ۔

دوسرا طالب علم : اپنی سوانح عمری میں آپ نے ایک بہت دلچسپ واقعہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کے کوئی دوست تھے جو بے حد شریف تھے مگر صرف شام کو آپ سے ملنے آتے تھے اور آپ ان کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ لُطف اندوز ہونا چاہتے تھے ۔ چنانچہ ایک دن آپ نے ان دوست کو بلانے کے لئے ایک مری ہوئی بلّی کو اپنے بستر میں چھپا لیا اور جب رات زیادہ ہو گئی تو آپ نے اپنے نوکر کو بلا کر ایسی اُلٹی سیدھی سانسیں لیں کہ جیسے آپ کا انتقال ہو رہا ہے اور اُسی سکرات کے عالم میں آپ نے نوکر سے کہا کہ اُن صاحب سے کہہ آ کہ مرزا صاحب کی حالت نازک ہو رہی ہے اگر آپ کو ان کا آخری دیدار کرنا ہو تو

توکرلیں ورنہ پھر ان کی زیارت نصیب نہ ہو گی۔ چنانچہ اُن صاحب کو آپ کے پاس آنا پڑا اور جب اُنھوں نے کہا کہ آپ کا تو انتقال ہو رہا تھا تو آپ نے اُنہیں مری ہوئی بلّی دکھا دی۔

توحضور! اس سلسلہ میں ایک محقق صاحب اپنی تھیسس میں یہ لکھنا چاہتے ہیں کہ وہ بلّی نر تھی یا مادہ؟ دوسرے وہ بلّی آپ نے عمداً مار ڈالی تھی یا خود سے مر گئی تھی؟

مرزا صاحب: بھئی اُس بلّی کے نر یا مادہ ہونے کا میری زندگی سے کیا تعلق ہے؟

وہی لڑکا: حضور یہ میں نہیں جانتا کہ اس کی جنس دریافت ...... کرنے کے بعد وہ آپ کی زندگی کے کس پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں مگر اُنھوں نے چونکہ یہ بات آپ سے دریافت کرنے کو کہی تھی اس لئے میں نے دریافت کر لی۔

دوسرا طالب علم: مرزا صاحب معاف کیجئے گا ایک سوال اور دریافت طلب ہے اور یہ سوال بھی ایک محقق صاحب نے جو آپ پر تھیسس لکھ رہے ہیں میرے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ سے دریافت کر کے اس کا جواب لکھ کر بھیج دوں۔

مرزا صاحب: پوچھئے۔

وہی لڑکا: حضور! انہوں نے دریافت کیا ہے کہ احاطۂ کالے خاں جہاں آپ رہتے تھے اُس کا نام احاطۂ کالے خاں تو اس وجہ سے تھا کہ اُس کے مالک کالے خاں تھے اور کالے خاں سے آپ سے خاصی ملاقات تھی اب محقق صاحب یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کالے خاں کی بیوی گوری تھیں یا کالی؟

مرزا صاحب: لاحول ولا قوۃ۔ مجھے کیا معلوم وہ میرے پاس معہ بیوی کے ملنے تھوڑے آتے تھے۔

ایک لڑکا: میرا خیال ہے کہ محقق صاحب نے یہ سوال اس وجہ سے کیا ہے کہ آجکل رؤسا اور فیشن ایبل لوگ جب کسی بڑے آدمی سے ملنے جاتے ہیں تو اپنی بیوی کو بھی ترپ کی دُگّی کی طرح ساتھ رکھتے ہیں۔ کہ نہ جانے کس وقت کس کام کے نکالنے کے لئے انہیں بیوی کی ضرورت پیش آجائے۔

مرزا صاحب: نہیں صاحب میرے پاس کوئی صاحب بھی معہ بیوی کے ملنے نہیں آتے تھے۔

دوسرا لڑکا: کیا غزل اور قصیدہ کہلوانے والے بھی تنہا آتے تھے؟

مرزا صاحب: ہاں وہ بھی تنہا آتے تھے۔

تیسرا لڑکا: اور آپ ان کو مفت غزلیں اور قصیدے لکھ کر دے دیا کرتے تھے؟

مرزا صاحب: ہاں۔

وہی لڑکا: حد ہو گئی۔

ایک لڑکا: ایک محقق صاحب نے آپ ہی کی تحریر سے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ جب آپ جیل میں تھے تو آپ کے کپڑوں میں جوئیں پڑ گئے تھے چنانچہ جوؤں سے متعلق آپ نے ایک شعر بھی کہا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ جوئیں کس سائز کے تھے۔ کیونکہ جوئیں تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو لیکھ کہلاتی ہے دوسرے عورتوں کی اصطلاح میں ڈھک کہلاتی ہے اور تیسری چیز جوں کہلاتی ہے اور ان تینوں کے سائز میں چونکہ فرق ہوتا ہے لہٰذا وہ آپ سے جوں کا سائز معلوم کرکے اس نتیجہ پہ پہنچنا چاہتے ہیں کہ آپ کے

کپڑوں میں لیکھ، دھک اور جوؤں میں سے کون سی چیز پڑی تھی اور کپڑے کس درجہ کثیف تھے؟

مرزا صاحب: لاحول ولاقوۃ۔ ارے بھئی یہ معلوم کر کے وہ کیا کریں گے؟

ایک طالب علم: حضور! ممکن ہے کہ محقق صاحب کی بیوی نے محقق صاحب کی وساطت سے یہ بات دریافت کرنا چاہی ہو۔

دوسرا لڑکا: ممکن ہے کہ تھیسس لکھتے وقت میاں بیوی میں حجت شروع ہو گئی ہو۔ بیوی کہتی ہوں کہ ڈھکیں یا لیکھیں یا چلوے تھے اور شوہر صاحب اس بات پر اُن سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے ہوں کہ وہ جوئیں تھی۔

مرزا صاحب: یہ تحقیق کی کون سی قسم ہے؟

ایک لڑکا: اسے کھال" کی" بال نکالنا کہتے ہیں۔

(سب لڑکے ہنسنے لگتے ہیں)

ایک طالب علم: مرزا صاحب میرے پروفیسر صاحب جو آپ کی خانگی زندگی کے مردانے پہلو پر اپنا تحقیقی مقالہ تیار کر رہے ہیں اُنھوں نے دریافت کیا ہے کہ مرزا صاحب کے مکان کے گردو پیش جو کتے رہتے تھے اُن میں زیادہ تعداد کتوں کی تھی یا کتیوں کی ؟

مرزا صاحب: لاحول ولاقوۃ۔ یہ سوال تو پہلے سوالوں سے بھی زیادہ مضحک ہے ارے بھائی مجھے کیا معلوم کہ کتے زیادہ تھے یا کتیاں۔ کوئی میں دن بھر ڈنڈا لئے ان کی نر مادیں دریافت کیا کرتا تھا؟

ایک طالب علم: ممکن ہے کہ محقق صاحب نر اور مادہ دریافت کرنے کے بعد اُس سے آپ کے دماغی سکون کے بارے میں کوئی نتیجہ نکالنا چاہتے ہوں

کیونکہ عموماً کُتیاں کُتوں کے مقابلہ میں زیادہ بھونکتی ہیں اور کُتوں کی چھیڑ چھاڑ کے سبب وہ عموماً چڑچڑی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اکثر بلا سبب بھی بھونکنا شروع کر دیتی ہیں۔

مرزا صاحب: بھئی یہ چیز تحقیق کی کون سی قسم کے تحت آتی ہے؟

ایک لڑکا: حضور! اسے مگسی تحقیق کہتے ہیں۔ جیسے مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا۔

مرزا صاحب: سبحان اللہ سبحان اللہ۔ کار طفلاں تمام خواہد شد۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب میرے والد صاحب بھی آپ پر کام کر رہے ہیں اور ان کی تھیسس کا عنوان ہے "مرزا غالب ظروف کے آئینہ میں" اور انہوں نے اس سلسلہ میں آٹھ دس سوال دریافت کئے ہیں۔

مرزا صاحب: پہلے اُن سوالات کو پڑھ کر سنائیے۔

وہی لڑکا: حضور پہلا سوال ہے کہ مرزا صاحب سے زندگی میں کتنے پیالے، پیالیاں اور طشتریاں ٹوٹیں اُن میں کتنی مٹی کی تھیں، کتنی چینی کی اور کتنے شیشے کی تھیں؟

(سب لڑکے ہنسنے لگتے ہیں)

وہی لڑکا: حضور! یہ تو پہلا سوال تھا۔ اب دوسرا سوال ملاحظہ ہو۔ آپ برتنوں کے ٹوٹنے پر کتنی مرتبہ بیوی سے لڑے اور کتنی مرتبہ بیوی آپ سے لڑیں۔ ان برتنوں کے ٹوٹنے میں کتنے برتن وہ تھے جو بیوی کو میکے سے جہیز میں ملے تھے اور کتنے وہ تھے جو آپ اپنے پیسے سے گھر کے لئے لائے تھے؟

(سب لڑکے ہنسنے لگتے ہیں)

وہی لڑکا: تیسرا سوال عرض کرتا ہوں۔

آپ اپنے یہاں برتنوں پر کس قلعی گر سے قلعی کراتے تھے؟ اُس قلعی گر کا کیا نام تھا وہ شادی شدہ تھا یا غیر شادی شدہ؟ احاطہ کالے خاں میں رہتا تھا یا کسی دوسرے محلہ میں؟ قلعی کے برتن لانے اور لیجانے میں اُس کی بیوی کو کوئی دخل تھا یا نہیں؟ اور اس کی بیوی کو مرزا صاحب کی بیوی کس نظر سے دیکھتی تھیں؟

(لڑکے قہقہے لگاتے ہیں)

چوتھا سوال عرض ہے۔ کتنے ظروف روزمرہ کے کام میں آتے تھے اور کتنے اُس وقت نکالے جاتے تھے جب کوئی مہمان آجاتا تھا یا گھر میں کسی کی دعوت ہوتی تھی۔ پیالے، طشتریوں، چمچوں، ڈونگوں، دیگوں وغیرہ کی ناپ کیا تھی؟ آپکے گھر میں چینی کے کتنے برتن تھے اور تانبے پیتل اور شیشے کے کتنے تھے؟

ایک آواز: ابے — حد کردی تحقیق کی — اس کی ....

دوسری آواز: ابے یہ تحقیق نہیں ہے یہ تو تحقیق کی ماں ہے۔

دوسرا لڑکا: حضور! اب صرف دو سوال اور رہ گئے ہیں جو محقق صاحب نے دریافت کئے ہیں۔

مرزا صاحب: پڑھیئے۔

وہی لڑکا: پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں دلّی میں کن کن بازاروں میں برتن فروخت ہوتے تھے اور اُن دوکان داروں کا نام معہ ولدیت کے مطلوب ہے۔

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ جو سویرے شام یخنی نوش فرماتے تھے وہ آپکو پیالے میں رکھ کر دی جاتی تھی یا کسی گہری پلیٹ میں؟

مرزا صاحب: اِن دونوں سوالوں کا بھی میری زندگی سے کیا تعلق ہے؟

تیسرا لڑکا: میری دانست میں محقق صاحب ان دو سوالوں میں پہلے سوال

سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ دلّی میں برتنوں کا کاروبار ہندوؤں کے پاس تھا یا مسلمانوں کے پاس اور دوسرے سوال سے وہ اس نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں کہ آپ یخنی کتنی مقدار میں پیتے تھے کیونکہ اودھ کے بعض نوابین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سویرے اُٹھ کر سب سے پہلے دو بکروں کی یخنی پیتے تھے جو ظاہر ہے کہ تین چار پیالوں سے کم میں نہ آتی ہوگی۔

مرزا صاحب: ارے بھائی میں ایک چھوٹے سے پیالے میں زیادہ سے زیادہ ایک چھٹانک یخنی پیتا تھا اور وہ بھی معدہ پر اس درجہ بار ہوتی تھی کہ بسا اوقات دو دو روز بدہضمی کا شکار رہتا تھا۔

ایک لڑکا: ممکن ہے کہ اس سوال سے محقق صاحب آپ کے معدہ کی خرابی کا حال دریافت کرنا چاہتے ہوں۔

مرزا صاحب: کجُا می نمائی کجُا می زنی — اتنا گھُما کر سوال پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ کا ایک شعر ہے۔

ملنا اگر ترا نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

چونکہ آپ مشکل بات کا آسانی سے جواب دے سکتے ہیں اس لئے اُنہوں نے براہ راست آپ سے سوال نہیں کیا کہ کہیں آپ کو اُن کے سوال کا جواب دینے میں زحمت نہ پیش آئے۔

مرزا صاحب: اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ محقق صاحب مجھے نِرا گھامڑ سمجھتے ہیں۔ ارے بھائی ہر شعر حقیقت پر مبنی تھوڑے ہوتا ہے۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب۔ میرے محقق صاحب نے صرف تین باتیں

دریافت کی ہیں۔

مرزا صاحب: فرمائیے۔

وہی لڑکا: اول تو محقق صاحب یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ شعر لیٹ کر کہتے تھے یا بیٹھ کر؟ اور ان دونوں حالتوں میں جو اشعار آپ کہتے تھے ان میں بہتر اشعار کون ہوتے تھے؟ نیز یہ کہ آپ جو اشعار بیوی سے چھپا کر کہتے تھے وہ زیادہ موثر ہوتے تھے یا وہ اشعار جو ان کی موجودگی میں کہتے تھے؟

مرزا صاحب: اس سے محقق صاحب کیا نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں؟

وہی لڑکا: میرا خیال ہے کہ جس وقت لیٹ کر شعر کہتے ہوں گے اسوقت یقیناً آپ آرام کرنا چاہتے ہوں گے۔ لہٰذا وہ اشعار سیدھے سیدھے آرام سے نکل آتے ہوں گے۔ اور وہ اشعار جو آپ بیٹھ کر کہتے ہوں گے اُن میں زیادہ تر آورد ہوتی ہو گی کیونکہ ان میں دماغ پر کچھ زور دینا پڑتا ہو گا۔ اور جہاں تک ان اشعار کا تعلق ہے جو آپ بیوی کی غیبت میں اُن سے چھپا کر کہتے ہونگے وہ یقیناً حد درجہ عاشقانہ ہوتے ہوں گے۔ جیسے آپ کا یہ شعر؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں؟

اب رہے وہ اشعار جو ٹہل ٹہل کر اور کھانا ہضم کرنے کی خاطر آپ کہتے ہوں گے وہ کسی بادشاہ یا رئیس کی قصیدہ خوانی سے متعلق ہوں گے کیونکہ ان کا تعلق براہ راست گھریلو اخراجات سے ہوتا تھا جس میں اشیائے خورد و نوش بھی شامل تھیں۔

مرزا صاحب: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کے معلومات فراہم کر کے محقق صاحب کیا کریں گے؟

وہی لڑکا: حضور! ان کے تحقیقی مقالہ کا عنوان ہے: "مرزا غالب غم جاناں

اور غم دوراں کے نرغے میں "۔ اسی ضمن میں محقق صاحب یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جس ڈومنی سے آپ نے متعہ کیا تھا اس کی عمر اور صورت شکل کیسی تھی؟ سب سے پہلے آپ اُسکے کس مقام پر عاشق ہوئے تھے؟ وہ کنواری تھی یا پہلے سے تیر تکے پر زندگی بسر کرنے کی عادی تھی؟ وہ آخر دم تک بانجھ رہی یا آپ سے اس کے کوئی اولاد ہوئی؟ اور اگر نہیں ہوئی تو کمزوری کس طرف سے تھی؟

مرزا صاحب: اب اتنی باتیں تو مجھے یاد نہیں ہیں مجھے تو کام سے کام تھا البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ کٹر سُنّی اور صوفی منش تھی ۔ اس سے میرا مقصد اولاد پیدا کرانا نہ تھا اس لئے کمزوری اور عدم کمزوری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ وہ صورت شکل کی ضرور اچھی تھی ورنہ مجھے کیا پڑی تھی جو میں اُس سے عشق کرتا۔

وہی لڑکا: آخری سوال جو محقق صاحب نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی بیوی اور آپ کی عمر میں صرف دو سال کا فرق تھا شادی کے وقت آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی اور آپ کی بیوی گیارہ سال کی تھیں ۔ کیا گیارہ سال کی عمر میں وہ جوان ہو گئی تھیں؟

مرزا صاحب: یہ میرے ازدواجی معاملات میں کون صاحب دخیل ہونا چاہتے ہیں ۔ اگر میں صرف دو ماہ کے لئے نہ آیا ہوتا تو میں ان صاحب کے خلاف ہتک حُرمت کا دعویٰ کر دیتا ۔ مگر یہ محقق صاحب میرے مرنے سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

وہی لڑکا: حضور! یہ دَور ہی ناجائز فائدہ اُٹھانے والا دَور ہے ۔ آپ کی ذات سے کچھ لوگ مالی فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور کچھ علمی اور تحقیقی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہیں ۔ آپ کے مرنے کے بعد کچھ لوگوں نے آپ کے ساتھ اپریل فول کا مذاق کیا تھا اور ایک ایسی غزل کہہ کر بھوپال کے کسی اخبار میں چھپوا دی تھی ۔ جو حد درجہ مضحک تھی مگر یالک رام صاحب جو اس دَور میں غالبیات کے ماہر سمجھے

جاتے ہیں۔ اُنہوں نے اُسے بھی اپنے دیوان میں شامل کر لیا۔ اور اُسے براہ راست آپ سے منسوب کر دیا۔ حضور! یہ تحقیقی لپاڈگی کا دور ہے۔ اسی پہ لوگوں کو پی۔ ایچ۔ ڈی مل رہا ہے۔

مرزا صاحب: اچھا اور کسی صاحب کو تو کچھ دریافت کرنا نہیں ہے؟

(تین لڑکے کھڑے ہوکر) حضور! ابھی تین محققین کے سوالات کے جوابات باقی ہیں جن میں سے ایک خاکسار ہے۔

مرزا صاحب: تو آپ اپنے سوالات پڑھیئے۔

وہی لڑکا: قبلہ میرے محقق صاحب کے تحقیقی مقالہ کا عنوان ہے "مرزا غالب اور حجّام" اور اس سلسلہ میں اُنہوں نے تین باتیں دریافت کی ہیں۔

مرزا صاحب: اچھا آپ ایک ایک کر کے اپنے سوالات پڑھیئے۔

وہی لڑکا: محقق صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے حجّام کا نام تو معلوم ہو گیا ہے مگر اس کی ولدیت اور اس کی شکل و صورت کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں دریافت کرنا ہیں۔

الف:۔ وہ کلین شیو تھا یا اس کے داڑھی تھی؟

ب:۔ کنوارہ تھا یا شادی شدہ؟ شادی شدہ ہونے کی صورت میں اسکے کَے بچّے تھے؟

ت:۔ وہ کس قسم کا لباس پہنتا تھا۔ حجامت بناتے وقت وہ کون سا صابن استعمال کرتا تھا؟ اس کی کوئی مستقل دوکان تھی یا گھروں گھروں جا کر لوگوں کی حجامت بناتا تھا؟

ج:۔ اس کی دوکان کس جگہ واقع تھی؟ ماں زندہ تھی یا مرچکی تھی؟

د:۔ حجامت بناتے وقت وہ آپ کا سر اُتر دکھن گھماتا تھا یا پورب پچھم؟

ذ :- اگر آپکو اس سے کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی تو اُس کا بھی ذکر کر دیجئے۔

ر :- وہ خاص دلّی کا رہنے والا تھا یا باہر کے کسی شہر یا دیہات سے آکر اُس نے دلّی میں سکونت اختیار کر لی تھی ؟

مرزا صاحب : یہ باتیں تو ایسی ہیں جو کوئی حجامت بنوانے والا بھی نہیں بتا سکتا ؟

وہی لڑکا : میری دانست میں محقق صاحب اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ آپ کا خاندانی حجام تھا یا باہر کا آیا ہوا تھا۔

مرزا صاحب : اس میں خاندانی اور غیر خاندانی کا سوال نہیں ہسوال یہ ہے کہ حجامت بنوانے سے پہلے حجام سے یہ ساری خرافات باتیں کون پوچھتا ہے ؟

وہی لڑکا : اِنہیں محقق صاحب کا دوسرا سوال جو کئی حصّوں میں ہے ملاحظہ ہو۔

مرزا صاحب : پڑھئے۔

الف :- آپ کی زندگی میں کتنے لوگوں نے آپ کی ادبی یا غیر ادبی حجامت بنائی ؟

ب :- ان ادبی حجامت بنانے والوں کے نام معہ ولدیت کے دریافت طلب ہیں۔

ج :- ادبی حجام نثر نگار تھے یا شاعر ؟ اگر شاعر تھے تو کیا ان کا کوئی دیوان شائع ہوا ہے اور اگر نثر نگار تھے تو ان کے نثری مجموعوں کے نام۔

د :- وہ بیوی بچوں والے تھے یا کنوارے ؟ اگر بیوی بچوں والے تھے تو اُن کے بچے اُنہیں کی شکل کے تھے یا محلہ والوں سے ان کی شکل ملتی جلتی تھی ؟

مرزا صاحب : اس قسم کے سوالات سُننے کے بعد یہ میری بہت بڑی بے غیرتی ہے میں زندہ ہوں۔ اچھا ہوا کہ میرا انتقال ہو گیا ورنہ یہ محققین مجھے زندہ درگور

کردیتے۔

وہی صاحب: تیسرا سوال ملاحظہ ہو۔

مرزا صاحب: پڑھیئے۔

جن اُستروں سے آپ کی حجامت بنتی تھی وہ دیسی تھے یا ولایتی؟

حجام آپ کی زندگی میں بقید حیات رہا یا مرگیا؟ اگر مرگیا تو کس مرض میں مرا اور کس حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھوں مرا؟

مرزا صاحب: اپنے محقق صاحب سے میرا سلام عرض کیجئے گا اور کہئے گا دو مہینے بعد جب میں واپس جاؤں تو وہ میری قیام گاہ پر آکر بالمشافہ یہ ساری باتیں دریافت کرلیں۔ یہاں سے واپسی کے بعد میں اُن کا منتظر رہوں گا۔

ایک طالب علم: حضور! دو مہینے کے بعد تو آپ اس دُنیا سے چلے جائیں گے پھر محقق صاحب سے ملاقات کیسے ہوسکے گی؟

مرزا صاحب: اُن سے کہہ دیجئے گا کہ اگر ان کو اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنا ہے تو اتنی زحمت تو انہیں برداشت ہی کرنا پڑے گی۔ اچھا اب اور کتنے محققین کے سوالات باقی ہیں؟

ایک طالب علم: صرف دو جن میں سے ایک یہ خاکسار ہے جو ایک محقق صاحب کے دو سوال لیکر حاضر ہوا ہے۔ ان محقق صاحب کی تھیسس کا عنوان ہے "مرزا غالب اور چوپائے"۔

مرزا صاحب: لاحول ولا قوۃ۔ کیا آپ کے محقق صاحب نے مجھے کوئی گڈریا یا کسی جانوروں کے اسپتال کا محرر سمجھ رکھا ہے۔ جو اپنی تھیسس کا یہ عنوان قرار دیا ہے۔

وہی لڑکا: حضور! غالباً محقق صاحب یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ

کے گھر میں کتنے چوپائے پلے تھے۔ ایک چوپائے کا تو ان کو علم ہے یعنی بلّی جو آپ کے بستر کے اندر سے مری ہوئی نکلی۔ دوسرے چوپاؤں کے بارے میں انہوں نے مندرجہ ذیل سوالات کئے ہیں۔

۱۔ آپ کے یہاں جو گھوڑا تھا وہ کس نسل کا تھا؟ آپ کو سسرال سے منہ دکھائی میں ملا تھا یا آپ نے خود خریدا تھا؟ اگر خود خریدا تھا تو کتنے میں خریدا تھا اور اس میں کیا خوبیاں تھیں؟

۲۔ آپ کے یہاں گائے ضرور پلی ہوگی کیونکہ اُس زمانہ میں رؤسا گھر کی گائے کا دودھ پیتے تھے۔ وہ گائے کس نسل کی تھی کتنا دودھ دیتی تھی؟ کبھی آپ نے اس کے دودھ کی پیوسی بھی کھائی اور اگر کھائی تو اس کا کیسا ذائقہ تھا؟ دودھ دوہنے والا ملازم مرد تھا یا عورت؟ آپ اس کا دودھ کن کن اوقات میں پیتے تھے۔ آپ کو گائے کا دودھ پسند تھا یا بھینس کا؟

۳۔ آپ کی بیوی نے کوئی بکری ضرور پالی ہوگی کیونکہ اُس زمانہ کی عورتیں بکریوں کی شوقین ہوا کرتی تھیں۔ یہ بکریاں ہر چھ مہینے بعد بچے دیتی تھیں۔ بکری کو کے بار کانجی حوض جانا پڑا؟

۴۔ بچپن میں آپ کو بندر کا ناچ زیادہ پسند تھا یا ریچھ کا؟

۵۔ آپ کس قسم کے کتوں کے شوقین تھے شکاری یا بل ڈاگ۔ آپ کے محلہ میں جو آبادی تھی اُس کے پاس کل ملا کر کتنے چوپائے تھے؟ آپ نے کبھی ہاتھی اور شیر کی لڑائی دیکھی ہے؟

مرزا صاحب: استغفر اللہ۔ میرا کبھی کسی چوپائے سے سابقہ نہیں پڑا۔

ایک لڑکا: مگر حضور! آپ نے تو اپنے اشعار میں بھی اپنے اور اپنے آبا و اجداد کی سپہ گری پر فخر و مباہات کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا وہ سپہ گر ہی کیا جس کے پاس گھوڑا تک

نہ ہو۔ اسی لئے محقق صاحب نے گھوڑے کے بارے میں ساری باتیں آپ سے دریافت کی ہیں۔

مرزا صاحب: گھوڑ سواری تو میں نے بچپن میں ضرور سیکھی تھی مگر جس قسم کے سوالات محقق صاحب نے گھوڑے کے بارے میں پوچھے ہیں وہ تو ایک سائیس بھی نہیں بتا سکتا۔ میں تو ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ فینس پر جاتا تھا جو میرے دور میں شرفاء استعمال کیا کرتے تھے۔ اسی طرح چوپاؤں کے بارے میں مجھ سے سوالات پوچھے گئے ہیں جبکہ بیل بکری اور گائے سے میرا کبھی دور کا واسطہ نہیں رہا۔

دوسرا طالب علم: قبلہ اس میں محقق صاحب کی خطا نہیں ہے بلکہ اس کی ذمّہ داری تو اُن اساتذہ پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے "چوپائے اور غالب" پر اُنہیں تحقیقی مقالہ لکھنے پر مجبور کیا۔

مرزا صاحب: آپ ہی بتائیے کہ ایک شخص جو زندگی بھر علمی اور ادبی کام کرتا رہا ہو آپ اُس سے بکرے اور بکری کے ازدواجی تعلقات دریافت کرتے ہیں اُس سے بھیڑ اور بکری کی زچگی کے حالات پوچھتے ہیں۔ وہ اس کے بارے میں آپ کو کیا بتا سکتا ہے۔ پھر آپ مجھ سے کتوں کی وجہ تسمیہ اور ان کی قسمیں دریافت کرتے ہیں بھلا اس کا مجھ سے کیا تعلق ؟

پہلا طالب علم: حضور! میری دانست میں اس قسم کے سوالات آپ کی بیگم سے کیئے جاتے تو وہ بڑی حد تک کوئی تسلی بخش جواب دے ۔۔۔ سکتیں۔ کیونکہ وہ عورتیں جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی وہ عموماً اپنی دل بستگی اور وقت گذاری کے لئے کُتا، بندر، بلی قسم کی چیزیں پال کر ان سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرنے لگتی ہیں اور دن بھر ان کی نگہداشت میں لگی رہتی ہیں۔ مگر آپ جن کی ساری زندگی

شعر و شاعری میں گذری، ہو اس کو کیا معلوم کہ جمنا پاری بکری اور دیسی بکری میں کونسی بکری زیادہ دودھ دیتی ہے؟

تیسرا لڑکا: مگر مرزا صاحب! اس قسم کے سوالات پوچھنے میں محقق صاحب کو ان معنوں میں ضرور حق بجانب قرار دیا جاسکتا ہے کہ اُس زمانہ میں ہر رئیس کے یہاں گائیں، بکریاں اور بھینسیں دودھ دہی کے لئے ضروری ہوتی تھیں کیونکہ وہ لوگ خالص چیزیں استعمال کرنے کے عادی تھے۔ اُس زمانہ میں موجودہ رؤسا کی طرح کوئی رئیس نہ تو مونگ پھلی کے چھلکوں ملا آٹا کھانے کو تیار تھا اور نہ زہریلی غذائیں اُسے کھانے کو ملتی تھیں۔

اس لئے محقق صاحب کا خیال ہوگا کہ جب مرزا صاحب شعر و شاعری کرتے کرتے تھک جاتے ہوں گے تو گھر کے اس قسم کے پالو جانوروں سے اپنی دلچسپی کے لئے نہ سہی اپنی بیوی کی دلجوئی کے لئے دلچسپی ضرور لیتے ہوں گے۔ اور جس طرح پرانے بادشاہوں کو شیر ہاتھی اور کتوں کے شکار سے دلچسپی تھی اور ان کے یہاں اعلیٰ نسل کے جانور مختلف ملکوں سے منگا کر رکھے جاتے تھے اسی طرح مرزا صاحب کو بھی شوق ہوگا اسی لئے محقق صاحب نے ان تمام باتوں کو دریافت کیا ہے۔

مرزا صاحب: میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ میں گھوڑوں اور کتوں کی دُمیں ناپتا پھرتا اور ان کے آبا و اجداد کے حسب نسب کی تفصیل میں پڑتا۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب اچھا ان محقق صاحب کے سوالات کو چھوڑئیے اور میرے چچا جان جو آپ کی گھریلو زندگی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ جن کے مقالہ کا عنوان ہے "مرزا غالب اور ان کی گھریلو زندگی" وہ اس

سلسلہ میں وہ مندرجہ ذیل باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ آپ کو شادی کے بعد سلام کرائی میں سسرال سے کتنی رقم ملی تھی؟ آپ شراب پی کر سلام کرنے گئے تھے یا بیوی ملنے کی خوشی میں آپ شراب پینا بھول گئے تھے؟ جو رقم آپ کو ملی تھی وہ آپ نے بیوی کے ہاتھ میں رکھدی تھی یا اپنی جیب میں رکھ لی تھی؟

مرزا صاحب: صاحب آپ کے محقق صاحب کو اس رقم کی جو مجھے سلام کرائی میں ملی تھی چنداں فکر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ خرچ ہو چکی ہے — اور جہاں تک شراب کا تعلق ہے۔ میں نے کہیں بھلا اپنے مادر زاد شرابی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ـ ـ ـ یہ عادت تو میرے دوستوں کی صحبت کے سبب شادی کے بعد مجھ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اُن سے کہیئے گا کہ جب سلام میں نے کیا تھا تو سلام کرائی میں بیوی کو کیوں دیتا—؟

وہی لڑکا: آپ رمضان میں روزے کیوں نہیں رکھتے تھے؟

مرزا صاحب: جو کمرہ میری بیگم نے میرے لئے مخصوص کیا تھا اُس میں ایک چارپائی سے دوسری چارپائی بچھانے کی گنجائش نہ تھی لہذا میں رمضان کے تیس روزوں کو کہاں رکھتا؟

وہی لڑکا: آپ بیگم صاحب سے ملنے کن اوقات میں جاتے تھے؟

مرزا صاحب: وہ سویرے سے شام تک نمازیں پڑھا کرتی تھیں اور اُنھوں نے پورے گھر کو مسجد بنا رکھا تھا لہذا عشاء کی نماز کے بعد سے فجر کی نماز تک کا وقت اُن کے پاس تھا—— انہیں اوقات میں میں پابندی کے ساتھ اُن سے ملتا رہتا تھا۔

وہی لڑکا: جب آپ جیل سے چھُٹ کر آئے تو آپ کی بیوی نے آپ سے

سوال کیا کیا تھا؟

مرزا صاحب: آپ اتنی جلدی کیسے چھوڑ دیئے گئے۔؟

(قہقہے۔ قہقہے)

وہی لڑکا: رمضان شریف میں روزے کے افطار کے وقت آپ کیا کھاتے تھے؟

مرزا صاحب: بیوی کی صلواتیں۔

(قہقہے)

وہی لڑکا: جب نشے کے عالم میں آپ بیوی سے بات کرتے تھے تو اُنہیں بڑا دکھ ہوتا ہوگا۔؟

مرزا صاحب: بات کرنے سے پہلے ہی وہ کہہ دیتی تھیں کہ خبردار جو مُنہ قریب لائے۔

وہی لڑکا: جس زمانہ میں آپ کی بیوی حاملہ ہوتی ہوں گی تو اور زیادہ چڑ چڑی ہوجاتی ہوں گی؟

مرزا صاحب: مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ اس کا علم اُن کے میکے والوں کو ہوگا۔ کیونکہ حاملہ ہونے کے بعد ہی میں ان کو فوراً ہی میکے بھیج دیتا تھا۔

وہی لڑکا: آپ کی ازدواجی زندگی کے وہ کون سے لمحات تھے جنہیں آپ سب سے زیادہ خوش کن اور دلکش سمجھتے ہیں؟

مرزا صاحب: جب میں اپنی بیٹھک میں شراب پیتا تھا اور اندر سے بیگم کی صلواتیں سُنائی پڑتی تھیں۔

وہی لڑکا: آپ کی بیوی کا آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا؟

مرزا صاحب: جو ایک شرابی کے ساتھ کسی شریف انسان کا ہوتا ہے۔

وہی لڑکا : گھر میں رہ کر دن میں آپ کے کیا مشاغل تھے ؟

مرزا صاحب : مُنہ دھو کر ناشتہ کرنا، شعر کہنا، شراب پینا، دوست احباب کے ساتھ شطرنج یا گنجفہ کھیلنا، خطوط لکھنا، بیوی سے جھوٹ بولنا اور ان کی صلواتیں سُننا۔

وہی لڑکا : آپ نے شراب پی کر داڑھی کیوں رکھی ؟

مرزا صاحب : تاکہ اچھا جھوٹ بول سکوں ۔

وہی لڑکا : آپ اُس ڈومنی سے جس سے آپ نے متعہ کر لیا تھا کن اوقات میں ملتے تھے ؟

مرزا صاحب : جب بیوی کے خرّاٹوں کی آواز سُنائی دینے لگتی تھی ۔

وہی لڑکا : آپ کی اور آپ کی شاعری کی حیثیت آپ کی بیوی کی نظروں میں کیا تھی ؟

مرزا صاحب : دونوں کی اپنی اپنی جگہ مساوی حیثیت تھی یعنی یہ کہ وہ مجھے بے لعنت بھیجتی تھیں اور میری شاعری کو غنا سمجھ کر اُسے سُننا گناہ عظیم تصور کرتی تھیں ۔

وہی لڑکا : اپنے اور اپنی بیگم صاحبہ کے مزاج میں کوئی چیز ایسی بتائیے جو مساوی ہو ؟

مرزا صاحب : خوف ۔ وہ میری شراب سے خوفزدہ تھیں اور مَیں ان کی نماز سے ۔

وہی لڑکا ۔ آپ نے اور آپ کی بیگم صاحبہ نے زندگی میں کبھی کوئی کام مِل بیٹھ کر بھی کیا ؟

مرزا صاحب: جی ہاں - اولادیں پیدا کیں -

وہی لڑکا: وہ آپ کو کس نام سے مخاطب کرتی تھیں؟

مرزا صاحب: بڈھا -

وہی لڑکا: وہ کچھ پڑھی لکھی تھیں؟

مرزا صاحب: معلوم نہیں کیونکہ ہم دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کو جاہل سمجھتے رہے - اور ہمیشہ ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے رہے -

وہی لڑکا: آپ نے اپنی زندگی میں کسی سے مسلسل محبت کی ہے؟

مرزا صاحب - شراب سے -

وہی لڑکا: ڈومنی بڑھاپے میں آپ کو کس نظر سے دیکھتی تھی؟

مرزا صاحب: جیسے چلم حقہ کو - (تھوڑی دیر رُک کر) ارے بھائی تمہارے محقق صاحب کچھ خود بھی لکھیں گے یا ساری تھیسس مجھی سے لکھوا لیں گے - اب میں بہت تھک گیا ہوں - سوالوں کا سلسلہ بند کر دو اور مجھے میری قیام گاہ جانے دو وہاں حکیم عبدالحمید صاحب چائے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے -

تالیوں کی گونج میں لڑکے مرزا صاحب کو رخصت کرتے ہیں -

پانچواں دِن

آج درجہ میں دو سو نئے لڑکے گھس آئے ..... ہیں اس لئے بلا کا شور وغوغا مچا ہوا ہے ۔ چونکہ یہ سب لڑکے .... دوسرے صوبوں سے اُردو پڑھکر غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر اپنی اخلاقی مرمّت کرانے آئے ہیں اس لئے اپنی اپنی زبانوں میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہیں ۔ ان میں یو ۔ پی سے آئے ہوئے طلبہ جو ہندی میں اُردو پڑھتے ہیں حد درجہ بے ہودگی پر آمادہ ہیں ۔ اور ایک دوسرے کو جدید ہندی کی ایسی ایسی کویتائیں سُنا رہے ہیں جو شرافت پر بار ہیں ۔ انہیں طلبہ میں ایک اچھا خاصہ گروہ ان طلبہ کا ہے جو اُردو میں جدیدیت کی تحریک سے متاثر ہیں اور جنہوں نے خود شاعری شروع کردی ہے ۔

ایک لڑکا : آج جب مرزا صاحب آئیں گے تو میں اپنی ایک نظم جو میں نے یہاں آکر کہی ہے اور جس کا عنوان ہے " مرزا غالب " اُنہیں ضرور سُناؤں گا ۔

دوسرا لڑکا : میں نے بھی ایک نظم کہی ہے جو جدید قدروں کی علمبردار ہے ۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب اس کو سمجھ بھی پائیں گے کیونکہ وہ سو سال پہلے کے ہیں اور ان کو نہیں معلوم کہ شعر و شاعری زندگی سے کتنا قریب ہوگئی ہے۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب کے زمانہ کا معشوق بھی دُنیا سے نرالا تھا وہ پردہ میں رہتا تھا اور عشاق بغیر دیکھے اُس پر عاشق ہو جاتے تھے اور زندگی بھر اسکے کوچے میں پڑے پڑے اُس کے بام پر مسمریزم کی مشق کرتے تھے۔ وہ اُن پر ابرو کو جوڑ کر نظر کے تیر مارتا تھا پھر جس کے ذرا چھیلتا ہوا لگتا تھا وہ تو بھاگ نکلتا تھا اور زندگی بھر اس کی یاد میں پھیکی آہیں اور سیٹھے نالے اس کے کوچہ کی طرف مُنہ کر کے نشر کیا کرتا تھا۔ جس سے محلے والوں کا سونا دشوار تھا۔ ان ہی عاشقوں میں جس کے سینے سے اُس کی نگاہوں کا تیر پار ہو جاتا تھا اُس کا براہ راست انتقال ہو جاتا تھا اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اُٹھتا تھا۔ محبوب نے ایسے موقع کے لئے ایک سیاہ ماتمی لباس تیار کر رکھا تھا جسے پہن کر وہ کبھی چالیس قدم پہنچا کر اپنی قیام گاہ پر واپس آتا تھا اور کبھی عید بقرعید یا شبرات کے موقع پر اگر اُسے فرصت ہوتی تو قبرستان چلا جاتا تھا اور اس کی قبر پر کبھی شمع روشن کرتا کبھی لوبان سُلگا آتا تھا اور یہ مرحوم اندر سے لیٹے لیٹے صبا سے فرماتے کہ ع۔

مری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغِ گورِ غریباں صبا بُجھا دینا

اور صبا جب چراغ بجھا دیتی تو وہ اپنی نقاب اُلٹ کر اُن کے مزار پر فاتحہ پڑھکر رخصت ہو جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مرحوم ہونے کے بعد بھی ان کو اپنے محبوب کی بے پردگی کا کتنا خیال رہتا تھا کہ دائیں بائیں جب کوئی

نظر نہیں آتا تو یہ صبا سے خوشامد کرتے ہیں کہ ذرا شمع بُجھا دو ورنہ بیگم صاحبہ کو کوئی دوسرا دیکھ کر کہیں اغوا نہ کرلے۔ ان ہی عاشقوں میں بعض ایسے برم راکشش قسم کے ہوتے تھے جو محبوب کے کوچے میں انتقال کرنے کے بعد اپنے دو چار نالے محبوب کو پریشان کرنے کے لئے چھوڑ آتے تھے اور قبر میں لیٹے لیٹے فرماتے تھے کہ ؎

لحد میں ہیں ہوں اور نالے لبے ہیں کوئے جاناں میں
مری منزل سے آگے بڑھ گیا ہے کارواں میرا

گویا مرنے کے بعد جب ان کا جنازہ قبرستان کو روانہ ہوا تھا تو اُسے کوئے جاناں میں روک کر وہیں دفن کر دینا چاہئے تھا مگر اہلِ جنازہ ان کو قبرستان پہنچا آئے جہاں مغالطہ ہی مغالطہ میں یہ دفن ہو گئے۔ حالانکہ ان کو کوچۂ جاناں میں دفن ہونا تھا۔

اسی طرح مرنے سے قبل ایک عاشق صاحب اپنے محبوب سے وصیت فرماتے ہیں کہ انتقال کے بعد اگر قبرستان میں میری قبر کچھ عرصہ بعد ٹوٹ پھوٹ جائے اور تم اپنے تازہ مقتولوں کی قبروں پر کبھی چراغ جلانے آنا تو اگر زحمت نہ ہو تو میری ٹوٹی ہوئی قبر پر بھی ایک دیا جلا دینا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

جب کبھی تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا
ایک ٹوٹی ہوئی تُربت پہ بھی احساں کرنا

بعض عاشق ایسے بھی ہوتے تھے جو اپنی پوری زندگی بلا مقصد اپنے محبوب کے آستانے پر ٹہل ٹہل کر گذار دیتے تھے اور قانون اور پولیس کی زد سے بچنے کے لئے جو لوگ اس طرف سے گذرتے تھے اُن سے ایک آدھ بات بھی کر لیتے تھے تا کہ اگر کوئی پوچھے کہ آپ یہاں کس سلسلہ میں سویرے سے شام تک نظر آتے ہیں تو یہ کہدیں کہ میرا کسی آستانے واستانے سے تعلق نہیں ہے بلکہ میں راستہ بھول گیا ہوں اور لوگوں سے راستہ دریافت کر رہا ہوں۔ ؎

ترے در پہ اس بہانے مرا دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

اس زمانہ کے بعض شاعر کہتے تھے کہ بھئی دُنیا میں سب سے زیادہ مزے اس کے ہیں جس کی محبوبہ اپنی زلفیں بکھرائے اور عاشق کے شانوں کو تکیہ بنائے دن رات اس کے پاس پڑی رہے۔ یقین مانیئے اسے نیند بھی اچھی آئے گی اس کا دماغ بھی خوب چلے گا اور رات بھر جو مزے اُسے اُڑانا ہیں وہ تو اُڑائے ہی گا۔ جیسا کہ خود مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ ع

نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی
جس کے شانوں پر تری زُلفیں پریشاں ہوگئیں

ایک دوسرے صاحب جن کا تعلق اسی پُرانے دَور سے تھا۔ فرماتے ہیں کہ بھائی سب سے آرام کی زندگی وہ ہے کہ اِنسان اپنے سویرے سے شام تک غوطہ میں پڑا رہے اور اُسے کوئی ہشیار نہ کرے۔

بڑے مزے سے گذرتی ہے بے خودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھلائے کہ ہوشیار ہوں مَیں

ایک صاحب قبر میں لیٹے ہیں اور اتفاق سے اُن کا محبوب ان کی تربت پر شمع جلانے پہنچ جاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ اگر تھوڑا بہت زندہ ہوتا تو اُن سے کھڑے کھڑے ملاقات کر لیتا مگر بے بس ہوں کیونکہ انتقال ہو چکا ہے اور زندگی رہی نہیں رہی ہے۔

وہ آئے ہیں لحد پر ......
تجھے اے زندگی پاؤں کہاں

ایک لڑکا: بھئی ایک شعر میری طرف سے سُن لو ہنستے ہنستے لوٹ جاؤ گے۔ اُن کی محبوبہ کوئی جمنا پاری بکری ہے جس کے تھن اتنے وزنی ہو گئے ہیں کہ اُٹھائے اُٹھائے

اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ع

جُھک جاتی ہے چلنے میں کمر بارِ بے پستاں
نازک ہے شجر بوجھ کمر کا نہیں اُٹھتا

دوسرا لڑکا: بھئی میرا بھی ایک شعر سُن لو۔ اس میں ایک عاشق صاحب جو اس بات کے شوقین ہیں کہ چوبیس گھنٹے میں پچیس گھنٹے معشوق ان کی پٹائی کرتا رہے فرماتے ہیں۔ ع

جس روز کسی پر کوئی بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

مقصد یہ ہے کہ جس روز تم کسی کو گدھا مار مارو گے اُس روز تم کو وہ چار چوٹ کی مار یاد آجائے گی جو تم نے کبھی مجھے دی تھی۔

تیسرا لڑکا: ابے میاں ایک شاعر صاحب کا ایک ایسا شعر سُنا دوں کہ تم سب ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاؤ۔ ع

قبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

ہر طرف سے آوازیں۔ واہ واہ واہ ہوا واہ بلکہ پھر واہ ہوا واہ اور مسلسل واہ ہوا واہ۔

وہی لڑکا: بھئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عاشق صاحب کا سلسلۂ نسب عرب کے کسی اونٹ سے ملا ہوا تھا جس کی اطلاع محبوب کو ہوگئی اونٹ چونکہ نیم کی پتی کو بڑے شوق سے کھاتا ہے اس لئے ان صاحب کے مرنے کے بعد ان کی محبوبہ نے ان کی قبر پر نیم کا درخت لگوا دیا تاکہ رات برات جب ان کو بھوک لگے تو نیم کی پتی چاب کر پھر قبر میں پڑے رہیں اور مرنے کے بعد وہ ان کے نشترِ غمزاں سے بچے رہے مگر عاشق صاحب نے

اس شعر کا مفہوم یہ نکلا کہ محبوب نے ان کی عزت اور شہرت کو نصفا نصف کرنے کے لئے ایسا کیا ہے اور نیم کے معنی چونکہ نصف یا آدھے کے ہوتے ہیں اس لئے نیم کا درخت لگانے سے ان کی عزت گھٹ کر آدھی رہ گئی۔

ہر طرف سے تالیاں۔ بھئی محبوبہ نے کیا کمال کی چوٹ دی ہے سالے عاشق کو۔ سالی معشوقہ زندہ باد۔ بھئی کیا کام دکھایا ہے۔

چوتھا لڑکا: بھئی اگر اجازت ہو تو سالے کے مرنے پر ایک دوسرے شاعر صاحب کا ایک شعر میں بھی سُنا دوں۔ ان کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ جس دن سے یہ اپنے محبوب پہ عاشق ہوئے تھے دن رات اپنے نالوں اور فریادوں سے آسمان و زمین سر پہ اُٹھا ہوئے تھے جس کی وجہ سے محبوبہ تو محبوبہ سارے محلہ والے عاجز تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نالہ کرتے کرتے ایک دن ان کا انتقال ہو گیا۔۔ اب مرنے کے بعد قبر سے اپنے محبوب پر احسان جتانے کے لئے لکھ بھیجتے ہیں کہ صاحب چونکہ میں دن رات نالے کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے آپ مجھ سے سخت بیزار تھیں لہذا اب میں نے آپکی پریشانیاں کم کرنے کے لئے سفر آخرت اختیار کر لیا ہے۔ سوچا کہ مر جاؤں تاکہ دن رات کے نالوں سے جو آپ کی سمع خراشی ہوتی ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ لہذا اب مرنے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ اک ذرا سا کفن سرکا کر میرا چہرہ دیکھ لیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ میں نے کیسی چُپ سادھ رکھی ہے اور کس درجہ بے زبان نظر آ رہا ہوں۔

ہر طرف سے واہ، واہ، واہ۔ سالہ مرنے پر بھی ٹائیں ٹائیں باتیں کر رہا ہے۔

درجہ میں شعر و شاعری کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مرزا صاحب آ گئے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے فرمانے لگے۔

مرزا صاحب: مجھے اگر پہلے سے بتا دیا جاتا کہ میری یہ صد سالہ برسی محض

ایک چال ہے اور دُنیا والوں کو محض فریب دینے کے لئے مجھے بُلایا جا رہا ہے تو میں ہرگز ہرگز دوبارہ زندہ ہونے کو تیار نہ ہوتا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرا بڑا احترام کیا جائے گا اور احاطہ کالے خاں میں جس مکان میں میں رہتا تھا اُسے خرید کر ایک عظیم الشان محل کی شکل دے دی جائے گی، وہ سارا کا سارا خیال غلط نکلا۔

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

ایک طالب علم: مرزا صاحب! خیریت تو ہے آج آپ بہت زیادہ افسردہ اور پریشان نظر آرہے ہیں۔

دوسرا لڑکا: معلوم ہوتا ہے کہ اخبار میں احاطہ کالیخاں کے بارے میں جو خبر شائع ہوئی ہے اُسے پڑھ لیا ہے۔

تیسرا لڑکا: کیا مرزا صاحب کے بارے میں کسی نے کوئی خبر چھاپ دی ہے؟

وہی لڑکا: ابے! نہیں مرزا صاحب کے بارے میں نہیں بلکہ مرزا صاحب کے اُس مکان کے بارے میں ہے جو احاطہ کالے صاحب میں واقع ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے غالب کے پرستار اُسے خرید کر ایک تاریخی شکل دینے والے تھے مگر اب بتایا گیا ہے کہ چونکہ مرزا صاحب کے پرستاروں میں نہ تو کوئی شخص اُسے خرید کر مرزا صاحب کی یادگار بنانے کو تیار ہے اور نہ کسی انجمن نے اس کے لئے کوئی درخواست بھیجی کہ وہ اُسے اسی حالت میں رکھنا چاہتی ہے جس حالت میں وہ ہے۔

چوتھا لڑکا: مگر اس سے پہلے تو یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ اُس مکان کو خرید کر، مرزا صاحب کی یادگار قائم کی جائے گی اور محکمۂ آثارِ قدیمہ اس کو اپنی نگرانی میں لے لے گا۔ اور اُسے اتنا خوب صورت بنا دے گا کہ باہر کے سیّاح اُس کے اسی طرح فوٹو لیں گے جس طرح تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد کے فوٹو لیتے ہیں۔

پانچواں لڑکا: اجی مرزا صاحب آپ کو تو پہلی بار چرکہ دیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کا

اُردو داں طبقہ تو بائیس سال سے یہ چڑ کے بازی دیکھ رہا ہے۔ جب اُن کو اردو داں طبقے کو بے وقوف بنا کر ان کے ووٹ لینا ہوتے ہیں اس وقت یہ اپنی ولدیت کی جگہ اُردو داں کا نام لکھوانے کو تیار ہو جاتے ہیں اس کے بعد جب مطلب نکل جاتا ہے تو اپنی اصالت پر اُتر آتے ہیں۔

ساتواں لڑکا: مرزا صاحب! یو۔پی میں آپ کی صد سالہ برسی سے پہلے درمیانی مدّت کے الکشن رکھے گئے ہیں۔ ان میں کہیں آپ کا مجسّمہ نصب کرایا جا رہا ہے، کہیں مشاعرے اور کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ اور کہیں تمثیلی مشاعرے ہو رہے ہیں، اور دُنیا والوں کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ ان اکھاڑے بازوں کو دُنیا کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ اُردو زبان سے محبت ہے۔ مگر ذرا الکشن ختم ہو جانے دیجئے پھر یہی حضرات اُردو کو اپنے گھروں سے کھُرچ کر رکھ دیں گے۔ ان کے مُنہ نہیں ہیں کموڈ ہیں۔ ابھی کل تک یہ آپ کی یادگار بنانے جا رہے تھے اور احاطہ کالے صاحب والا مکان خرید رہے تھے اور دِلّی میں درد غم مل والی پہلی سیٹ جیتنے کے بعد سوچیں گے کہ تماشہ ختم پیسہ ہضم۔ اسی طرح ابھی حال میں یو۔پی میں الکشن جیتنے کے سلسلے میں اُردو کے لئے ہزار سے زبانی وعدے کر رہے ہیں اور الکشن ختم ہونے کے بعد آپ دیکھیئے گا وہی مُنہ جس سے انھوں نے وعدے کئے تھے ایک دم کموڈ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

مرزا صاحب: مگر اب تو نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ نہ مجھے زندہ رہتے بنتا ہے اور نہ مرتے بنتا ہے۔

وہی لڑکا: ابھی کیا ہے۔ ابھی آپ ذرا اپنے جانے کا وقت آنے دیجئے پھر ان کی حالت دیکھیئے گا۔ اس وقت جو آپ کی صد سالہ برسی کے نام پر بڑے سے بڑا چندہ کھائے بیٹھا ہے۔ اوّل تو وہ آپ کو نظر ہی نہیں آئے گا اور دکھائی بھی

پڑے گا تو آپ کو پہچانے گا نہیں۔ ان میں سُنا ہے کہ بہت سے جھنڈی بازوں کو جھنڈی بازی میں اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ دو ایک مکان کھڑے کر لیں گے اور جب رقم معدے سے اُتر ٹخنوں تک پہنچے گی تو آپ کو سفید جھنڈی دکھا دی جائے گی۔

بغل والا لڑکا: (چپکے سے) ابے کیوں مرزا صاحب کو دہلاتے مارتا ہے مرزا صاحب سے کوئی دوسری مزے کی بات کر جس سے وہ بہلتے رہیں ورنہ آج جو اُن کی حالت ہے اُسے دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر سے یہ رات کٹنا مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تو نے ابھی جو پرسوں ایک جدید نظم کہی تھی، وہ سُنا دے۔

تیسرا لڑکا: ابے اُسے سُن کر تو مرزا صاحب یا حق کہہ کر اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔

وہی لڑکا: ابے! سُنا تو پھر دیکھ اللہ کیا دکھاتا ہے؟

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب! آج ہم لوگ چاہتے ہیں کہ کچھ شعر و شاعری ہو جائے اور ہم لوگ کچھ اپنا کلام آپ کو سُنائیں اور خود آپ کی زبان سے آپ کا کلام سُنیں۔

مرزا صاحب: ضرور ضرور!

پہلا لڑکا: مرزا صاحب میں نئے انداز کی شاعری کرتا ہوں، جو زندگی سے اتنی قریب ہوتی ہے کہ آپ سخت پریشان ہوں گے کہ زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور شاعری کا آغاز کہاں سے ہوا ہے؟

مرزا صاحب: یہ کون سی شاعری ہے؟

دوسرا لڑکا: یہ شاعری مرزا صاحب ایسی ہوتی ہے کہ کہنے والا خود بھی اُسے

نہیں سمجھتا۔

مرزا صاحب: کیا مطلب؟

تیسرا لڑکا: مطلب یہ کہ وہ جس زبان میں شاعری کرتا ہے وہ زبان خود نہیں جانتا۔

مرزا صاحب: جب وہ زبان ہی نہیں جانتا تو پھر شاعری کیسے کرتا ہے؟

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب! اس شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تو ہے:

مرزا صاحب: مثلاً

وہی لڑکا: مثلاً میری ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "آہوں کا زچہ خانہ"

مرزا صاحب: کیا فرمایا؟

وہی لڑکا: آہوں کا زچہ خانہ۔

مرزا صاحب: میں نہیں سمجھا۔

وہی لڑکا: ملاحظہ ہو۔ ع

مکڑی کے پیٹ سے ہاتھی کا بچہ نکلا

مار دہلے پہ نہلا

ننگ دھڑنگ

بدھیا کر دو ان سب کو

نس بندی کی کھال

بیٹا بابو لال

کھاد بلاؤ کھاد

بھولا بھالا بندر

رکھو نام سکندر
کان سے گائے
پھر طبلہ اور ستار بجائے
تاک دِھنا دِھن۔ تاک دِھنا دِھن
چلی چھنّا کی اولاد
چینخوں پر بیٹھا آہوں کا گھوڑا
گھوڑی کرے سلام
وعلیکم السلام
توند بڑھاؤ
اُچکو مت جاؤ
چمگادڑ کی مادہ بھاگ
اُڑن کھٹولا لا
گھاس نہ اتنی کھا
مار دے نیولے کے ایک ٹانگ
پی کے سمندر دریا کے گن مسکا
گھاس مگر کچھ لا
بال کی آہیں دیکھ
مچھر کی پیت جھاڑیں
خر مستی مت کر
بنڈل بیڑی کا لا
پی لے دھکا دھک

بندر کی اولاد

مکڑی کے پیٹ سے ہاتھی کا بچہ نکلا۔

لڑکا: مرزا صاحب یہ میری وہ نظم ہے جس سے شہرت یہاں سے بمبئی، حیدرآباد اور پٹنہ ہوتی ہوئی پاکستان پہنچ چکی ہے اور کچھ عجب نہیں جو اِس درمیان میں اور زیادہ آگے نکل گئی ہو۔

مرزا صاحب: کیا فرمایا آپ نے؟

وہی لڑکا: فرمانے سے پہلے میری دوسری نظم جو اب بہت مشہور ہونے والی ہے ملاحظہ ہو۔

بغل والا لڑکا: ابے کہیں اپنی چار ہارس پاور والی نظم نہ سُنا دینا، جو مرزا صاحب کو یہاں سے اسپتال جانا پڑے۔

وہی لڑکا: دو ہارس پاور والی سُنا دوں۔

پہلا لڑکا: نہیں بے! اُسے بھی مرزا صاحب برداشت نہیں کر پائیں گے

ایک دور کی آواز: ابے اُتار دے پورا ادب برائے زندگی مرزا صاحب کے سینے میں۔ روز روز مرزا صاحب کہاں ہاتھ لگتے ہیں۔

وہی لڑکا: ابے چلنے دے! جو کچھ ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا۔

مرزا صاحب: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کی پہلی بکواس سُن کر ابھی تک میرا دل قابو میں نہیں ہے۔

لڑکا: مرزا صاحب! ملاحظہ ہو۔ اِس نظم کا عنوان ہے "آہوں کے نشتر غمزے"۔

بغل والا لڑکا: ابے کیوں مرزا صاحب کو زہر دے رہا ہے۔ اگر وہ تیری نظم سُن کر گزر گئے تو سالے حکومت ۳۰۲ میں تجھ پر خون کا مقدمہ قائم کر دے گی۔

یہ نظمیں سُننے والوں کے ہاتھ پاؤں دیکھ کر پڑھی جاتی ہیں۔ یہ سالے کوئی پُرانے دقیانوسی شاعروں کی نظم یا غزل ہے کہ جس کے سامنے جو چاہا پڑھ دیا۔ نہ سامعین کی تندرستی دیکھی اور نہ سُننے والوں کے ہاتھ پاؤں۔

چوتھا لڑکا: اچھا تو ایسا کرنا کہ ہر لائن پڑھنے کے بعد مرزا صاحب کے چہرے کو دیکھتے رہنا تاکہ مرزا صاحب کی تندرستی پر اثر نہ پڑے۔

وہی لڑکا: اچھا مرزا صاحب ملاحظہ ہو، اس نظم کا عنوان ہے "آہوں کے شتر غمزے"۔

مرزا صاحب: (نحیف آواز سے) کیا فرمایا؟ (مرزا صاحب کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے)

ایک لڑکا: ذرا سنبھل کر پڑھنا۔ مرزا صاحب کا چہرہ زرد ہو چلا ہے۔

وہی لڑکا: عرض کیا ہے ع

اونٹ کی بولی بول

بھینس کے انڈے کھول

ہینٹ کے بندھن باندھ

ایک آواز: ذرا رُکے ہوئے۔ مرزا صاحب گھبرا رہے ہیں۔

دوسری آواز: کوئی حرج نہیں آگے پڑھو۔

وہی لڑکا: نیولے کا چھوٹا لونڈا

آہوں کی راہوں پر بیٹھا

بانس کے اندر جھینگر

چونچ میں ڈالے چونچ

ایک آواز: مرزا صاحب کانپ رہے ہیں۔ تھوڑی سی دیر رُک جا۔

(وقفے سے)

وہی لڑکا: دیکھ یہاں پر آ

اندر بھیتر، بھیتر اندر

آنکھ سے موتی رول

ڈھول کے اندر پول

اِدھر کو گردن موڑ

ہاتھ نہ اپنے چھوڑ

ایک آواز: ذرا رُکے ہوئے۔ مرزا صاحب کانپ رہے ہیں۔

وہی لڑکا: بھنور کی چیخ پہ بیٹھا نالہ

برگد کی بہن سے بولا

چھینک کے اندر بیٹھ

پینٹ کے اوپر لیٹ

دوسری آواز: کوئی لڑکا مرزا صاحب کے پاس جاکر اُنھیں سنبھالے رہے ان کی گھبراہٹ بڑھ رہی ہے (ایک لڑکا اُٹھ کر مرزا صاحب کے پاس پہنچ جاتا ہے اور ان کی نبضوں پہ ہاتھ رکھ کر) ہاں جلدی جلدی سُناؤ۔

وہی لڑکا: (تیزی سے)

ٹینی مرغا ناچ کے بولا

تال ہے چھوٹا نیل گگن کا

بھوکی آندھی دوڑی

دیکھ وہ بچھ کھوپڑ کا پدّا

باندھ رہا ہے دھوتی

پپیا کی بولی بول
گگرڈوں کوں پر بیٹھ رہی ہیں
آوازیں
پکھ پکھ مرغی کی آہیں
بھینس کے بچے پال
میرا جُوتا دِل پر لیٹا
کا نکھ کے بھاگا جنگل
جنگل میں منگل
چاند کی لڑکی بھینس کا پڑوا
ننگی دھوبن دیکھ رہی ہے
کاٹ کی دھوتی باندھ
لیٹ یہاں پر لیٹ

ایک آواز: اور تیزی سے پڑھ ۔ مرزا صاحب میں قوتِ برداشت بالکل کم ہو رہی ہے ۔

وہی لڑکا: ہاتھ وہاں پر رکھ
سینہ مت کھول
ورنہ کچھ ٹٹول
آہیں سرپٹ بھاگ رہی ہیں
لغزش بیٹھی ہانپ رہی ہے
ڈال دے اس کے ہار
کہاں ہے بیت المال

کاٹ نہ اُس کے گال
کردے آرم پار
بھینچ کے آہیں
سینہ تانے
جوبن پر نکھار

مرزا صاحب کے پاس والا لڑکا (جو مرزا صاحب کی نبضوں پر ہاتھ رکھے ہے)
ابے بس کر مرزا صاحب پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

وہی لڑکا: بس بس ملٹنگ پوائنٹ پر آرہا ہوں — دو لائینیں اور رہ گئی ہیں۔

باندھ دے لیکر اپنا انگوچھا
جھاڑ دے ایک ایک پیار
جدّت کے تحصیلدار

مرزا صاحب کے پاس والا لڑکا: ابے مرزا صاحب بے ہوش ہو گئے۔ اب کیا ہوگا؟

(سب لڑکے مرزا صاحب کی میز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں)

ایک لڑکا: (زور زور سے) مرزا صاحب! نظم ختم ہو گئی۔ آنکھیں کھولیئے مرزا صاحب للہ آنکھیں کھولیئے ورنہ ہم سب دھر لیئے جائیں گے۔

دوسرا لڑکا: سالوں نے چار ہارس پاور کی نظم دو ہارس پاور کی کہہ کر پڑھ دی اب کیا ہوگا؟

تیسرا لڑکا: ابے کسی ڈاکٹر کو بلا۔

چوتھا لڑکا: (دو لڑکے مرزا صاحب کو اُٹھا کر) فل اسپیڈ سے پنکھا کھول دو بھی

ٹھیک ہو جائیں گے۔

(مرزا صاحب کو ہال میں پنکھے کے نیچے لٹا دیا جاتا ہے۔ اُن کا جسم پسینے سے شرابور ہے۔)

چھٹا لڑکا: گھبراؤ نہیں، نبض ٹھیک چل رہی ہے۔

ساتواں لڑکا: (اس لڑکے سے جو اپنی نظم سُنا رہا ہے) ابے پہلے سے منع کر رہا تھا کہ یہ نظم مرزا صاحب برداشت نہ کر پائیں گے۔

(مرزا صاحب کے مُنہ سے کراہنے کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں)

ایک لڑکا: مرزا صاحب ہوش میں آ رہے ہیں۔

چوتھا لڑکا: خبردار، اب کوئی ایسی نظم کا مرزا صاحب کے سامنے نام نہ لینا، ورنہ مرزا صاحب ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جائیں گے۔

مرزا صاحب (آنکھیں کھول کر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے) مجھے میری قیام گاہ پر پہنچا دو۔ بندروں کی آوازیں پھر آ رہی ہیں۔

ایک لڑکا: نہیں مرزا صاحب! آپ گھبرائیں نہیں۔

مرزا صاحب: مجھے فینس پر بٹھا کر گھر پہنچا دو۔

تیسرا لڑکا: اچھا مرزا صاحب۔

پانچواں: مرزا صاحب اپنے زمانے کی فینس یاد کر رہے ہیں۔

ایک لڑکا: حکیم عبدالحمید صاحب کو ٹیلیفون کر دو کہ مرزا صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی ہے کار بھیج دیں۔

(لڑکوں میں بحث شروع ہو جاتی ہے)

ایک لڑکا: ابھی تین چار روز ہوئے جب قاضی سجاد صاحب مرزا صاحب کو الہ آباد کا ایک رسالہ پڑھنے کو دے آئے تھے۔ اس میں تمھارے کوئی ساتھی شاطر صدّی ہیں

ان کی ایک نظم چھپی تھی جس کے پڑھنے کے بعد مرزا صاحب پر ایک غشی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی بڑی خیریت ہوئی کہ اس وقت عتیق صدیقی سکریٹری غالب اکیڈمی مرزا صاحب کو ما۔ اللحم کی دو تین بوتلیں جو حکیم صاحب نے ان کے روزمرّہ کے استعمال کے لئے بھیجی تھیں، دینے پہنچ گئے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً مرزا صاحب کو گھبرا کر پوری ایک بوتل پلادی جس سے ان کی وہ کیفیت زائل ہوگئی۔

دوسرا لڑکا: بھائی اگر سچ پوچھو تو یہ نظمیں اِن پرانے ادیبوں کو مارنے کے لئے ایجاد ہوئی ہیں۔ جو ادب برائے زندگی کے قائل ہیں مگر اِدھر سُنا ہے بعض جدیدیوں نے ان میں کچھ ایسی ٹرِک پیدا کردی ہے کہ اب انھیں سُن کر پرانے ترقی پسند ادیب بھی اگر مرتے نہیں تو بے ہوش ضرور ہوجاتے ہیں۔

تیسرا لڑکا: یار! ایسی دو تین نظمیں میں نے بھی کہی ہیں مگر میں ان کے معنی نہیں سمجھ پایا تو میں نے سوچا کہ انھیں کسی ایسے رسالے میں بھیج دیا جائے جو ایسی نہ سمجھنے والی نظمیں چھاپتا ہو۔ چنانچہ میری دونوں نظمیں ایک رسالہ میں چھپ گئیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک دوست کی طرف سے اُس رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کو خط لکھا کہ آپ نے اُن نظموں میں کیا خوبی دیکھی ہے جو چھاپ دیا تو اُس کا جواب اُنھوں نے یہ دیا کہ اس کا علم تو خود اُنھیں بھی نہیں۔

پانچواں لڑکا: میں سمجھتا ہوں کہ قدمچہ پر بیٹھ کر جو بچے باتیں کرتے ہیں۔ یہ نظمیں ان کی باتوں کی ایک تربیت یافتہ شکل ہے۔

چھٹا لڑکا: ہوسکتا ہے کیونکہ ایسی ہی نظموں کے دو مجموعے تو میرے بھی شائع ہوچکے ہیں۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ ابھی تک ان کو کورس میں شامل نہیں کیا گیا۔

ساتواں لڑکا: بھائی جب تک یہ سالے پڑھے لکھے پُرانے ادیب زندہ ہیں

اس وقت تک ہم لوگوں کی دال گلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھو جب سے اُردو سمجھنے والے ناپید ہونا شروع ہوئے ہیں تب کہیں جاکر دو چار رسالے ایسے نکل پائے ہیں جو ہم لوگوں کا کلام چھاپ رہے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی مشاعرہ ہم لوگوں کے کلام کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں دس روپیہ چندہ دے کر جب میں نے شعراء کی فہرست میں اپنا نام درج کرایا اور اپنا کلام سُنایا تو بڑی دیر تک نہایت شرمناک الفاظ ہوا میں گونجتے رہے اور چونکہ ٹکٹ کا مشاعرہ تھا اس لئے ختم مشاعرہ پر بعض جاہلوں نے مجھے دور تک رَپٹانے کی بھی کوشش کی۔

آٹھواں لڑکا: اب گھبرانے کی بات نہیں اگر ایک دو مرتبہ پھر کانگریس جیت گئی تو دیکھنا اُردو کے شاعروں میں ہم ہی ہم نظر آئیں گے۔ (اسٹیج کی طرف دیکھ کر) معلوم ہوتا ہے مرزا صاحب کی موٹر آگئی ہے اور وہ جا رہے ہیں۔ سب لڑکے مرزا صاحب کو موٹر پر رخصت کرکے جاتے نظر آتے ہیں۔

چھٹا دِن

مرزا صاحب کے آنے میں دیر ہے۔ طلبا میں مرزا صاحب کے گذشتہ روز بے ہوش ہو جانے پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

ایک لڑکا: اُس روز تو مرزا صاحب کے مرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اگر اُس نظم میں دو چار لائنیں اور ہوتیں تو مرزا صاحب ڈھیر ہو چکے ہوتے

دوسرا لڑکا: مگر وہ نظم تو بڑی ہلکی پھُلکی تھی۔ میرے خیال میں میں نے جو ایک نظم ابھی حال ہی میں لکھی ہے اگر مرزا صاحب اِسے سُن کر عالم بالا کے شعراء کو بھی سُنا دیں تو ان سب کا وہاں بھی انتقال ہو سکتا ہے۔ اِس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لکھی تو جا سکتی ہے مگر بجائے زبان کے پڑھنے کے اُسے آنکھوں سے سُن سکتے ہیں اور کانوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

تیسرا لڑکا: تو سُناؤ نا۔

وہی لڑکا: ارے بھئی کہہ دیا وہ سُنانے والی نہیں ہے۔

دوسرا لڑکا: تو دکھا ہی دو۔

وہی لڑکا: دیکھو وہ نظم میں نے اِس طرح لکھی ہے۔ (کاغذ پر مندرجہ ذیل نقشہ بنا کر) ملاحظہ ہو۔

(:(ج:ج).

پہلا لڑکا: ابے یہ کیا بنا دیا؟

دوسرا لڑکا: یہ ہے کیا؟

وہی لڑکا: اس نظم میں ب اور ت کی پیٹھوں کو آمنے سامنے رکھ کر بیچ میں جیم کو کھڑا کر دیا گیا۔ اس میں جیم ب اور ت کا راجہ ہے۔

دوسرا لڑکا: تو اس کے معنی کیا ہوئے؟

وہی لڑکا: معنی کی ذمّہ داری پڑھنے والے اور سننے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔

تیسرا لڑکا: میں نے ایک ایسی نظم کہی ہے جو صرف موتی ہے۔

پہلا لڑکا: کیا مطلب؟

تیسرا لڑکا: مطلب یہ کہ اس کا عنوان ہے "بھوں"۔

پہلا لڑکا: اور اس کے آگے والے مصرعے کیا ہیں؟

تیسرا لڑکا: مصرعے کیسے؟ "بھوں" اس کا عنوان بھی ہے اور یہی ایک لفظ اس کے سارے مصرعے ہیں۔

پہلا لڑکا: ابے حد کر دی۔

تیسرا لڑکا: اس میں حد کی کیا بات۔ ایسی نظم لکھ دی ہے کہ کچھ لوگ تو لاحول ولاقوۃ کہہ کر اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیں گے۔ کچھ اس آواز کو "اردو زبان" کی ہندوستان میں جو حالت ہے اس طرف لے جائیں گے۔ اور کہیں گے کہ "بھوں" سے مراد ہے کہ اردو سارے ملک میں "بھوں بھوں" کر کے رو رہی ہے اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا ہے، اور "بھوں" کا تیسرا مطلب ہے کہ موٹر ڈرائیور اپنے ہارن سے "بھوں بھوں" کر رہا ہے مگر لوگ رستہ روکے کھڑے ہیں۔

چوتھا لڑکا: اور ... اگر آپ اس کا مطلب ادب برائے زندگی کی طرف لے جائیں تو "بھوں" ایک گالی بھی ہو سکتی ہے اور جہاں تک گالی کا سوال ہے وہ ایک اضافی چیز ہے۔ اس لئے جب آپ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں تو پھر گالی گالی نہیں رہتی وہ ادب عالیہ بن جاتی ہے۔

تیسرا لڑکا: اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ادب برائے ادب کے جو لوگ قائل ہیں وہ سب بکواس کرتے ہیں۔

چوتھا لڑکا: کیوں نہیں؟ ادب برائے ادب دانوں کی یہ دھاندلی نہیں تو اور کیا ہے کہ جسم میں جتنے اعضاء ہیں ان میں کچھ کے حرکات و سکنات کا نام لیتے ہیں اور کچھ کا نام ہی سرے سے اڑا جاتے ہیں۔ اور جب ادب برائے زندگی والے ان کا بے تکلفی سے نام لیتے ہیں یا ان کے کارہائے نمایاں کا ذکر کرتے ہیں تو آپ شرم و حیا سے گردن جھکا لیتے ہیں۔ یہ ان اعضاء کی حق تلفی نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر آپ ہاتھ میں تلوار لے کر کسی دشمن کی گردن مار دیتے ہیں تو اپنے ہاتھ کی تو تعریف کرتے ہیں اور اسی جسم کا ایک حصہ اگر وہی کام انجام دیتا ہے تو آپ اس کا زبان سے نام تک لیتے شرماتے ہیں ——— اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس کو پی چاہیں وہی سہاگن ——— ادب برائے زندگی والے اسے کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں ......

ہم تو اپنی نظموں میں اُن کے کارہائے نمایاں کو اچھالتے ہیں اور بلا کسی جھجک کے ان کا نام لے کر ان کی ہمت

افزائی کرتے ہیں۔ اگر ہم ہمت افزائی نہ کریں گے تو اُن بے زبانوں کی اور کون سُنے گا۔ اس معاملہ میں ہم محمود وایاز یا تذکیر و تانیث کے قائل نہیں۔ اب ہمارے ہی ایک ساتھی جو جدیدیوں میں خلیفہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اپنی نظموں کے عنوان کے معاملے میں بھی بڑے فیاض اور مادرزاد جدت پسند ہیں اپنی ایک نظم جس کا عنوان ہے "شہوت" فرماتے ہیں۔ ع

"بھدی
کیچڑ میں
لتھڑی ہوئی
بھینس ہے
پھر بھی میں
اس کے
کالے نتھنوں
میں
دودھ کا
ایک قطرہ بھی
رہنے نہ دوں گا"

پہلا لڑکا: اب اس کا عنوان ہی پڑھ کر بڑے بڑے ادب برائے ادب والوں کے وضو ساقط ہو گئے ہوں گے۔

دوسرا لڑکا: بھئی ہم تو چاہتے ہیں کہ جن حالات میں نظم کہی جائے وہ حالات نظم کے پنڈے سے بھی واضح ہو جائیں۔ مثلاً اس بے پناہ آزادی

کے زمانہ میں جب گرانی نے انسانوں کو کچالو کا تنکا۔ بنا دیا ہے اور ملک میں سیدھی لباس کا زور ہے ہماری نظموں کو کاغذ پر اس طرح لکھا جائے کہ دیکھتے ہی پتہ چل جائے کہ ناظم کس مرض کا شکار ہے (کاغذ پر نظم لکھ کر) ملاحظہ ہو، نظم جس کا عنوان ہے۔ "دو سائے" اب اُس کا چال چلن اور کینڈا ملاحظہ ہو۔ ع

بے
شک
ا
ن
س
ا
ن
بد
ل
جا
تا
ہے
تنگ پتلون کی
مُہری میں پھنسا
اک
انسان
یعنی ٹٹنس کا مریض

اکڑی
ہوئی
دوشیزہ
جانتے نہیں ہو کہ
ملبوس نہیں
فرق
نہیں
ہائے رے عشق
کھڑے

پیر
کا

روزہ
جیسے
حسن بیٹھے تو
ہر اک
راز
عیاں
ہو
جائے
عشق بیٹھے تو ہر اک درد

ز

ند

گی

تنگ

ہوئی

جفت

ہوئی

چُست ہوئی

تنگ ہونے

لگی

ہر چیز

مگر نظم ہوئی

خیال!

چاہے تحریکِ ادب

ہو

یا غمِ ذات مرا

غم کا حلیہ

تو

بہت

ٹائٹ

ہے

مجھکو

رو لینے دو

ایک
تحریکِ
ا
د
ب
بیچ
سئے
بو
نے
لگی
ایک
انسان بدل
جاتا ہے۔

تیسرا لڑکا: بھئی اس کی لکھائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری آزادی نے کس درجہ ادب کو تندرستی سے آزاد کر دیا ہے۔ اندر اس کی حیثیت ہمارے آزاد دیس میں ایک پوسٹ مارٹم کرنیوالے یا پیراسا کھینچے ہوئے مُردے کی سی ہو گئی ہے۔ اور پھر اس ڈھانچہ پر شیڈی لباس کیسا چھوٹا نکلتا ہے۔ اس طرح لکھنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جس زمانے کے انسان کے بارے میں یہ نظم لکھی گئی ہے اس انسان کے تمام اعضاء پکار پکار کر کہتے معلوم ہوتے ہیں کہ حضرت! ہم یہاں ہیں۔

چوتھا لڑکا: بھائیو! جہاں ستّر ناس وہاں ساڑھے ستّر ناس، میں تو

کہوں گا کہ جدیدیت کے تو یہ معنے ہیں کہ اگر آپ کو چہرہ لکھنا ہے تو اُسے آپ اس طرح لکھیں ۔

○ (۱)

(۲)

(۳)

(۴)

(۵)

(۶)

(۷)

(۸)

اب دیکھئے نمبرا:- کھوپڑا ہوا - کہئے ہاں

نمبر۲- بال

نمبر۳- آنکھیں

نمبر۴- ناک

نمبر۵- ہونٹ یا دہانا

نمبر۶- ٹھوڑی

نمبر۷- دونوں کان

نمبر۸- گردن

دیکھئے کھر پور چہرہ بنا کہ نہیں ؟

(ہر طرف سے تالیاں پیٹنے لگتی ہیں اور "جدیدیت" زندہ باد کا شور بلند ہوتا ہے)

ایک آواز : قسم قرآن کی اتنی زیادہ آزادی دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے کہ

کپڑے، لتوں کو ایک دم اُتار کر مادر زاد ننگا ہو جاؤں ۔ کیا پوشاک شکن نظم ہے ۔

کئی آوازیں: ذرا جذبات کو روکے ہوئے۔

دوسری آواز: اُردو زبان ۔۔ زندہ باد

تیسری آواز: ہماری آزادی ۔ زندہ باد

چوتھی آواز: ادب کی موت ۔ پائندہ باد

پانچویں آواز: ننگا پن (بہت سی آوازیں) لے کے رہیں گے ۔

ایک لڑکا: بھئی مجھے اس بات پہ بہت رونا آتا ہے کہ یہ الف سے بڑی "ے" تک کے حروف جس نے ایجاد کئے ہیں۔ اُس نے الف کو جو اُس کی پیدائش کے وقت سے کھڑا کیا ہے تو اُسے اب تک بیٹھنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی لہٰذا ہم لوگوں کی رائے ہے کہ اُسے بیٹھنے اور لیٹنے کی اجازت ملنی چاہیئے اور الف جتنی دیر خوشی خوشی کھڑا ہے اُسے کھڑا دکھایا جائے اور جب اُسے بیٹھنے کی اجازت دیجائے تو اُس کو چار چھ گُنا چھوٹا لکھا جائے اور جب اس کو لیٹا ہوا دکھایا جائے تو اُس کی شکل "ـــ" ہونا چاہیئے۔ مقصد یہ کہ بجائے اُسے اُتر دکھن دکھانے کے پورب پچھم دکھایا جائے تاکہ اُس حالت میں لوگ جب الف کو دیکھیں تو کہیں الف اس وقت سو رہا ہے ۔ کہ

الف کے سر پہ تم چپکے سے بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

دوسرا لڑکا: اور میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں "ب" کی نیند کا بھی خیال رکھا جائے اور جب اُسے اوندھا دیا جائے تو سب کہیں کہ "ب" اس وقت اپنے منہ کے بل اوندھی سو رہی ہے ۔

تیسرا لڑکا: بنا کر بتاؤ۔

وہی لڑکا: (اس طرح بنا کر بتاتا ہے)

(سب لڑکے تالیاں بجا کر) جدیدیت زندہ باد۔ اوندھے ہو کے رہیں گے اوندھا پن لے کے رہیں گے۔

ایک زور کی آواز: ارے سالوں کیوں کسی مرے ہوئے کو مار رہے ہو۔ گھبراؤ نہیں یہ نام نہاد کانگریسی اگر اب کی الیکشن جیت گئے تو جتنی رہ گئی ہے وہ بھی کاٹ لیں گے۔ میرا مطلب ہے زبان ۔۔ اور اُردو کا بیڑہ غرق کر دیں گے۔

(ہر طرف سے قہقہے)

دوسری آواز: سب سالوں خاموش ہو جاؤ ۔۔ دیکھو مرزا صاحب آ رہے ہیں۔

تیسری آواز: بھئی آج مرزا صاحب سے ان کے بعض اشعار کا مطلب پوچھا جائے گا۔ جو ابھی تک ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے ہیں۔

اتنے میں مرزا صاحب عصا ٹیکتے ہال میں داخل ہو جاتے ہیں اور سب لڑکے تالیوں سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ایک لڑکا: کہئے مرزا صاحب اب طبیعت ٹھیک ہے نا

دوسرا لڑکا: کل تو آپ بالکل انتقال کی منزل میں آ گئے تھے۔

مرزا صاحب: ہاں رات جب میری طبیعت پھر خراب ہونے لگی تو روسی سائنسدانوں نے تین تولے گیس دے کر سو رہنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آج سویرے سے طبیعت بڑی چاق ہے۔

ایک طالب علم: مرزا صاحب! آج ہم آپ کے اُن اشعار کے معنے آپ ہی سے پوچھیں گے جو ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔

مرزا صاحب: ضرور ضرور

دوسرا طالب علم: مرزا صاحب آپ نے جو یہ شعر کہا ہے۔ ع

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

کیا اس میں کوئی تلمیح ہے اور اس میں پوچھنے والا کون ہے؟

مرزا صاحب: بیٹا! مجھے بڑا افسوس ہے کہ میرے بہت سے اشعار جن میں تلمیح ہے اس کے معنے میرے کلام کی شرح کرنے والوں نے بالکل ہی غلط لکھے ہیں ان ہی شعروں میں ایک یہ شعر بھی ہے جس کے معنے تم مجھ سے پوچھ رہے ہو۔

وہی لڑکا: تو اس میں تلمیح کیا ہے؟

مرزا صاحب: یہ شعر ایک ایسے حادثہ سے متعلق ہے جو جتنا افسوسناک ہے اتنا ہی میرے لئے شرمناک ہے۔

وہی لڑکا: تو مرزا صاحب وہ تو ہم بھی سُنیں گے۔ (سب لڑکے) ہم سب سُنیں گے۔

مرزا صاحب: تم نے میری زندگی کے حالات تو مختلف کتابوں میں پڑھے ہی ہوں گے بلکہ وہ میرے خطوط جو زندگی میں میں نے اپنے دوستوں کو لکھے تھے اور جن کی اشاعت کا مجھے کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا وہ بھی بعض ستم ظریفوں نے شائع کر دیئے ہیں ان خطوط کو پڑھ کر تم نے اندازہ کیا ہوگا کہ میں نے زندگی میں جو کچھ بھی کیا وہ اپنے دوست واحباب سے من وعن

بیان کردیا اور تاعمر میرا ظاہر و باطن ایک رہا چنانچہ اس شعر میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یوں ہے کہ جب غدر میں مجاہدین وطن کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوگئی اور اندھا دھند گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میرے کسی دشمن نے حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اُنکے کان بھرے کہ میں بھی بغاوت کرنے والوں میں شریک تھا اور اس سکّہ کو مجھ سے منسوب کیا جو بادشاہ وقت ابوظفر کی شان میں کہا گیا تھا چنانچہ اس کی پاداش میں مجھ سے بازپُرس ہُوئی اور میری پنشن ضبط کرلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایک ایک پیسہ کو محتاج ہو گیا۔ ان حالات میں مرتا نہ تو کیا کرتا میں اِدھر اُدھر سے قرضوں میں بندھ گیا اور مجبوراً مجھے مغلیوں سے بھی قرض لینا پڑا مغلیوں کا معاملہ آپ جانتے ہیں کہ وہ قرض خواہ کا کفن تک گھسوٹنے میں دریغ نہیں کرتے چنانچہ جب اُن کا قرض بار بار کے تقاضوں کے بعد بھی میں ادا نہ کرسکا تو ایک دن دوپہر کو جب میں حوض قاضی سے گذر رہا تھا ایک مغلیہ اس درجہ گستاخی پر اُتر آیا کہ میرے سینہ پر سوار ہوگیا اور میرے گرد ایک مجمع لگ گیا۔ اتفاق سے اُسی وقت میری ڈومنی حوض قاضی سے بازار سیتا رام ترکاری خریدنے جارہی تھی اُس نے جو مجمع لگا دیکھا تو گھُس پِل کر وہ بھی دیکھنے لگی کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ جب اسکی نگاہ مجھ پر پڑی اور اُس نے غالب غالب کہہ کر چلاّنا شروع کیا تو فی البدیہہ میں نے یہ شعر پڑھا ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

کیونکہ باوجود اسداللہ خاں غالب ہونے کے اُس وقت مغلیہ مجھ پر

غالب تھا لہذا میں نے گھبرا کر لوگوں سے دریافت کرنا شروع کیا کہ ان حالات میں للہ بتاؤ کہ میں کیا کہوں ۔ اگر میں کہتا کہ میں غالب ہوں تو کوئی شخص اس غلط بیانی کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا جبکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ صریحاً مغلیہ غالب سوار ہے۔

(لڑکے قہقہے لگانا شروع کرتے ہیں)

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ کے دیوان میں ایک شعر یہ بھی تو ہے۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس کے کیا معنے ہیں؟

مرزا صاحب: ارے بھئی اس کے معنے یوں سمجھو کہ میں انگریزوں کے زمانہ کی وزارت کا مقابلہ تمہارے زمانہ کی وزارت سے کر رہا ہوں — انگریزوں کے زمانہ میں وزراء کا جو رعب وداب اور مرتبہ عوام کی نظروں میں تھا وہ اس زمانہ میں باقی نہیں ہے — اور جمہوری نظام میں ایک معمولی درجہ کا چمار بھی وزیر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اس بات کا شکوہ ہے کہ اب تو جس کو دیکھئے وزیر بنا نظر آرہا ہے اور ہر وہ شخص جس کو کاٹ پیچ کی باتیں آتی ہیں اور دولت اور عہدہ کا لالچ ہے کرسیٔ وزارت پر نظر آرہا ہے اور جو لوگ حقیقتاً وزیر ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ بے وقعت اور مارے مارے پھر رہے ہیں — لہذا جس طرح بالہوسوں کی حرکات سے سچے عاشقوں کی لوگوں کی نظروں میں کوئی عزت اور وقعت باقی نہیں رہی اسی طرح اس دور کے وزیروں کی حرکات سے وزارت کی عزت خاک میں مل گئی ہے۔

سب لڑکے: بہت صحیح فرمایا مرزا صاحب ۔ اب تو اندھی نگری

چوپٹ راج ہے ۔ نہ جانے سارے کہاں کہاں کے اوّر کھدّر عہدیدار بنے بنے پھرتے ہیں ۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب! آپ کا ایک شعر ہے۔ ؎

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

مرزا صاحب: ہاں یہ شعر بھی میرا ہی ہے اور اس میں بھی ایک تلمیح ہے اور ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق میری بیوی سے ہے ــ میاں شادی بیاہوں میں ایک رسم ہوتی ہے کہ جب دولھا دُلہن کے گھر سلام کرائی کے لئے جاتا ہے تو اس کی سالیاں دولہا کے ساتھ یہ مذاق کرتی ہیں کہ ایک لگن میں پانی بھر کر لاتی ہیں اور اُس میں دُلہن کے پیر دُھلا کر دولھا سے اصرار کرتی ہیں کہ وہ دُلہن کے پاؤں کا دھوون پیئے تاکہ زندگی بھر اس کا فرمانبردار رہے اور اس کے اشاروں پر چلے۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ــ

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جس وقت میری شادی ہوئی ہے اُس وقت میری بیوی کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور وہ مجھ سے کسی قیمت پر شادی کرنے پر رضامند نہیں تھیں مگر ماں باپ نے زبردستی ان کی شادی میرے ساتھ کر دی ــ چنانچہ جب اس رسم کے ادا کرنے کا وقت آیا تو وہ کسی قیمت پر اپنے پاؤں دُھلوانے کو تیار نہ ہوتی تھیں اور بار بار اپنے پاؤں لگن سے نکال لیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ایک نہیں مرزا لاکھ خوشامد کریں اور ماتھا رگڑیں میں ہرگز ان کے چکموں میں نہ آؤں گی۔ آخر جب ان کو معلوم تھا کہ میں کسی قیمت پر ان سے شادی کرنے کو تیار

نہیں ہوں تو انہوں نے کس سے پوچھ کر نکاح قبول کیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی بھر وہ مجھ سے نفرت کرتی رہیں۔

(لڑکے چپکے چپکے باتیں کرنے لگتے ہیں)

ایک لڑکا: تو کیا مرزا صاحب کو انہوں نے پوری زندگی اپنے قریب نہیں آنے دیا۔؟

دوسرا لڑکا: ابے۔ کچھ کچھ آنے دیا ہوگا اور کچھ کچھ نہیں آنے دیا ہوگا ورنہ مرزا صاحب دوسری نہ کر لیتے۔

تیسرا لڑکا: میرے خیال میں تو بالکل ہی قریب نہ آنے دیا ہوگا، تب ہی تو مرزا صاحب کو مجبوراً ڈومنی کو ڈالتے بن پڑا۔

چوتھا لڑکا: اگر بالکل نہیں آنے دیا ہوتا تو کیا مرزا صاحب کے جو سات آٹھ بچے پیدا ہوئے وہ سب کے سب خاکی تھے؟

پانچواں لڑکا: جب بالکل نہ آنے دینے پر مرزا صاحب نے سات آٹھ بچے جھاڑ دیئے تو وہ اگر آنے دیتیں تو شاید مرزا صاحب ان سے پانچ درجن پیدا کرا لیتے۔

چھٹا لڑکا: اور مرزا صاحب یہ شعر تو کچھ عجیب سا ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں۔

مرزا صاحب: کون سا شعر؟

وہی لڑکا: میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

مرزا صاحب: یہ شعر تو میری شادی سے متعلق ہے۔ بات یہ تھی کہ میری بیوی آٹھ سات بہنیں تھیں۔ چونکہ خسر صاحب قبلہ زندگی بھر

بیکار رہے اس لئے ان کے پاس سوائے بچہ کشی کے اور کوئی دوسرا دھندہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب لڑکیاں جوان ہوئیں تو انہیں شادی کی فکر ہوئی مگر اتنی لڑکیوں کے لئے جہیز کا انتظام کرنا کوئی آسان بات تو نہ تھی لہذا ان کو ایک ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو صرف لڑکی پر قناعت کرلے۔ اور جہیز وہیز کا طالب نہ ہو۔

میں چونکہ ان کے گھر آتا جاتا تھا اور شروع سے دل پھینک واقع ہوا تھا اس لئے خسر کی نگاہ اوّل دن سے مجھ پر پڑی مگر میری خوش دامن کو شدید اختلاف تھا کیونکہ میں جسم کا مفلس اور کوئی کام کاج بھی نہ کرتا تھا۔ اس لئے میاں بیوی میں جب میرے بارے میں باتیں ہوتیں تو بیوی یہی کہتیں کہ نہ تو لڑکا پڑھا لکھا ہے اور نہ کوئی کام کاج کرتا ہے پھر کس طرح کوئی اپنی لڑکی کی قسمت اس کے ساتھ پھوڑ دے۔ اس پر میرے خسر صاحب فرماتے کہ یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ غالب میاں کچھ بھی نہیں ہیں مگر یہ بھی تو دیکھو کہ لڑکا مفت ہاتھ آرہا ہے یعنی سوائے لڑکی کے ایک پیسے ایک دھیلے کا طالب نہیں ....۔ اس لئے اگر مفت ہاتھ آجائے تو کیا بُرا ہے۔ گھر کا سودا سلف بھی لادیا کرے گا اور زندگی بھر غلام بنا رہے گا اور لڑکی علیحدہ کام سے لگ جائے گی۔

وہی لڑکا: پھر مرزا صاحب کیا یہ اُمراؤ بیگم وہی تھیں جن کے ساتھ آپ کا اس طرح پر نکاح ہوا؟

مرزا صاحب: نہیں۔ پھر ایک دوسری جگہ میری شادی ہوگئی۔

تیسرا لڑکا: (بغل والے سے) یار اگر وہاں ہوجاتی تو مزے آجاتے مرزا ہر وقت ہاتھ میں تھیلا لٹکائے کدّو اور لوکی کی نبضیں دیکھتے نظر آتے۔

مرزا صاحب: اور میری ایک غزل میں دو شعر اور ہیں جو اسی قبیلے اور اسی خاندان کے ہیں اور میری جوانی سے متعلق ہیں۔

ایک لڑکا: اب حقہ مزے پر آیا ہے۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب وہ دو شعر کون سے ہیں؟

مرزا صاحب: وہ دونوں شعر ایک ہی غزل کے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے۔ ع

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور دوسرا شعر ہے۔ ع

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب ان دونوں اشعار میں کیا تلمیح ہے؟

مرزا صاحب: پہلا شعر جس میں "حکایاتِ خوں چکاں" کا ذکر ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ لوگ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ جوانی اندھی ہوتی ہے اُس میں انسان کو ہر چیز ہری ہری دکھائی پڑتی ہے۔ لہذا عنفوانِ شباب میں میرا بھی یہ عالم تھا کہ منٹ منٹ پر جو لڑکی دکھائی پڑتی تھی اس پہ عاشق ہو لیا کرتا تھا۔ اور اس سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا غرض کہ دن رات سوائے عشقیہ خطوط بازی کے میرے پاس کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ یہ چیز چچا کو بے حد ناگوار تھی چنانچہ دو تین بار انہوں نے خط لکھتے دیکھ لیا اور ہاتھوں کو اس بُری طرح مارا کہ اُنگلیاں لہو لہان ہو گئیں۔ دوسرے چچا کی اس سرزنش پر اسو جہ سے بھی آنکھیں

خون کے آنسو روتی تھیں کہ دیکھئے کس مصیبت سے خون کے آنسو رو رو کر تو میں نے ان کو خط لکھا تھا اُسے بلا وجہ پھاڑ کر رکھ دیا۔ اور یہ خطوط اتفاق سے وہ تھے جو میں نے "دام بخت" کو لکھے تھے جن کا دوسرے شعر میں ذکر ہے اور جن سے اُس زمانہ میں میرا زور دار عشق چل رہا تھا۔ اس شعر میں کاتب نے غلطی سے "دام بخت" کو دام سخت" لکھا ہے۔ جو بالکل ہی غلط ہے اور ان دام بخت صاحبہ کا معاملہ یہ تھا کہ میرے مکان سے ملا ہوا جو مکان تھا اُس میں یہ صاحبہ رہتی تھیں۔ اور حد درجہ پردہ کرتی تھیں اسی لئے میں نے پنہاں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اصل مصرعہ یوں تھا ؎

"پنہاں تھی دام بخت میرے آشیانہ کے"!

یعنی محترمہ دام بخت میرے آشیانہ یعنی مکان کے پاس ایک پردہ نشین خاتون تھیں جن سے میری خط و کتابت ہو رہی تھی۔ دوسرے مصرعے میں کہا ہے "اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے"۔ یعنی میں اُن کو اُڑا کر دوسری جگہ منتقل نہ کر پایا تھا کہ چچا کو اطلاع ہو گئی اور اُنہوں نے پکڑ کر میری شادی اُمراؤ بیگم سے کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے بیوی کا پابند بنا دیا۔

ایک لڑکا: واللہ کمال ہو گیا۔ اگر مرزا صاحب اس شعر کا مطلب نہ بتاتے تو نہ جانے ہم لوگ اس کے مطلب کے لئے کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے۔

مرزا صاحب: ارے صاحب! کسی ایک شعر کو کہا جائے پورے اُردو اور فارسی دیوان میں اس قسم کے اشعار بکھرے پڑے ہیں۔ جو خالص واقعاتی ہیں اور جن کا مفہوم لوگوں نے کچھ کا کچھ سمجھ رکھا ہے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اس شعر کے جن لوگوں نے اپنی اپنی شرحوں میں معنے لکھے ہیں اُن میں "ندیم" سے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ حالانکہ "ندیم" میرے ملازم کا نام تھا۔ اُس زمانہ میں ایک محترمہ سے میرا عشق چل رہا تھا۔ چنانچہ ایک دن ندیم کے ذریعہ میں نے اُن محترمہ کی خدمت میں ایک رقعہ بھیجا تھا کہ اگر زحمت نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے غریب خانہ پر تشریف لے آئیے۔ اور چلتے چلتے ندیم کمبخت سے کہہ دیا تھا کہ دیکھ بیٹا! مجھ کو اپنی جوانی کی قسم ایسا نہ کرنا کہ خط دینے کے بعد اُن پر عاشق ہو جانا ورنہ میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ مگر میری بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ جب ندیم ان کو خط دینے لگا اور ندیم سے اور اُن سے آنکھیں چار ہوئیں تو اُن کے حُسن و جمال سے وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ اُس نے ایک نعرۂ حیدری بلند کیا اور کپڑے پھاڑ کر جنگل چل دیا۔ میں بڑی دیر تک اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ایک شخص نے اطلاع دی کہ وہ آپ کے ملازم ندیم صاحب پاگل ہو کر جنگل میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اس پر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اُن صاحب سے جنہوں نے یہ خبر دی تھی کہا کہ حضت! اب دنیا میں کس پر اعتبار کیا جائے اس عشق بازی نے تو میرے جسم کے رونگٹے رونگٹے کو میرا دشمن بنا دیا ہے۔ اب دیکھئے اس ندیم کمبخت کو جس نے ساری زندگی میرا نمک کھایا اور جس کے ہاتھ میں نے محبوبہ کو خط بھیجا تھا وہ مجھے چرکا دے گیا۔ اب اگر وہ آپ کو کہیں مل جائے تو کہئے گا کہ مرزا صاحب نے تم کو سلام کہا

ہے اور کہا ہے کہ کیوں بچو اس طرح کوئی اپنے آقا کو چونٹ دیتا ہے۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب کمال ہو گیا۔ قسم قرآن کی اُس نے تو گویا چور کے گھر چوری کی۔

دوسرا لڑکا: غاری ہو گئی۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب! پھر کیا وہ محترمہ بھی اُس کے ساتھ نکل گئیں ہیں؟

مرزا صاحب: وہ نکل گئی ہوں یا نہ نکل گئی ہوں اس کے بعد سے وہ مجھے تو کہیں نظر نہیں پڑیں، نکل ہی گئی ہوں گی۔

پانچواں لڑکا: مرزا صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے پسماندگان کو اپنے جوارِ رحمت میں مقام علیین عطا فرمائے۔ آپ گھبرائیں نہیں ایک در بند ہزار در کھلے۔ آپ کو اللہ اس کا نعم البدل عطا کرے گا۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب آپ کی غزل کا ایک مقطع ہے۔ ع

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

مرزا صاحب: ہاں یہ شعر میں نے اپنے انتقال کے بعد قبر میں پہنچکر کہا تھا۔ کیونکہ مجھے خیال تھا کہ میرے مرنے کی خبر جب شہر میں پھیلے گی تو میرے سوگ میں شہر کی ساری دوکانیں بند ہو جائیں گی۔ اسکولوں اور کالجوں میں چھٹی ہو جائے گی، ہر طرف تعزیتی جلسے ہوں گے اور تعزیتی تجاویز پاس ہوں گی مگر اب میں آپ سے کیا عرض کروں کہ میری موت کا دُنیا والوں نے ذرہ برابر اثر قبول نہیں کیا۔ چنانچہ میرے مرنے

کے بعد جامع مسجد کے تمام ہوٹل اور دوکانیں جس طرح کھلی تھیں اسی طرح کھلی رہیں۔ لوگ جس طرح دوکانوں میں اور ہوٹلوں میں بیٹھے انڈے پراٹھے اُڑا رہے تھے اُسی طرح اُڑاتے رہے۔ حد یہ ہے کہ مولوی سمیع اللہ تک کی دوکان پر جو شعرائے کرام کا جمگھٹا تھا وہ اُسی طرح شعر و شاعری کرتا رہا۔ اُردو بازار میں مرغیاں اُسی طرح کٹتی رہیں اور لوگ اسی طرح جامع مسجد کی سیڑھیوں پر تلفے اور حلیم شریف اُڑا اُڑا کر چٹخارے لیتے رہے۔ لہذا آپ ہی انصاف سے کہئیے کہ میرے مرنے پر جو کوئی چوں کرتا تو کسی نے چوں تک نہ کی۔ لہذا کوئی آکر مجھے قائل کرے کہ کون سے کام تھے جو میرے مرنے کے بعد رُکے رہے۔ میری آج تک سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ دُنیا ہے کیا؟

خدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی؟
ہزاروں مٹ گئے باقی وہی رونق ہے محفل کی

ایک طالب علم: مرزا صاحب! واقعی آج کل دُنیا والوں کا خون ایسا ہی سفید ہو گیا ہے۔ میرے والد بھی جب مرے ہیں تو کسی نے اپنی دوکان نہیں بند کی تھی۔

دوسرا طالب علم: مرزا صاحب! آپ کے دیوان میں ایک شعر ایسا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔

مرزا صاحب: بتائیے۔ بتلائیے۔

وہی لڑکا: اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

مرزا صاحب: بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عشق و محبت کا شعر ہے، حتیٰ کہ میرے شاگرد میاں خواجہ الطاف حسین حالی تک جو میرے حالات سے بخوبی

واقف تھے اُن تک نے اس کے معنے سمجھنے میں گچا کھایا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی طبیعت بحال ہوجاتی ہے اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ محبوب کو جب تک عاشق اپنی حالتِ زار اور اس کی جُدائی کا صدمہ نہ بتائے وہ اس کی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کرسکتا۔ اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بعض خوشیوں سے چہرے پر جو بشاشت آجاتی ہے اس سے رنج اور تکلیف کا کوئی نشان اور اثر چہرے پر باقی نہیں ہوتا۔ مگر اس شعر کا اِس مطلب سے کوئی دور کا لگاؤ نہیں ہے۔ بلکہ میرے بہت سے اشعار کی طرح یہ بھی خالص واقعاتی شعر ہے۔ یہ شعر میں نے اُس دن کہا تھا جس دن میری جیب میں ایک دھیلا بھی نہیں تھا اور اندر سے بیگم صاحبہ کی طرف سے مطالبات پر مطالبات چلے آرہے تھے کہ فلاں چیز آنا ہے ڈھما چیز آنا ہے۔ ان مطالبات نے مجھے حد درجہ بدحواس کر رکھا تھا اور ہر مطالبہ پر میرا خون خشک ہوتا چلا جارہا تھا کہ اتنے میں میرے ایک شاگرد رشید مردان علی خاں رعنا جو تحصیلدار تھے اور برابر ایسے آڑے موقع پر میری مدد کرتے رہتے تھے اور بغیر کہے سوپچاس روپیہ آتے ہی نذرانہ کے طور پر پیش کرتے تھے آگئے۔ چنانچہ ان کو دیکھتے ہی ساری افسردگی خوشی میں بدل گئی۔ میرے چہرے پر مسرت کے آثار دیکھ کر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ میری مالی حالت بہت اچھی ہے اور مجھے کہیں سے روپیہ مل گیا ہے چنانچہ وہ بے فکر ہوکر مجھ سے باتیں کرنے لگے، آخر یہ خطرہ محسوس کر کے کہ شاید وہ اس مرتبہ نذر پیش کرنا بھول جائیں مجھے مجبوراً ان سے بتانا پڑا کہ حالت حد درجہ سقیم ہے۔ اس پر اُنہوں نے فرمایا کہ گستاخی معاف ہو میں آپ کے چہرے پر مسرّت کے

آثار دیکھ کر یہ سمجھے ہوئے تھا کہ حالات سُدھر گئے ہیں اور یہ کہہ کر اُنھوں نے نذر پیش کی۔ چنانچہ یہ شعر میں نے اس وقت نظم کیا تھا جس کا مفہوم لوگوں نے کیا سے کیا سمجھ لیا۔

ایک طالب علم: اس کے معنی تو یہ ہُوئے کہ جب دوست احباب یوں ہی محض گپ بازی کرنے آتے ہوں گے تو آپ کو سخت ناگوار ہوتا ہوگا؟

مرزا صاحب: ناگوار کیا ہوتا تھا بلکہ ان سے باتیں بھی کرتا تھا اور جان بھی نکلی رہتی تھی کہ دیکھئے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوتا ہے۔ مگر کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ کسی نہ کسی طرح پر امداد کرنے پہنچ ہی جاتا تھا۔

دوسرا لڑکا: تو مرزا صاحب اب جو آپ عالم برزخ جائیں تو جو ترکیب آپ کو اکبر آباد کے لئے بتائی ہے اُس پر عمل کیجئے گا اور وہاں سے خوب مضبوط ہو کر آیئے گا۔ ورنہ یہاں کسی سے ٹکا ملنا تو بڑی بات ہے آپ کو اُلٹے پائیں تو لوٹ لیں۔ آزادی کے بعد سے یہاں وہ لوٹ مار مچی ہے کہ آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ کے دیوان میں ایک شعر تو ایسا ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں؟

مرزا صاحب: بھئی وہ شعر کون سا ہے؟

وہی لڑکا: ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

مرزا صاحب: یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ دُنیا مردِ مومن کے لئے ایک دوزخ ہے اور جو شخص دُنیا کے مصائب صبر سے برداشت کرے گا اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو اس کا اجر ملے گا۔ جب میں جوان تھا تو دِلّی کے

ہیں، اگرچہ حسین عورتوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ گزرتے تھے مگر اُن میں سے کوئی مجھے چشمِ التفات سے نہیں دیکھتی تھی بلکہ اگر دو ایک کی نظریں مجھ سے چار بھی ہو جاتی تھیں تو وہ ایسا مُنہ بنا کر میری طرف سے آنکھیں پھیر لیتی تھیں کہ جیسے میں ان کو بھنبھوڑ ہی تو کھاؤں گا چنانچہ میں دل ہی دل میں کہتا تھا کہ اچھا جتنا ظلم کرنا ہو کر لو تو سہی جو تم سے جنت میں پہنچکر انتقام نہ لیا ہو۔ اور جنت پہنچکر آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کرکے تم سب کو جلایا نہ ہو۔

وہی لڑکا: تو پھر مرنے کے بعد آپ نے وہاں اُن سے انتقام لیا یا نہیں؟

مرزا صاحب: انتقام ابھی کیسے لیتا۔ ابھی تو میں عالم برزخ میں ہوں۔

وہی لڑکا: عالم برزخ میں بھی تو آپ کو رہتے ہوئے سو سال ہونے آتے ہیں۔

مرزا صاحب: ہاں۔

وہی لڑکا: تو مرزا صاحب اب اگر آپ جنت میں جائیے گا تو چُپکے خاموش پڑے رہیئے گا ورنہ اگر وہاں سے اُن میں سے ایک بھی آپ کے گلے پڑ گئی تو اس سیٹھا تُستلی نہ ہونے والی عمر میں آپ کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اور آپ کے بنائے کچھ نہ بنے گا۔ اور کوئی مدد کرنیوالا بھی آپکو نہ ملیگا کیونکہ سب کے سب....

تیسرا لڑکا: (بغل والے سے چُپکے سے) ابے ہٹ کہاں کی باتیں کر رہا ہے۔ وہ سب بھی تو بوڑھی ہو کر پٹاری کا انگور ہو گئی ہوں گی۔ اگر وہ سب کی سب مرزا کے گلے کا ہار ہو جائیں تو مرزا صاحب کی گرہ سے کیا جائے گا۔ سب کی سب اُتر دکھن بیٹھ کر کے پڑی رہیں گی۔

مرزا صاحب: مگر بیٹا ابھی دیکھو عالم برزخ میں۔ کتنے دن رہنا پڑتا ہے؟
چوتھا لڑکا: اور مرزا صاحب یہ شعر آپ نے کس موڈ میں کہا تھا؟
مرزا صاحب: کون سا شعر؟
وہی لڑکا: ہے کیا جو کس کے باندھیئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
مرزا صاحب: ارے صاحب! میں نے پوری زندگی حسینوں کے عشق میں گذاری تھی اسی لئے میں ان کے ہر رگ پٹھے سے واقف تھا۔ اور مجھے بخوبی علم تھا کہ محبوب کی کمر کا یا تو سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو ان کی کمر اس درجہ پتلی اور باریک ہوتی ہے کہ خوردبین سے نظر آئے تو آئے یوں تو نظر آنے سے رہی۔ ان حالات میں ان کے اوپر اور نیچے کا دھڑ ہوا میں معلق رہتا ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز معدوم ہو تو اس کا بندھنا اور کسنا کیا معنے۔ کمر کسنے کے لئے مصمم ارادہ کرنے کو کہتے ہیں اسی معنے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی حسینہ اپنے عاشق کو قتل بھی کرنا چاہے تو بھی قتل نہیں کر سکتی لہذا اس سے ڈرنا کیا معنے۔ چنانچہ ایک محترمہ نے جب مجھ سے کہا کہ مرزا صاحب میں دیکھتی ہوں کہ میرے جتنے عاشق ہیں ان کی مجھ سے روح فنا ہوتی ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم لوگ اپنی نگاہِ ناز سے ان کو قتل نہ کر دیں۔ مگر آپ بڑے ڈھیٹ ہیں اور آپ مطلق خوف محسوس نہیں کرتے اس پر میں نے کہا کہ آپ اگر قتل کرنا چاہیں تو بھی آپ قتل نہیں کر پائیں گی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کے کمر ہی نہیں ہے آپ قتل کرنے کے لئے کسیں گی کیا۔؟

وہی لڑکا: مرزا صاحب اس مشاہدہ اور سوجھ بوجھ کی تعریف نہیں ہوتی

واللہ کیا ٹکڑا لگایا ہے۔

مرزا صاحب: نہ بیٹا۔ اس لئے کہتا ہوں عشق کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ بھی حلم و دریاؤ ہے۔ یاد رکھو کبھی بھول کر کسی سے عشق نہ کرنا۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب اب ہم لوگ کھڑے گھاٹے عشق کرتے ہیں۔ ایسا عشق نہیں کرتے جو بیماری کی طرح بدن کو لگ جائے۔

مرزا صاحب: اچھا بھائی اب میں بہت تھک گیا ہوں۔ اب جو کچھ پوچھنا ہو وہ کل پوچھ لینا۔

(سب لڑکے تالیاں بجاتے ہیں اور مرزا صاحب کو تالیوں کی گونج میں رخصت کرتے ہیں)

ساتواں دِن

درجہ میں حسب معمول لڑکے جمع ہیں اور مرزا صاحب کی صد سالہ برسی کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

ایک لڑکا: ارے بھئی آج تو مرزا صاحب کی برسی کے سلسلہ میں بڑی پوسٹر بازی ہوئی ہے بستی نظام الدین میں مرزا صاحب کا نام لیکر ایک ایسی فاختہ داغی گئی ہے کہ دِلی والے اپنا اپنا جگہوں پہ بیٹھے بیٹھے فٹ فٹ کر رہے ہیں —

دوسرا لڑکا: مطلب یہ ہے کہ آج مرزا صاحب کے کندھے پر رکھ کر بستی نظام الدین میں بھرپور بندوق چھڑائی گئی ہے اور وہاں کی تین مسجدوں اور بہت سی قبروں اور چھوٹے چھوٹے مقبروں کو مسمار کر کے سب کو برابر کر دیا گیا ہے۔

ایک لڑکا: ابے اندھی نگری چوپٹ راج اور کہتے کسے ہیں؟ مرزا صاحب کے نام پر جو نہ ہو جائے سو تھوڑا ہے۔

تیسرا لڑکا: ابے ۲۲ فروری کو جس دن مرزا صاحب کی برسی منائی جائے گی اُسی روز میرے پاپا نے میری منگنی کی تاریخ مقرر کی ہے۔

چوتھا لڑکا: چلو تیرا کام بھی ہو گیا۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن اس سلسلہ میں کیا کر رہی ہے؟

پانچواں: بھئی میری رائے تو یہ ہے کہ اُس روز آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے مطالبہ کیا جائے کہ آئندہ سے ہر سال ۲۲ فروری کو مرزا صاحب کی صد سالہ برسی کی یاد میں ہندوستان کے تمام اسکولوں اور کالجوں کو بند رکھا جائے۔

پہلا لڑکا: یہ بھی کوئی مطالبہ میں مطالبہ ہوا! ۔ مطالبہ یہ ہونا چاہئے کہ ہر سال ۲۲ فروری کو لڑکے اور لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں غالب ڈے منایا جائے اور طرحی مشاعرے ہوں اور مرزا صاحب کی غزلوں میں سے نکال کر طرحیں دی جائیں اور لڑکیوں کے مشاعرہ میں لڑکے اپنی غزلیں سنائیں اور لڑکوں کے مشاعرہ میں لڑکیاں اپنی غزلیں گائیں۔

ایک آواز: ول پلیڈ ۔ کیا بڑھیا تجویز ہے ۔ ارے طبیعت خوش کر دی

کئی لڑکے ایک دوسرے کو پکڑ کر پیار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

پہلا لڑکا: کہئے کیسی کہی ۔ آداب بجالاتا ہوں۔

دوسرا لڑکا: اور اس میں ایسا کیا جائے کہ لڑکیوں کے مشاعرہ کے منتظم لڑکے ہوں اور لڑکوں کے مشاعرہ کی منتظم لڑکیاں بنائی جائیں۔

تیسرا لڑکا: اور مشاعروں میں نشست کا انتظام ایسا کیا جائے کہ زنانے مشاعرے میں لڑکوں کو پردے میں بٹھایا جائے اور مردانے مشاعرہ میں لڑکیوں کو مردانے میں بٹھایا جائے۔

چوتھا لڑکا: مگر درمیان میں ایسا باریک پردہ ہو کہ بڑھیا شعر سُن کر فریقین ایک دوسرے کو آنکھ مار سکیں ۔ اور اگر بہت زیادہ پسند آ جائے

توفریقین مشاعرہ سے باہر نکل کر ایک دوسرے کو عملی داد دے سکیں۔

تیسرا لڑکا: ہاں اگر یہ بھی نہ ہوا تو جیکلس کیا آئے گا۔

پانچواں لڑکا: اور اس سلسلہ میں جوان جوان لڑکیوں کی بیت بازی بھی کرائی جائے۔

چھٹا لڑکا: اور مشاعرہ ختم ہونے پر غالب ملن کی تقریب منائی جائے اور لڑکے اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے سے جس کھل چاہیں ملیں۔

چاروں طرف سے آوازیں:۔ مرحبا۔ مرحبا۔ ابے۔ جس کھل کی اچھی کہہ رہا ہے۔

ایک لڑکا: اس سے تو لڑکیوں اور لڑکوں کی اخلاقی حالت تباہ ہوکر رہ جائے گی۔

پہلا لڑکا: ابے وہاں پورے پورے قبرستان اور مسجدیں تباہ ہو رہی ہیں تو لڑکیوں اور لڑکوں کے اخلاق کو لیکر چلا ہے۔

ایک آواز: یہ سالا کوئی مولوی معلوم ہوتا ہے۔ نکالو سالے کو۔ یہاں شریفوں میں کہاں گھس آیا۔ اس سے کہو کہ جس زبان نے اخلاق و آداب سکھائے تھے جب وہ ختم کی جا رہی ہے تو ہم اخلاق کو لیکر چاٹیں گے۔

بغل والا لڑکا: ابے آج جب مرزا صاحب آئیں تو اُن سے کہنا کہ مرزا صاحب گھبرائیے نہیں عالم برزخ میں نماز پڑھنے کے لئے تین مسجدیں اور ایک قبرستان عالم بالا میں آپ کے جانے سے پہلے آپ کے نام دلّی ایڈمنسٹریشن والوں نے بک کر دیا ہے۔ اب اگر آپ اپنے گناہوں کی تلافی کے سلسلہ میں وہاں نماز پڑھنا چاہیں گے تو دو مسجدیں آپ کے لئے کافی ہونگی ورنہ اگر مزید ضرورت پڑے تو دلّی ایڈمنسٹریشن والوں کو لکھ بھیجئے گا وہ مزید

مسجدیں بھجوانے کا انتظام کر دیں گے۔

دوسرا لڑکا: اس کے خلاف ایک پوسٹر بھی تو شائع ہوا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ قبرستان اور مسجدوں کی زمینیں واپس کی جائیں۔

تیسرا لڑکا: زمین حاصل کرنے ہی کے لئے تو مسجدوں اور مقبروں کو منہدم کیا گیا ہے۔ لہٰذا اب واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر کہ می رود باز نمی آید۔

چوتھا لڑکا: تو پھر یہ زمین کس کام آئے گی؟

دوسرا لڑکا: زمین کوئی بلا ڈوزر زدہ ہے جو کھانے کے کام آئے گی۔ اس پر جن سنگھی اور نام نہاد کانگریسی اُردو کا مقبرہ تعمیر کرائیں گے۔ اور باہر سے جو سیاح مرزا صاحب کا مزار دیکھنے آئیں گے وہ ایک ٹکٹ میں دو شو دیکھ سکیں گے۔ ایک مرزا صاحب کا مزار اور دوسرا اُردو کا مقبرہ۔

پہلا لڑکا: ارے بھئی اس کو یوں سمجھ لو کہ شاہجہاں نے اپنی ملکہ ممتاز محل کے مزار پر مقبرہ بنوا کر اپنی محبت کی یاد تازہ کی تھی اور ہم اس کے جواب میں اُردو زبان سے نفرت کی یاد تازہ کریں گے اور نفرت کو زندۂ جاوید بنائیں گے۔

ساتواں لڑکا: سُنا ہے کہ بیس لاکھ روپیہ ہماری سرکار کی طرف سے غالب کی صد سالہ برسی کے لئے منظور ہوا ہے۔ اُس سے غالب کی یادگار میں ایک ایسی عمارت بنوائی جائے گی جس سے غالب کے نام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا جائے۔ اور غیر ملکی سیاحوں سے بتایا جائے گا کہ یہ دُنیا کا وہ واحد عظیم شاعر ہے جس کے ساتھ ہم نے اس کی زبان بھی دفن کر دی تاکہ اسے راستہ میں کوئی زحمت نہ ہو اور وہ عالم بالا تک اُردو

بولتا چلا جائے گا۔

دوسرا لڑکا: مگر بھائی یہ بات تو گلے گلے پانی تک ماننا پڑے گی کہ اُردو زبان سے جتنی محبت ہماری اندرا جی کو ہے اتنی کسی کو نہیں ہے وہ اس زبان کی اتنی ہی عزت کرتی ہیں جیسی کہ ایک مسلمان اپنی پردہ نشین بہو بیٹیوں کی عزت کرتا ہے اسی لئے وہ اپنی تقریروں میں کبھی اِس زبان کا نام تک نہیں لاتیں ہے۔ کہ کہیں اس کی عزت میں بٹہ نہ لگ جائے اور لوگ جان جائیں کہ اس نام کی بھی کوئی زبان ہمارے ملک میں ہے۔

پہلا لڑکا: مگر ان کے باپ پنڈت نہرو میں تو یہ کمزوری ضرور رہتی کہ ہمیشہ یہی زبان بولتے تھے اور اسی زبان میں تقریر کرتے تھے۔

تیسرا لڑکا: اور ہماری اندرا جی مرزا صاحب کی بھی بڑی عزت کرتی ہیں اور ان کا مقابلہ موجودہ دور کے ایسے ایسے جوہر کامل سے کرتی ہیں کہ لوگ سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔

چوتھا لڑکا: ہاں یہ بات تو ہے، سُنا ہے ابھی حال میں انہوں نے ہمارے دیش کے ایک مشہور پیشہ ور کہانی لکھنے والے کا مقابلہ مرزا صاحب سے کراتے ہوئے کہا کہ اگرچہ مرزا غالب مر چکے ہیں مگر ہمارے دیش میں ایک مرزا غالب موجود ہے اور وہ ہے اس دَور کا پیشہ ور لکھنے والا۔

(بہت سی آوازیں۔ نعرۂ ترکیب)

پانچواں لڑکا: بھئی اِس سے زیادہ توہین ہمارے پیشہ ور کہانی لکھنے والے کی نہیں ہو سکتی۔ اگر اندرا جی وزیر اعظم نہ ہوتیں تو شاید ہمارا یہ پیشہ ور فنکار ان کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کر دیتا۔ بھلا

کہاں ہمارا پیشہ ور فنکار اور کہاں مرزا غالب۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی؟

چھٹا لڑکا: میں کہتا ہوں کہ ہمارے اِس عظیم فنکار کو قدرت کی طرف سے جو صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ادنیٰ ترین صلاحیت مرزا صاحب اپنے میں دکھا دیں تب ہم ان کو اپنے فنکار کے مقابلہ کی چیز سمجھ سکتے ہیں۔ مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ احاطہ کالے خاں سے جامع مسجد تک ہی تو اُردو فارسی پڑھے تھے جبکہ ہمارا فنکار اُردو کی جگہ اُردو فارسی کی جگہ فارسی اور انگریزی کی جگہ انگریزی تینوں زبانیں جانتا ہے پھر مرزا صاحب کی تین پشتوں نے بھی اتنی کہانیاں نہ لکھی ہوں گی جو ہمارا فنکار اب تک لکھ کر دنیا والوں کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ مرزا صاحب نے خواب و خیال میں بھی اپنے اتنے ڈے اور نائٹ نہیں منوائے ہوں گے جتنے کہ ہمارا فنکار اب تک منوا چکا ہے اور منواتا رہتا ہے۔ مرزا صاحب نے زندگی میں کسی رسالے کا اتنا ضخیم نمبر نہ نکلوایا ہوگا جتنا ضخیم نمبر ہمارا فنکار نکلوا چکا ہے۔ ہمارے فنکار میں جو ادبی چلت پھرت ہے وہ مرزا صاحب نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ ہمارا فنکار جب دیکھتا ہے کہ اُردو کا گھوڑا ریس جیت رہا ہے تو وہ جیکی بن کر اُس پر سوار ہو جاتا ہے اور جب اس کو ہندی کے گھوڑے کی کامیابی کا یقین ہوتا ہے تو وہ اس پر ران سواری گانٹھ دیتا ہے۔ اس کو قدرت نے دانت بھی دیئے ہیں اور پر بھی۔ وہ بیک وقت پرندوں کے ساتھ پرواز بھی کر سکتا ہے اور چوپاؤں کے ساتھ ریس بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ تمام صلاحیتیں عطا کی ہیں جو ایک نام نہاد کانگریسی نیتا

میں پائی جاتی ہیں۔

پہلا لڑکا: (اونچی آواز سے) بھائیو! اب ایک ایک کر کے بتاؤ کہ موجودہ دور میں ایک فنکار میں کون کون سی صلاحیتیں ہونا ضروری ہیں جن کی بنا پر ہمارا ملک اس کو فن کار مان سکتا ہے؟

ایک لڑکا: شراب پیتا ہو مگر دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھُڑاتا ہو۔

دوسرا لڑکا: نمبری ہو اور اپنے نمبر نکلواتا ہو۔

تیسرا لڑکا: سماج کی اصلاح اس ڈھنگ سے کرتا ہو کہ اپنے عمل پر آنچ نہ آنے پائے۔

چوتھا لڑکا: اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسرے کی بیویوں پر مسمریزم کی مشق کرتا ہے

پانچواں لڑکا: سوسائٹی کے تالاب میں مچھلیوں کا شکار کرتا ہو

چھٹا لڑکا: اپنے قلم سے لڑکیوں کی عصمت پوشی کرتا ہو اور نگاہوں میں عصمت دری کرنے کی تیز و تند صلاحیت رکھتا ہو۔

ساتواں لڑکا: بڑی بڑی نانڈوں میں منہ ڈال کر تہہ دیگی تک چاٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

آٹھواں لڑکا: جائز اور ناجائز طور پر روپیہ وصول کرنے کے گُر جانتا ہو۔

پہلا لڑکا: اچھا ایک بات اور بتاؤ گے؟

پورا کلاس: (ایک آواز ہو کر) ہاں بتائیں گے۔

وہی لڑکا: اچھا بتاؤ کسی مشہور شاعر اور ادیب پر خود کو اتھارٹی بنانے کے لئے کون کون سے اخلاقی طریقے ہیں جن کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے؟

پورا کلاس: اُس ادیب یا شاعر پر دوسروں کا جمع کیا ہوا مواد اپنے نام سے چھپوا دے۔

ایک لڑکا: جس شاعر پر اتھارٹی ہو اس کے بارے میں ایک حرف نہ جانتا ہو۔

تیسرا لڑکا: اگر کسی مرحوم شاعر یا ادیب پر اتھارٹی بننا چاہے تو اُس شاعر سے متعلق جس جس ادیب کے پاس جتنا مواد ہو اُسے تکڑم بازی سے حاصل کرکے اپنے نام سے اس کی نمائش شروع کردے۔

چوتھا لڑکا: جیب میں اتنے پیسے رکھتا ہو کہ ہر شریف کی عزت اُتارنے پر قادر ہو۔

پانچواں: اگر کوئی عبارت کسی کتاب سے نقل کرے تو خود اُسے نہ پڑھ پائے۔

(پورا کلاس۔ نعرۂ ترکیب)

ایک لڑکا: ارے بھائیو! آج ایک بہت بڑا پوسٹر غالب کی صد سالہ برسی کی یاد میں کمیونسٹ شاعر نیاز حیدر نے چھاپا ہے۔

دوسرا لڑکا: اس پوسٹر میں کیا لکھا ہے؟

وہی لڑکا: یار! وہ پوسٹر پڑھنے والا ہے (جیب سے نکالکر) یہ دیکھو۔

سب لڑکے: (ایک آواز ہو کر) اسے زور زور سے پڑھ کر سناؤ۔
وہی لڑکا: یہ پوسٹر عجیب و غریب ہے اور عنوان کی جگہ مرزا صاحب کا ایک شعر لکھا ہے جس سے یہ پوسٹر شروع ہوتا ہے۔
ایک آواز: یہ سالے کمیونسٹ بھی بڑے ذہین ہوتے ہیں۔
بہت سی آوازیں: ارے بھئی وہ پوسٹر پڑھو نا۔
پہلا لڑکا: پوسٹر کا عنوان ہے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اب اس شعر کے نیچے جو عبارت لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو:
"تمام تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل کو، دلّی والوں کو، مرزا اسد اللہ خاں غالب کا سلام پہنچے" اس کے بعد موٹی سرخی ہے۔ "مرزا غالب اُپرا" اور اس کے نیچے تحریر ہے "بارے بصورت اسٹیج اُپرا، جس کا ترجمہ غنائی تمثیل ہونا چاہئے تھا، عالمِ عدم سے مکرر اپنے شہر دلّی بھیج دیا گیا ہوں۔ کس واسطے کہ اب اسی اُپرا کی صورت میں میرا چلنا پھرنا، خدمت بجا لانی اور دیگر فریضوں کی انجام دہی ممکن ہے۔ شاید اسی اسٹیج پر آنے کے لئے میں نے مدتوں پہلے کہا تھا۔ ع

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

سو اب ہم سب کو مل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا موقع مل رہا ہے یا یاں کارِ دلّی کے شیدائیانِ علم و ادب نے مل کر میرے صد سالہ جشن

کی تیاری شروع کر دی ہے۔ وہی حضرات جنہیں دلّی کی گلیاں "میر مشتاق" کہہ کر پکارتے ہیں، جو خلق خدا کے بگڑے کاج سنوارتے ہیں انہوں نے اس عافیت کے دشمن آوارگی کے آشنا رند بلانوش نیاز حیدر کی خاطر غالب آپرا کمیٹی بنائی ہے۔ دیکھئے تو کیسی رنگا رنگ محفل سجائی ہے۔ کس واسطے کہ بلانوش نیاز حیدر فن تمثیل نگاری میں اور سخنوری میں یکتائے روزگار ہے۔ نام نہاد حکام اور نقلی شرفاء کی نظروں میں میری طرح ذلیل و خوار ہے۔

سو حضرات یہ رہی مجلس صدارت ——— یاد رہیں یہ دلفروز نام فقط

غالب ناشناس

غالب فروشوں سے

نجات کا طالب

دلّی کی گلیوں کا غالب

غالب آپرا کمیٹی۔

صدر: میر مشتاق۔ ع

سراپا رہن عشق و نا گزیر الفت ہستی!
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

نائبین صدر:

جناب شیو چرن گپتا۔ ع

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

جناب برجموہن - ع
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

جناب مہیشور دیال - ع
مرے بُت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

جناب حکیم شریف - ع درد منت کشِ دوا نہ ہوا

نائبین صدر:

جناب ایم - فاروقی - ع تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر
محترمہ سبھدرا جوشی - ع ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
محترمہ مس سرینذ رسینی - ع نگہ معمار حسرتا چہ آبادی چہ ویرانی
سکتّر عمومی: نیاز حیدر - ع عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
سکتّر: محمد باقر - ع گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

خازن: جناب حافظ عبدالعزیز صاحب - روزہ مرا ایمان ہے لیکن غالب
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

اور یہ ہیں معزز اراکین: جناب عابدی الہ آبادی، جناب سکندر بخت
جناب راجیش شرما - جناب سردار گوربخش سنگھ (گرمکو فارمیسی) جناب شکیل احمد
جناب پریم ساگر گپتا - جناب بی - ڈی - جوشی

جاری کردہ: مرزا غالب آپرا کمیٹی برائے جن ٹیک رنگ بینچ ۵۷ - رانی
جھانسی روڈ نئی دلی نمبر ۵۵

سکریٹری: مہر باقر، فون نمبر ۵۶۷۲۶۱

ایک لڑکا: لو بھئی مرزا صاحب آرہے ہیں - آج تو بغل میں بہت
سے کاغذات دبائے ہیں -

دوسرا: مجھے تو پوسٹر معلوم ہوتے ہیں۔

تیسرا: ہاں۔ پوسٹر ہی ہوں گے کیونکہ جن لوگوں کو مرزا صاحب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں شہرت اور فائدہ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ پوسٹر لگانے کا کام اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں سے مفت لیا جائے گا۔

(مرزا صاحب ہال میں داخل ہوتے ہیں اور لڑکے ان کا تالیوں سے خیر مقدم کرتے ہیں)

مرزا صاحب: بھائی آج میں بہت تھک گیا ہوں۔ اور میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ دلی کے سمینار میں جو لوگ مجھ پر مضمون پڑھنے آ رہے ہیں اُن کے سننے والوں کا انتظام کر دوں اور ہر شخص سے ہاتھ جوڑتا پھروں کہ چل کر میری صد سالہ برسی کو کامیاب بنا دو۔ ورنہ جو لوگ اس سلسلہ میں سستی شہرت کے بھوکے ہیں ان کی شہرت میں فرق آجائے گا۔ لہٰذا اب تم لوگ کوشش کر کے اسے کامیاب بناؤ اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ہال تک پہنچاؤ۔ جتنے پاسوں کی ضرورت ہو وہ مجھ سے لیجاؤ کیونکہ کئی تھوڑے پاس منتظمین نے میرے پاس بھجوا دئیے ہیں۔

ایک لڑکا: اجی مرزا صاحب آپ کس چکر میں پڑے ہیں۔ اگر یہ پاس ایسے کاغذ پر چھپے ہوں جن کی پڑیاں بن سکتی ہوں تو آپ ہم لوگوں کو بھجوا دیں ہم ان کو بنیوں کے ہاتھ بیچ کر آپ کو پیسے دلوا دیں تاکہ نظام الدین سے یہاں تک آپ کی آمد و رفت کا کرایہ ہی نکل آئے۔

دوسرا لڑکا: حضور! اس میں دو چار کو نکال کر سب لوگ ایسے شامل ہیں جو نہ آپ کی عظمت سے واقف ہیں اور نہ انھیں شعر و ادب سے لگاؤ ہے۔ یہ تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کس طرح شہرت

حاصل کر کے کسی سرکاری عہدہ پر پہنچ جائیں۔ اور اگر ان لوگوں کے دلوں میں اُردو کی فلاح و بہبود کا خیال ہوتا تو بجائے وہ دگیان بھون کے یہ پرانی دلّی میں یا دلّی یونیورسٹی میں اس تقریب کو منانے کا انتظام کرتے جہاں اُردو داں طبقہ رہتا ہے یا ایسے لوگ رہتے ہیں جو آپ کے قدرداں ہیں ۔۔۔ اس گرانی کے زمانہ میں کس کے پاس اتنا روپیہ فالتو ہے جو دو ڈھائی روپے خرچ کر کے تین روز تک یہاں سے وگیان بھون تک مرتا گھس گھس کرے گا ۔۔۔ یہ تو صرف دنیا کو دھوکے میں مبتلا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

مرزا صاحب: یہ سب کھانے پینے کے دھندے ہیں۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب! ان میں سوائے حکیم عبدالحمید صاحب کے یا ان کے چند رفقاء کے جو اس معاملہ میں ان کا دست راست بنے ہوئے ہیں سب آپ کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑنے والوں میں ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے پوچھئے کہ اس زبان کے سلسلہ میں ان لوگوں نے اب تک کیا کیا جس میں آپ نے شاعری کی تھی۔ اور جس کی بقا کے لئے آپ نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات صرف کئے تھے۔

دوسرا لڑکا: اور حضور! ان میں ایک بزرگوار تو وہ ہیں جو آپ کے بارے میں لکھے بیٹھے ہیں کہ مرزا صاحب نہ فارسی جانتے تھے نہ اُردو، نہ انہیں کو عربی آتی تھی نہ تُرکی اور عروض سے بھی اُن کی واقفیت بس واجبی واجبی تھی یہاں تک کہ فن قافیہ سے متعلق بھی اُن کے معلومات عامہ محدود تھے۔

مرزا صاحب: یہ کون بزرگ ہیں؟

ایک لڑکا: حضور! ان کا ایک مضمون "غالب محقق کی حیثیت سے" ایک رسالہ میں چھپا تھا اور اسی میں انہوں نے آپ کے بارے میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔

مرزا صاحب: ان بزرگوار کی عمر شریف کیا ہے؟

وہی لڑکا: بس آپ ہی کے ہم عمر ہوں گے۔

مرزا صاحب: تو بیٹا! پھر اگر وہ ایسی باتیں لکھتے ہیں تو کیا غلط لکھتے ہیں اس عمر میں بوڑھا اور بالک برابر ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی باتوں کا بُرا نہیں ماننا چاہئیے ـــ اگر وہ یہ نہ لکھتے تو پھر میرے بارے میں کیا لکھتے۔

دوسرا لڑکا: اور انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فارسی شاعروں کے اشعار چُرا کر اُن کا اُردو یا فارسی میں ترجمہ کر لیتے تھے۔

مرزا صاحب: بھئی میں بھی جب اس عمر میں تھا تو اپنی فارسی دانی پر مجھ کو بڑا ناز تھا اور قتیل جیسے باکمال کو جاہل اور احمق گردانتا تھا تو پھر ان بیچارے کو کیوں موردِ الزام ٹھہراتے ہو۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب! ایک ڈاکٹر صاحب: جو ان صاحب کے تقریباً خلیفہ ہیں اور جن کی کائناتِ فکر دلی یونیورسٹی تک ہے وہ بھی ان بزرگوار کے ہم خیال ہیں مگر ان کی عمر زیادہ نہیں ہے۔

مرزا صاحب: جی ہاں! مگر آپ دریافت کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ بھی دماغی ہاضمہ کے مریض ہیں ورنہ وہ ایسی باتیں نہ کرتے۔

چوتھا لڑکا: اور یہ جو آپ کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے ـ وہی اُس کا افتتاح فرمانے جا رہے ہیں۔

پانچواں: مگر مرزا صاحب! پاکستان کے ایک ڈاکٹر نے اس سلسلہ

میں ان کو ایسے انجکشن دئیے ہیں کہ ان کی طبیعت تو خوش ہو گئی ہو گی انہوں نے ایک پوری کتاب لکھ کر ان کو بڑی دور تک رگیدا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا علم صرف انگریزی کی چند کتابوں تک محدود ہے۔

مرزا صاحب: جس نے انگریزی میں فارسی پڑھی ہو وہ تو اور بھی قابلِ معافی ہے۔ دوسرے خود میری زندگی میں کتنوں نے مجھے مہمل گو کہا، میری پگڑی اچھالنے کی کوشش کی مگر چاند کا تھوکا منہ پر آتا ہے۔ کچھ لوگ بال کی کھال نکالتے ہیں اور کچھ جو اس منزل سے تجاوز کر جاتے ہیں وہ کھال کی بال نکالنا شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ زیادہ تر احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب! ایک بات پوچھوں بشرطیکہ آپ برا نہ مانیں۔

مرزا صاحب: نہیں میاں! میں کسی بات کا برا نہیں مانتا۔

وہی لڑکا: مرزا صاحب آپ نے خود اپنے دیوان میں متعدد جگہ میر تقی میرؔ کو اپنے سے بڑا شاعر تسلیم کیا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ پھر کیا وہ آپ سے زیادہ اس صد سالہ برسی کے مستحق نہ تھے؟

مرزا صاحب: ارے صاحب۔ مجھ سے بڑا شاعر میر دردؔ اسی دلی میں گذرا ہے سب سے پہلے تو اس کی صد سالہ برسی منانا چاہئیے تھا۔ میں تو ان کے بہت بعد کی چیز ہوں مگر میں نے اپنی شاعری کو کسی مخصوص جادہ کا پابند نہیں بنایا۔ میرؔ صاحب نے عشق کر کے شاعری شروع کی تھی یا..... یوں کہئیے کہ عشق نے ان کو شاعر بنا دیا تھا۔

اس لئے اُنھوں نے جو شاعری کی وہ حقیقتاً ان کی آپ بیتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ صرف اپنی تسکین کے لئے کہا۔ اسی طرح میر دردؔ نے اپنی عاقبت کی درستی کے لئے کہا اور تمام عمر تصوّف کے مریض رہے۔ میں بحمداللہ جوانی سے ادھیڑ عمر تک صحتمند رہا اور اپنی تندرستی میرے پیش نظر رہی۔ میر دردؔ کو تصوّف نے اپنے گھر بٹھا لیا تھا میر صاحب کو عشق نے مار رکھا تھا مگر میں نے کسی کی مار نہیں کھائی بلکہ اُلٹے دوسروں کو مار رکھا چنانچہ عشق نے جو سلوک میر صاحب کے ساتھ کیا تھا وہی سلوک میں نے ڈومنی کے ساتھ کیا اور جو کام کیا کھرے گھاٹ کیا۔ اسی لئے میرے یہاں آپ کو دھول دھپے سے لیکر تصوّف تک کے اشعار ملیں گے۔ اسی لئے قبرستان کے سارے مُردوں میں میری میت لوگوں کو پسند آئی ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کہاں میں اور کہاں میر دردؔ اور میر تقی میرؔ۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ دونوں ایسے مرض میں مبتلا تھے کہ جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔

مرزا صاحب: آپ کی برسی کے سلسلہ میں جو رسائل اور کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ بھی آپ نے دیکھیں؟

مرزا صاحب: ہاں صاحب۔ اُس دن خواجہ احمد فاروقی صاحب کے یہاں اپنی فارسی کی کلیات دیکھی جو تقریباً میرے ہم وزن تھی اور جسے امیر حسن نورانی صاحب نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ دوسرے ایک غالب نمبر دیکھا جو ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ نے شائع کیا ہے وہ تو اتنا وزنی ہے کہ شاید جوانی میں اگر اُسے ترازو میں رکھ کر مجھے تولتے تو اسی کا پلڑا بھاری رہتا۔ خواجہ صاحب ہی نے میاں امتیاز علی عرشی

رامپوری اور علی سردار جعفری کے مرتب کئے ہوئے دو دیوان کے دو نسخے ایسے دکھائے کہ اگر اندھیرے اُجالے میرے ہاتھ لگتے تو میں کسی مرنے والے کے ہاتھ اپنی واپسی سے پہلے عالم برزخ بھجوا دیتا۔ اُن میں عرشی اور علی سردار دونوں کی تصویریں دیکھ لیں۔ کاش غلام رسول مہر سے کبھی ملاقات ہو جاتی جو دورِ حاضر کے محسنوں میں سب سے زیادہ معتبر ہیں۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب آپ کے بارے میں شمیم کرہانی نے ایک ایسی نظم لکھی ہے جسے اگر آپ پڑھیں گے تو اپنے اوپر فخر محسوس کریں گے۔

مرزا صاحب: وہ کہاں رہتے ہیں؟

وہی لڑکا: مرزا صاحب۔ وہ یہیں دلّی ہی میں کوچۂ میر عاشق میں رہتے ہیں اگر آپ ملنا چاہیں تو میں آپ کو لے چلوں۔

مرزا صاحب: جناب۔ اب اس عمر میں کوچۂ میر عاشق اگر جاؤں تو کس بل بوتے پر جاؤں سوائے اس کے کہ وہاں کے سوتے کتوں کو جگاؤں اور انہیں اپنے پیچھے لگاؤں۔

دوسرا لڑکا: میرزا صاحب! آپ کی صد سالہ برسی کی تقریبات میں بڑی دور دور ملکوں کے لوگوں کو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے دعوت نامے بھیجے ہیں اور ڈاکٹر صاحب خود آپ کی خاطر یورپ میں ملکوں ملکوں جا کر غالب کمیٹیاں قائم کر آئے ہیں اور وہاں کے لوگوں کو دعوت دے آئے ہیں۔ جن تاریخوں میں آپ کی برسی یہاں منائی جا رہی ہے انہیں تاریخوں میں دوسرے ملک بھی آپ کی برسی منا رہے ہیں۔

مرزا صاحب: یورپ تو ہندوستان سے بڑی دور ہے وہ جوانی میں ہندوستان سے چل کر ادھیڑ عمر میں وہاں پہنچے ہوں گے اور واپس آتے آتے خاصے عمر رسیدہ ہو گئے ہوں گے۔

تیسرا لڑکا: آپ تو اُس روز خواجہ صاحب سے مل چکے ہیں۔ پھر اُن کے چہرہ پر کون سے بڑھاپے کے آثار آپ نے دیکھے ؟

مرزا صاحب: ہاں صاحب یہ بات تو ہے۔ میں اس وجہ سے کہہ رہا تھا کہ جب میں دلی سے کلکتہ گیا تھا تو اس میں رُکتے رکاتے تقریباً تین مہینے آمد و رفت میں لگ گئے تھے۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب آپ تو سو برس پہلے کی باتیں کر رہے ہیں جب لوگ ایروپلین اور راکٹ سے ناواقف تھے۔ اب تو ان کی مدد سے سفر میں بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

مرزا صاحب: یہ جن صاحبان کا آپ نے نام لیا یہ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں ؟

(پورا کلاس قہقہوں سے گونج جاتا ہے)

مرزا صاحب: کیوں صاحب اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟

ایک لڑکا: مرزا صاحب۔ یہ دونوں سواریاں ہیں جن پر بیٹھ کر لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔ ان کو ہوائی جہاز کہتے ہیں۔ اب ہوائی جہاز کے ذریعہ ایک گھنٹے کے اندر دلی سے کلکتہ پہنچا جاتا ہے۔

مرزا صاحب: تو اسے اُڑن کھٹولا کہیے۔ میں نے صرف اپنے زمانے میں اُڑن کھٹولے کا نام سُنا تھا کیا معلوم تھا کہ سو برس بعد

لوگ اُس پر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا شروع کر دیں گے۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب اس میں ایک ہوائی جہاز ایسا ہے جس پر بیٹھ کر لوگ چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مرزا صاحب: کیا بچپنے کی باتیں کرتے ہو۔ چاند تاروں تک پہنچنا تو بڑی چیز ابھی تک کوئی تک نہ بتا سکا کہ یہ بنے کا ہے کے ہیں جو چمکتے ہیں۔ یہ سب قدرتی امور ہیں ان کا اس طرح مذاق نہیں اُڑاتے۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب آپ اسے مذاق نہ سمجھیئے امریکہ اور روس دونوں ملکوں کے سائنسداں اس پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے مہینے امریکہ والوں نے چاند کے پاس پہنچکر یہ تک دریافت کر لیا ہے کہ اس میں کس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ گئے تھے اُنھوں نے آکر بتایا کہ وہاں ہوا بالکل نہیں ہے جس کی وجہ سے وہاں کوئی جاندار چیز نہیں پائی جاتی صرف پہاڑ اور گھاٹیاں ہیں۔

مرزا صاحب: اگر وہاں آبادی نہیں ہے تو پھر اُس میں اتنی روشنی کہاں سے آئی؟ ضرور کوئی صاحب گیس وغیرہ قسم کی چیز لگا آئے ہوں گے۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب! عجب نہیں۔ اس کے بعد اگر آپ کو بُلایا جائے تو آپ کو جہاں اور چیزیں دکھائی گئی ہیں وہاں چاند پر بھی لیجا کر دکھایا جائے اور ممکن ہے کہ اس وقت تک بہت سے لوگ یہاں سے وہاں رہنے پہنچ جائیں۔

چوتھا لڑکا: اور مرزا صاحب آپ کے جانے کے بعد ایک اور چیز ایجاد ہوئی ہے جس کا نام ٹیلیفون ہے؟ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ دلی سے گھر بیٹھے دُنیا کے جس ملک کے رہنے والوں سے چاہیں بات کر سکتے ہیں..

مرزا صاحب: تو صاحب اِدھر سے اُدھر آواز پہنچنے میں تو دو چار ہفتے ضرور لگتے ہوں گے؟

(چہار طرف سے قہقہوں کی آواز)

وہی لڑکا: نہیں مرزا صاحب۔ ہم ٹیلیفون پر اسی طرح بات کر سکتے ہیں جیسے آمنے سامنے بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔

مرزا صاحب: انتہا ہو گئی؟

ایک لڑکا: مرزا صاحب دُعا کیجئے کہ ہم لوگ چاند پر پہنچ کر رہنے لگیں پھر وہاں آپ کو بُلانے میں بڑی آسانی ہوگی۔

مرزا صاحب: ارے صاحب کیا عجب ہے جو چاند سے عالم برزخ جہاں روحیں رہتی ہیں۔ ٹکے ڈولی ہو اور زندے اور مُردے آپس میں ایک دوسرے سے ملنے لگیں۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب۔ چاند میں جانے سے ایک فائدہ ہوگا کہ انسان موت کی اذیت سے بچ جائے گا اور ملک الموت کو ہر لمحہ دوڑ دوڑ کر دُنیا والوں کی روح قبض کرنے جو اتنی دور آنا پڑتا ہے اس کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے...

چوتھا لڑکا: اس صورت میں روح قبض کرنے کا سوال ہی باقی نہ رہے گا۔ جس کو بلانا ہوگا سے پہلے سے کسی کو بھیج کر بلوا لیا جائے گا۔

اور اگر عالم برزخ میں یہاں جیسا ٹیلیفون ہوا تو ٹیلیفون کر کے بلوا لیا جائے گا۔ انسانوں اور فرشتوں دونوں کو بڑی پریشانیوں سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

پانچواں لڑکا: مرزا صاحب اگر دنیا والوں کا چاند میں رہنے کا انتظام ہو گیا تو میں اردو کے تمام شعراء اور ادباء کو مشورہ دوں گا کہ وہ سب کے سب بجائے پاکستان اور ہندوستان کے چکر میں پڑنے کے چاند میں منتقل ہو جائیں۔ اس سے پہلا فائدہ تو یہ ہو گا کہ یہ روز روز کی ہندی اردو کی بحث کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دوسرے جن سنگھ جو اکھنڈ بھارت بنا کر ہندو راج قائم کرنا چاہتا ہے اس کی جھک جھک سے مسلمانوں کو نجات مل جائے گی اور آئے دن ہندوستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں اس سے یہاں کی حکومت کو چھٹکارا مل جائے۔

چھٹا لڑکا: اس کے بعد اردو فارسی اور عربی کا جتنا ذخیرہ ہے اور جو گزشتہ بیس سال سے بری طرح تباہ ہو رہا ہے وہ تباہی سے بچ جائے گا۔ نہ پاسپورٹ کا جھگڑا ہو گا نہ ویزا بنوانے کے سلسلہ میں دوڑ دھوپ کی ضرورت ہو گی ــــ اپنے چپکے سے اٹھے ہوائی جہاز میں بیٹھے اور سائیں سائیں کر کے چشم زدن میں چاند پر پہنچ گئے۔

دوسرا لڑکا: مگر دنیا سے چاند تک سارا اثاثہ پہنچانے میں اخراجات کوئی کم ہوں گے۔؟

تیسرا لڑکا: ارے صاحب جب عالم برزخ قریب ہو گا تو یہاں جو بڑے بڑے مغل بادشاہ عرصہ سے مقیم ہیں۔ ان کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد جب توجہ دلائی جائے گی تو ان کے ایک ادنیٰ اشارہ

پر خزانوں کے منہ کھل جائیں گے اور پوری آبادی چل چل چنبیلی باغ کہتی چاند میں پہنچ جائے گی۔

مرزا صاحب: صاحب! اگر یہ صورت ہو گئی تو میں سمجھتا ہوں اُردو کو عالم بالا کی لنگوفرنکا اور سرکاری زبان بنا دیا جائے گا۔ اور وہ معرکے کے مشاعرہ ہوں گے کہ اُردو کے شعراء کے نغمات سے کائنات عالم گونج جائے گی۔

چوتھا لڑکا: قسم قرآن کی آپ کے آنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عالم ارواح کے رہنے والے کو یہاں کے حالات کا آنکھوں دیکھا حال معلوم ہو گیا۔ مگر مرزا صاحب آپ کے جانے کے بعد بقیہ حالات سے آپ کو اطلاع کیسے کرائی جائے گی۔؟

مرزا صاحب: اطلاع کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جو مستند ادیب یا شاعر مرے اُس سے آپ زبانی مجھ تک یہاں کے حالات کی اطلاع کر سکتے ہیں دوسرے اس مرتبہ جب میں مروں تو آپ میری قبر میں ایک ایک ٹیلیفون لگوا دیں اور یہ جو بیس بائیس لاکھ روپیہ ہے جو میری برسی کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے منظور ہوا ہے اس میں سے قبر ایسی بنائی جس میں آمد و رفت کے لئے ایک راستہ بنا دیا جائے۔

پانچواں لڑکا: مگر مرزا صاحب! عالم ارواح تک ٹیلیفون کے تار اتنی جلدی کیسے لگ سکیں گے؟

مرزا صاحب: ہاں سردست یہ دشواری تو ضرور ہے۔ مگر جہاں روسی سائنسدانوں سے مدد لیکر آپ نے مجھے زندہ کر لیا ہے اور جہاں امریکی سائنسداں چاند تک پہنچ گئے ہیں وہاں اگر ان سے کہا جائے

کہ وہ عالم برزخ تک ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تار بھی لگا دیں۔

ایک لڑکا: مگر مرزا صاحب میں سمجھتا ہوں کہ جب تک چاند میں رہنے سہنے کا انتظام نہیں ہو جائے گا اُس وقت تک یہ کام ہونا مشکل ہے۔

مرزا صاحب: بھئی میں کہتا ہوں اگر ایسا ہو جائے تو شاید پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشمیر کے سلسلہ میں جو آئے دن کے جھگڑے رہتے ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔

دوسرا لڑکا: ہاں اس کے بعد تو دونوں ملکوں کے درمیان بہت آسانی سے مصالحت ہو جائے گی۔

تیسرا لڑکا: اور اس کے بعد ہوا میں مکانات بننا شروع ہو جائیں گے۔ اور ہر ملک اپنے اپنے زمین و آسمان کے درمیان ہوائی عمارتوں پر عمارتیں کھڑا کرتا چلا جائے گا۔

چوتھا لڑکا: مگر ایک بات یہ بھی سُننے میں آئی ہے کہ چاند کے پاس ہوا بالکل نہیں ہے جس کی وجہ سے جو چیز چاند اور زمین کے درمیان گرے گی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوا میں معلق رہے گی۔

پانچواں لڑکا: تب تو یار اگر چاند میں کوئی شخص مرے گا اور اُسے زمین کی طرف پھینک دیا جائے گا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوا میں جوں کا توں معلق رہے گا۔

چھٹا لڑکا: یہ اور بھی اچھا ہے اب فرض کیجئے کسی کا جوان اکلوتا لڑکا مرا اور اُس نے زمین کی طرف اس کی لاش ڈھلکا دی تو وہ جس حالت میں مرا ہے اُسی حالت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹنگا رہے گا۔

ساتواں لڑکا: اس سے ماں باپ کو لڑکے کے مرنے کا اتنا غم نہیں

ہوا کرے گا جتنا کہ اب ہوتا ہے۔ وہ چاند سے جب ذرا گردن نیچے کی طرف جھکائے گا اپنے لڑکے کو دیکھ لیا کرے گا۔ البتہ اس کا تھوڑا بہت غم ضرور رہا کرے گا کہ وہ بول چال نہیں پائے گا۔

پہلا لڑکا: اسی لئے تو شاعر نے کہا ہے۔ ع

ہے ہوا کے دوش پر تصویر یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

مرزا صاحب: ہاں صاحب اگر ایسا ہو گیا تو کہنا چاہیئے مرنے جینے کی قدریں ہی بدل جائیں گی۔

پہلا لڑکا: ارے مرزا صاحب! سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مرنے کے بعد تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں جو مصارف ہر شخص کو برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ ان کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا دوسرے بستی سے باہر قبرستان نہیں ہوں گے اور جو لاکھوں گز زمینیں قبرستان گھیر لیتے ہیں وہ دوکان اور مکان بنوانے کے کام میں لائی جاسکیں گی۔ پھر چونکہ یہ سب کچھ آسمان پر ہی ہوگا۔ اس لئے اِدھر عالم بالا اذان کی آواز سنی اُدھر چاند والے صف بستہ نماز پڑھنے کھڑے ہو جائیں گے۔

چوتھا لڑکا: اور صاحب مرنے والے کو اگر پھر بھی کسی کو دیکھنا ہوگا تو وہ ادھر گردن جھکا کر مرنے والے کی صورت دیکھے گا اور تھوڑی دیر کے بعد عالم برزخ میں جا کر اس کی روح سے مل آئے گا۔ اس طرح مرنے والے سے اس کی ملاقات دو قسطوں میں مکمل ہو جایا کرے گی۔

چھٹا لڑکا: اور مرزا صاحب سب سے بڑی خوشی اور مسرت اس کی

ہے کہ چاند کے رہنے والوں کو بھوک ہی نہیں لگتی لہذا سب سے بڑا پیٹ کا سوال جو دنیا میں سب سے بڑی بس کی گانٹھ ہے اور بُرائیوں کی جڑ ہے وہی ختم ہو جائے

مرزا صاحب: مگر جب وہاں ہوا ہی نہیں ہے تو انسان زندہ کیسے رہ سکے گا اور سانس کیسے لے گا۔؟

ساتواں لڑکا: مرزا صاحب آپ شہر کے اندیشے میں دُبلے نہ ہوں جب انسان وہاں پہنچ جائے گا تو وہاں ہوا پانی اور دوسری ضروریات زندگی کی چیزوں کا انتظام بھی کرلے گا۔ ابھی پہنچنے تو دیجئے۔

مرزا صاحب: میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی ایسی صورت نکل آتی جو میں ہندوستان کے سارے ادیبوں سے ایک ہی جگہ پر مل لیتا۔

ایک لڑکا: مرزا صاحب اس سے بہتر صورت ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کے دلی میں جمع کرنے کی اور کیا ہو سکتی تھی۔ مگر ان بھاتو اپنے ہی اپنوں کو ریوڑی بانٹتا ہے اس لئے جو چندہ آپ کی برسی کے سلسلہ میں جمع ہوا تھا وہ اپنے اپنوں کو بٹ گیا۔ خیال یہ تھا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں کتب فروشوں نے آپ سے متعلق جو کتابیں شائع کی ہیں ان کے اسٹال قائم ہوں گے اور اب تک آپ پر جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی نمائش ہو گی مگر سہ

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

پرسوں سے تقریبات کا سلسلہ شروع ہے مگر ابھی تک نہ باہر سے کوئی اسٹال آیا ہے نہ اور دوسرے لوگ۔ صرف دو ایک مقامی بک سیلروں کو بلایا گیا ہے۔

مرزا صاحب: پھر میں سوچتا ہوں کہ میں ایسی جگہ کو کیوں جاؤں؟

ایک لڑکا: صرف چند لوگوں نے اپنی شہرت کی خاطر یہ ڈھونگ کھڑا کیا تھا صرف حکیم عبدالحمید صاحب کو دل سے لگی ہے اور وہ واقعتاً چاہتے ہیں کہ آپ کی وساطت سے اُردو زبان زندہ رہے ورنہ بقیہ حضرات تو اپنے منصب کی خاطر اس میں شریک ہیں۔

مرزا صاحب: آج کل ہندوستان میں کون سے ادیب ہیں جن سے مجھے ملنا چاہیئے۔؟

ایک لڑکا: حضور! اس وقت ہندوستان میں جو چوٹی کے ادیب ہیں ان میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، سیّد علی عباس حسینی، صباح الدین عبدالرحمٰن، شاہ معین الدین، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا اختر علی تلہری، پروفیسر احتشام حسین، مولانا خیر بہوروی، قاضی عبدالودود، مقبول احمد لاری، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسن خاں، ڈاکٹر نیّر مسعود، خاور دید وشنشٹ، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت سندیلوی، شہباز حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین، مولانا شبیہہ الحسن، پروفیسر اور رینوی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، وجاہت سندیلوی، ڈاکٹر تنویر علوی، سلام سندیلوی، نادم سیتاپوری، جناب آوارہ، ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر سروری، ڈاکٹر ملک زادہ منظور، عبداللطیف اعظمی، شاہ معین الدین، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر نسیم قریشی، فراق گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر کامل قریشی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر عبدالستار پروفیسر مسیح الزماں، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، غلام ربانی تاباں، پروفیسر سمنابی، جگن ناتھ آزاد، سلام مچھلی شہری، ساغر نظامی،

نیاز حیدر، ڈاکٹر سجاد ظہیر، باقر مہدی، ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر شارب ردولوی، پروفیسر نجم الدین نقوی، خورشید الاسلام، عرشی رامپوری، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، مالک رام صاحب پروفیسر خلیق نظامی، نسیم احمد دانش محلی، مولانا محمد حسین شمس، مولانا تسکین قریشی، شفیع الدین نیّر، مختار الدین آرزدہ۔

مرزا صاحب: ان لوگوں میں سے کون کون لوگ دِلّی میں بُلوائے گئے ہیں؟

وہی لڑکا: دِلّی یونیورسٹی کے اسٹاف سے تو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی آپ کو مِلوا چکے ہیں اور مذکورہ بالا ناموں میں سے صرف چند کو راجدھانی میں دعوت دی گئی ہے۔

مرزا صاحب: کبھی جب اتنا روپیہ چندہ میں جمع ہوا تھا تو صرف چند کو بُلانا کیا معنی؟ بھلا کون ایسا ہوگا جو مجھ سے ملنے کا خواہشمند نہ ہوگا ـــ؟

وہی لڑکا: مرزا صاحب! اگر یہ سارا چندہ اُردو ادباء اور شعراء کے کرایہ بھاڑے اور قیام و طعام پر صرف کر دیا جاتا تو پھر ان لوگوں کی جیبیں کیسے گرم ہوتیں جو آپ کی ٹھیکے پر برسی منا رہے ہیں۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب! گذشتہ بیس سال میں جب سے ہمارا ملک آزاد ہوا ہے اُردو ادب میں ایسے ایسے نمک حرام پیدا ہوئے ہیں کہ اگر میر صادق، میر جعفر اور علی نقی خاں جیسے غدّاران قوم دوبارہ زندہ ہو جائیں اور ان حضرات کو دیکھ لیں تو کئی دن تک ان کی گھگھی بندھی رہے ـــ ان میں کچھ ایسے ہیں جو اُردو کی روٹیاں کھاتے ہیں۔

مگر اُسی کی جڑیں بھی کاٹتے ہیں۔ ان میں ایسے ادبی ٹھیکیدار بھی ہیں جو
اُردو کی سرکاری اور غیر سرکاری تقاریب کی قیمت آنک کر معلوم کر لیتے
ہیں کہ اس میں ان کو کتنی شہرت حاصل ہوگی اور کتنی رقم بچ رہے گی۔
اور اس کے بعد وہ پوری تقریب کے ٹھیکیدار بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ،
اسی تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی بڑا ادیب یا شاعر مرے اور اس کے تیجے
اور چالیسویں پر قابض ہو کر دائیں بائیں لوٹ مار شروع کر دیں۔ اس
تیجے اور چالیسویں کی تقریب کو یہ دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں اوّل
سستی شہرت کا شعبہ دوسرے بیت المال۔ اول الذکر جس میں مرنے
والے پر مقالے اور سمینار ہوتے ہیں اُس میں چونکہ لوگ عموماً بہت کم
جاتے ہیں اس لئے وہ بغیر ٹکٹ، رکھتے ہیں اور لوگوں سے ہاتھ جوڑ
جوڑ کر شرکت کی دعوت دیتے ہیں اور تمثیلی مناظرے، مشاعرے اور رسالے
جو مشہور فلمی اسٹار کا میک اپ کرا کے عوام کی روبرو پیش کرتے ہیں
تو اس میں لمبے لمبے ٹکٹ لگا کر عوام کی جیبوں پر ڈاکے مارتے ہیں اور
ساری رقم جیبوں میں رکھ کر سیٹیاں بجاتے اپنے اپنے گھروں کی طرف
لفٹ رائٹ کرتے دکھائی پڑتے ہیں۔ یہی حال آپ کے ساتھ کیا جا
رہا ہے۔ اور جو لوگ ان پر انگشت نمائی کرتے ہیں اُن کو یہ کہہ کر مطعون
اور بدنام کرتے ہیں کہ یہ حضرات اُردو زبان اور اس کی ترقی کے دشمن
ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ نہ صرف زبان مٹ جائے بلکہ اُردو شعراء کا کوئی
نام تک نہ لے۔

تیسرا لڑکا: یہ بیان اُس جملہ کا یاد دلاتا ہے جس میں کانگریس
کے مقابلہ میں ہر مسلم امیدوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے جن سنگھ

نے کھڑا کیا ہے۔

چوتھا لڑکا: مرزا صاحب! آپ کے بارے میں یوں تو بہت سی کتابیں شائع ہو رہی ہیں مگر ایک کتاب عتیق صدیقی صاحب جو غالب اکیڈمی کے سکریٹری ہیں اُنھوں نے لکھی ہے۔ معلوم نہیں آپ کی نظر... سے وہ کتاب گذری یا نہیں؟

مرزا صاحب: ہاں! کل شام ہی کو عتیق میاں نے مجھے وہ کتاب دکھائی جسے پڑھ کر میری روح تازہ ہو گئی۔ میں ان کو اتنا پڑھا لکھا نہیں سمجھتا تھا جتنا اس کتاب کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا۔

دوسرا لڑکا: مرزا صاحب بات یہ ہے کہ انسان غلام ہو غلام صورت نہ ہو۔ اِن کا چھلکا ان کے گودے سے بالکل مختلف ہے اور چہرہ کا کٹ بھی کچھ ایسا ہے کہ جیسے فرشتوں نے بجائے خود بنانے کے ان کے پتلے کو ٹھیلے پر بنوا کر بھیج دیا ہے۔

تیسرا لڑکا: مرزا صاحب! اس کھدر بھنڈار کے زمانہ میں ہمارے ملک کے بہت سے لوگ ان سے بھی زیادہ حسین و جمیل ہیں۔

چوتھا لڑکا: اگر وہ کانگریس میں شامل ہو کر ایک دو مرتبہ جیل ہو آتے تو شکل و صورت کے پیش نظر اگر کچھ نہیں تو کسی صوبے کے چیف منسٹر ضرور ہوتے۔

پانچواں لڑکا: مرزا صاحب اِسی دلّی میں ایک کمیونسٹ شاعر ہے جو اپنی علمی صلاحیتوں میں...... عتیق صدیقی کی طرح اپنا جواب نہیں رکھتا اور جو آپ کی اس صد سالہ برسی کے سلسلہ میں آپ کی زندگی اسٹیج کرنے جا رہا ہے اُس کی صورت بھی دیکھنے والی۔ اب اگر آپ دلّی میں رہ کر

اس سے نہ ملے تو ایسا ہی ہوگا جیسے ایک شخص دلی میں رہ کر قطب مینار نہ دیکھے۔ اس کا ڈھانچہ جوانی میں خاصہ دلکش تھا مگر کمیونسٹوں نے کثرت استعمال سے ایسا بنا دیا ہے کہ اب وہ صرف اکہتر سالہ غالب کا رول ہی ادا کر سکتا ہے۔

مرزا صاحب: بھائی میں ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر تم لوگ میری رہنمائی کرو تو میں اسی وقت چلنے کو تیار ہوں۔

تمام لڑکے: مرزا صاحب چلیئے ہم آپ کو ابھی لیئے چلتے ہیں۔

(ہر طرف سے آوازیں)

کلاس ختم سب لڑکے مرزا صاحب کو ایک رکشا میں بٹھا کر جلوس کی شکل میں ترکمان گیٹ کی طرف روانہ ہوتے ہیں

دلی کے ترکمان گیٹ کے سامنے رنجیت ہوٹل کے مقابل ایک پارک نما پٹی ہے۔ جس کی بے سروسامانی پر دلی کے تمام قبرستان ایک عرصے سے واویلا مچاتے ہوئے ہیں کہ جب راجدھانی کا کوئی گھوڑا ابھی اس پٹی کو قبول کرنے کو تیار نہیں تو پھر یہ زمین انہیں کو دیدی جائے تاکہ مرنے والوں کی ارزانی کے سبب انہیں اپنے یہاں آئے دن جو لوٹے ٹائر اور ستھری ٹائر قبریں بنانا پڑتی ہیں اس سے انہیں نجات مل جائے۔ اس پر مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں ایک خیمہ نصب ہے۔ جس کے چہار طرف قناتیں گھیر دی گئی ہیں تاکہ اس مقدس خطۂ ارض کی خاک پاک کبھی اُڑ کر باہر نہ جانے پائے۔۔ اس واقعۂ ہائلہ سے قبل اکثر بازار سیتا رام کی وہ بن بیاہی راننڈ گائیں جن کو گرانی بردوش آزادی کے دور میں کہیں ہری گھاس میسر نہیں آتی اپنے مران برت رکھنے یہاں جمع ہو جاتی تھیں مگر اب قناتیں کھینچ

جانے کے سبب وہ اس کاروبار سے بھی محروم ہو گئی ہیں - اس خیمہ میں ستم روزگار کا ستایا ایک بلانوش شاعر اور ادیب اپنا جھنڈا گاڑے بیٹھا ہے - اُس نے اس خطۂ ارض کا نام غالب نگر رکھ چھوڑا ہے اور دن میں آرام کرنے کے لئے اس نے اس خیمہ کے اندر فرش بچھوا رکھا ہے اور اس پر ایک گاؤ تکیہ کے سہارے تنہائی میں مرزا اسداللہ خاں غالب کا یہ قطعہ گنگناتا رہتا ہے - ع

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہ بے مثل شاعر مارچ کے مہینہ میں اس خطۂ پاک پر مرزا غالب کا ایک آپرا اسٹیج کرنے جا رہا ہے جس میں وہ مرزا غالب کو ایک غنائی تمثیل کی شکل میں پیش کرے گا - اس بلانوش شاعر کی عمر اگرچہ پچاس پچپن سے زیادہ نہ ہوگی مگر گردش روزگار نے اُلٹے اُسترے سے اس کی ایسی سخت حجامت بنائی ہے کہ چندیا کے بالوں نے فرار اختیار کر کے چندیا کو ایک کھوپڑی کی شکل دیدی ہے - اور اس نے بھی گردش روزگار سے انتقام لینے کے لئے اس پر اپنی حجامت کو اس طرح چھوڑ رکھا ہے کہ اس کے جسم کا رواں رواں دیس کی آزادی کی طرح اپنے جسم پر رواں دواں ہو کر حرکت پر آمادہ ہے - سر کے بالوں نے اپنی مرضی کے خلاف سیاہی کو یکلخت سفیدی میں تبدیل کر کے داڑھی کو اپنی چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہر شخص کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ داڑھی نے

چہرہ کو گودلے لیا ہے۔ داڑھی کے بال چہرہ کو پامال کرتے ہوئے کلّوں سے سینہ پر اُتر آئے ہیں جس سے پورا سینہ ناگا لینڈ بن کر رہ گیا ہے۔ اس بلا نوش کے پورے خیمہ میں ایک گاؤ تکیہ، دو چار بیڑی کے بنڈل اور چند دیا سلائی کی جلی ہوئی تیلیاں اس کی غم خوار ہیں۔ ایک چہرہ جس کی اس بلا نوش نے بالوں میں پال ڈال رکھی ہے کسی زمانہ میں خاصہ شاداب اور پرکشش تھا اب بھی اس کے ماتھے کی اوپری منزل ذہانت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ مرزا غالبؔ نے کیا اپنی ڈومنی کو اس طرح مارا ہوگا جس طرح اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو مار رکھا ہے۔ اُردو انگریزی فارسی اور سنسکرت کے علاوہ ممکن ہے دوسری غیر ملکی زبانوں پر بھی اسکو قدرت ہو۔ مگر رانا اودے سنگھ جیسی خودداری نے اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ اودے سنگھ نے پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا اس نے روس کے میدانوں کو اپنی عفیل کا ریس کورس بنا رکھا ہے نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم۔ پہلے یہ شراب پیتا تھا اب اس کو شراب پیتی ہے۔ نینوا کے میدان میں حسینؑ نے جس طرح اپنے چند رفقاء کی معیت میں یزیدیت کے قلعہ کو پاش پاش کر دیا تھا اسی طرح یہ سید زادہ یزیدان عصر سے نبرد آزما ہے۔ جو نیتاؤں کا چولا بدلے عوام کے خون میں لقمہ ڈبو کر اپنا پیٹ بھر رہے ہیں اس خیمہ پر کوئی زندہ دل سفید چاک سے مندرجہ ذیل شعر لکھ کر بھاگ گیا ہے ؎

تجھے داڑھی نے وہ رتبہ دیا ہے
کہ خود داڑھی نے تجھ کو کھا لیا ہے

بلا نوش جتنا مفلس ہے اتنا ہی مخلص بھی ہے۔ اس نے اپنی قیافہ

شناسی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی غنائی تمثیل کے لئے عوام ہی میں سے کچھ نوجوانوں کو جو باعتبار صلاحیت اس تمثیل کے لئے موزوں ترین ہو سکتے تھے منتخب کرکے اُنہیں ایسی تربیت دی ہے کہ اگر اس تمثیل کو مرزا صاحب خود دیکھ لیں تو نعرۂ تکبیر بلند کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

اس وقت شام کے ۶ بجے ہیں کہ اچانک مرزا غالب زندہ باد کے نعروں کے ساتھ طلباء ایک جلوس لئے خیمے تک قریب پہنچ جاتے ہیں۔ بلانوش گھبرا کر جوں ہی خیمہ کے باہر آیا تو چند نوجوانوں نے اس کے ہاتھ چوم کر کہا بابا مرزا اسد اللہ خاں غالب آپ سے ملنے تشریف لائے ہیں اور یہ کہہ کر مجمع کو چیرتے پھاڑتے بلانوش کو لیجا کر مرزا صاحب کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ بلانوش (جو اس وقت بھی نشہ میں تھا مرزا صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ ہی مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں؟

مرزا صاحب: ہاں مجھ ہی کو اسد اللہ خاں کہتے ہیں۔

بلانوش: Are you quite sure that you are the same person who is known as Asad Ullah Khan Ghalib

ایک لڑکا: مرزا صاحب انگریزی نہیں جانتے۔ ان سے اُردو میں بات کیجئے۔

Then excuse me جناب آپ کے دیا بار کو تو آنکھیں ترستی تھیں۔ Do you know these undesireable persons who are celebrating your cenetary and playing fool with you. They are the bitterest enemy of the language in which you have written so many excellent Verses

مرزا صاحب: کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے؟

بلانوش: طبیعت تو ٹھیک ہے مگر مرزا صاحب سالوں نے جب سے دلّی کو ڈرائی ایریا بنایا ہے اس وقت سے دلی کے شرفاء سانس لینے کو ترس رہے ہیں۔ پرسوں دو پیگ ایک صاحب نے پلائے تھے اس کے بعد سے آج تک رمضان شریف چل رہا ہے کیا عرض کروں آپ تشریف لائے تو آپکی شایان شان کوئی خدمت بھی نہ کرسکا۔ ۶۱ھ میں نواسہ رسول کے ساتھ جو مظالم ہوئے تھے ان ہی مظالم سے آج ان کی اولاد دوچار ہے ــــ ہے ہے یہ بھی کوئی زندگی ہے جس میں ایک انسان پر ۲۴ گھنٹے گذر جائیں اور اسے ایک قطرہ شراب تک میسّر نہ ہو ــ ع

زندگی نام رکھ دیا کس نے؟
موت کا انتظار ہے دُنیا

مرزا صاحب: جی ہاں، میرے زمانے میں بھی جب دلّی والوں پر غدر ٹوٹا تھا ان ہی مصائب سے مجھے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔

بلانوش: مرزا صاحب ابتدائے آفرینش سے شرفاء گردشِ روزگار کا صید رہے ہیں۔ اب بتائیے کہ آپ کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں میں نے جو غنائی تمثیل لکھی ہے اس کے لئے کل پانچ ہزار کا مطالبہ کیا تھا مگر مرزا صاحب، بنیا ہرجا کہ نشیند بنیا است، اسّی ہزار روپے سے جوڈاکومنٹری فلم آپ کی تیار ہوئی تھی وہ تو دلّی والوں نے دیکھی، قسم آپ کے سرعزیز کی، ایسی ایسی فلمیں میرے پیشاب کی دھار سے تیار ہوتی ہیں۔ وہ لوٹ مار ہے کہ خدا کی پناہ، کام کرنے والوں کا دنیا میں کوئی قدردان نہیں۔ مجھے غنائی تمثیل سے عشق ہے مگر ــ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی

میں نے پانچ ہزار کا مطالبہ کیا تو سالوں کے چہرے اُتر گئے اور یوں لاکھوں روپیہ لوگوں کی جیبوں میں پہنچ گیا تو کسی سالے نے سائنس ڈکار تک نہ لی۔ اسی کو کہتے ہیں لکھ لُٹے اور کولوں پر مُہر۔

مرزا صاحب: میں تو دوبارہ پیدا ہونے کا گنہ گار ہوں۔ بلکہ یوں سمجھیئے ؎

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

مجھے تو ان سائنسدانوں نے بجائے بطن مادر کے بطن لحد سے گیس کے سہارے پیدا کیا ہے

بلانوش: مرزا صاحب جس طرح آپ گیس کے زور سے پیدا کیئے گئے ہیں اسی طرح آجکل مشین کے ذریعہ مرغی کے بچے بھی پیدا کیئے جاتے ہیں مگر ان میں وہ مزہ کہاں جو انڈے سینے کے بعد چوزے کے نکلنے میں ہوتا ہے۔ اسی طرح غالباً آپ بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ زندگی میں وہ مزا نہیں جو پہلی مرتبہ بطنِ مادر سے پیدا ہونے میں تھا۔

مرزا صاحب: صاحب یہ تو میں جانتا نہیں جب سے آیا ہوں مجھے لوگ لکھے پڑھے چڑھائے چڑھائے پھر رہے ہیں۔ سات روز سے میرے سپرد موجودہ دور کے طلباء کی اخلاقی مرمت کا کام ہوا تھا خدا جانتا ہے کہ یہ سات روز جس طرح گذرے ہیں۔ اور جو جو باتیں ان نوجوانوں کی زبان سے سنی ہیں وہ میرے زمانہ میں چوہڑے چماروں میں بھی مستعمل نہ تھیں۔

بلانوش: مرزا صاحب میں چاہتا تھا کہ آپ اس غنائی تمثیل کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرما لیتے۔ میں نے اس میں آپ کے چند اشعار لیکر اس بات کو بتلانے کی کوشش کی ہے کہ جب شاعر پہ شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کے تمام جسم پر کیا گذرتی ہے۔ آپ اگر بُرا نہ مانیں تو ایک پھر سے بات عرض کروں کہ شعر کہتے وقت شاعر پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو دردِ زہ میں عورت پر طاری ہوتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شاعر کا ایک ایک مصرع اسکے خونِ جگر سے ترتیب پاتا ہے۔ اور نہ اسے اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھتا آپ نے تو خود اپنے دیوان کی ترتیب دی ہے اور آپکو اس میں اشعار کی کاٹ چھانٹ میں جو تکلیف محسوس ہوتی

ہوگی۔ وہ صرف ایک شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اب اگر زحمت نہ ہو تو آپ کے دیوان کا ایک شعر میں آپ کے سامنے ڈرامائی انداز میں پیش کروں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ نے جس وقت وہ شعر کہا تھا اُس وقت آپ پر کیا کیفیت گذری۔ آپ کا مشہور شعر ہے ؎

نینداس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے شانہ پہ تری زلفیں پریشاں ہوگئیں ہیں

اس کے بعد بلانوش نے ایک گھنٹی بجائی اور سامنے ایک لڑکی اور ایک نوجوان نظر آنے لگا اور بلانوش نے مرزا صاحب کے اس شعر کو اس طرح ٹھمکیاں دیکر پڑھنا شروع کیا کہ مرزا صاحب حیران ہوگئے اور نہ جانے مرزا صاحب پر کیا کیفیت طاری ہوئی کہ ان کے جسم سے جاپک قسم کی کوئی چیز نکلنا شروع ہوئی اور جس وقت بلانوش اس غنائی تمثیل کے مظاہرے میں لگا ہوا تھا مرزا صاحب ہوا میں رفتہ رفتہ تحلیل ہوگئے اور بلانوش نے جب مُڑ کر دیکھا تو چلاّنا شروع کیا کہ مرزا صاحب کیا ہُوئے؟ باہر سے ایک آواز یہ شعر پڑھتی سُنائی پڑی۔ ع

کوٹھے سے اُترے اور وہ زینے پہ آگئے
پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آگئے

غالبؔ اور ڈارون

ایک دن میں مقبول احمد صاحب لاری کے پاس بیٹھا تھا کہ مرزا غالب کی صد سالہ برسی پر بات چل پڑی، مقبول صاحب فرمانے لگے کہ اس میں شک نہیں کہ مرزا غالبؔ، اُردو کے تمام شعراء میں سب سے زیادہ خوش نصیب انسان تھے اور میری دانست میں شاید ہی ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس پر دورِ حاضر کے شعراء اور اُدباء اور محققین نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو اور اب سوائے اس کے کہ لوگ مرزا صاحبؔ اور ڈارون کے عنوان پر طبع آزمائی کریں اور کہیں کہ آخر وقت میں مرزا صاحبؔ ڈارون کے نظریہ کا شکار ہو گئے تھے۔ جس سے سائنس دانوں کے! دربالخصوص ڈارون کے اس قول کی تصدیق ہو گئی کہ پہلے انسان ڈارون زدہ ہوا کرتا تھا اس پر ہر طرف سے قہقہے بلند ہوئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اس محفل میں خیرؔ بہوروی صاحب نے محظوظ ہو کر سب سے زیادہ زوردار قہقہہ لگا کر کہا کہ فرقتؔ صاحب! اب اس پر آپ ہی کچھ لکھیئے تاکہ آپ کا مضمون غالبؔ کے موضوع پر حرفِ آخر ثابت ہو۔

مقبول صاحب کے یہاں سے ۱۱ بجے شب کو اٹھ کر میں مکان آیا اور وہاں

پہنچ کر اپنی چارپائی پر سونے کے لئے لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آگئی اور میں خراٹے لینے لگا، اُس رات میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا اور اس وقت سے اب تک نہ جانے کتنے آدیا۔ اور کتنے محققین سے اس کی تعبیر پوچھ چکا ہوں مگر تشفی نہیں ہوتی۔

مجھے خواب میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مرزا صاحب میرے سامنے کرسی پر بیٹھے مجھ سے دریافت کر رہے ہیں کہ کہیے میری صد سالہ برسی کی تقریب آپ کو کیسی لگی؟" یہ سوال کر کے وہ خاموش ہو گئے۔

اور نہ جانے کیوں تھوڑی دیر بعد وہ کرسی پر سے ایک دم اُچک پڑے اور اپنی پشت پر ہاتھ لیجا کر اور کسی چیز کو برابر کر کے پھر اسی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رہ رہ کر کوئی چیز اُن کے زور سے چبھ رہی ہو۔

میں نے پوچھا مرزا صاحب خیر تو ہے؟ یہ اچانک آپ اُچھل کیسے پڑے؟ آخر بات کیا ہے؟ کیا کرسی کی کوئی کیل چبھ رہی ہے؟ یا خدانا کردہ پھر پرانی بواسیر کی شکایت عود کر آئی ہے۔ جس کا آپ ایک زمانے میں شکار رہے ہیں۔ اس پر مرزا صاحب شرمندہ ہو کر بولے :" نہیں صاحب! ایسی کوئی بات نہیں"۔ اور یہ کہہ کر وہ پھر کرسی سے ایک دم اچھل پڑے۔ اور پشت پر ہاتھ لے جا کر پھر کھڑے ہو کر کوئی چیز برابر کر کے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولے۔ کہ بھئی! بات اگرچہ کہنے والی نہیں ہے۔ مگر آپ سے کیا پردہ، یہ جو چیز تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے اُچکا رہی ہے، اُس کا سلسلہ ڈارون کے نظریے سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ اب کئی سو برس بعد ڈارون کا نظریہ میرے یہاں پھوٹا ہے۔ میں نے حیرت سے کہا

کیا فرمایا آپ نے ؟ بولے مشہور ہے کہ پہلے انسان بندر کے مانند دُم دار
ہوا کرتا تھا مگر کثرت استعمال سے اس کی پشت پر سے گھستے گھستے دُم غائب
ہوگئی اور نکھر نکھرا کر اس نے آدمی کی شکل اختیار کرلی۔ میں نے کہا" یہ تو درست
ہے۔ مگر اس نظریے سے آپ کا کیا تعلق ؟" قدرے خجل ہوکر بولے :" کچھ
ایسا ہی سلسلہ مجھے محسوس ہوتا ہے۔ اور جب اُس ٹیوب میں ہوا بھر جاتی ہے
تو وہ کڑا ہوکر ناقابل برداشت ہوجاتا ہے اور اس بری طرح اس کی نوک پورے
علاقے میں چُبھنے لگتی ہے کہ میں اُچھل پڑتا ہوں ۔" اس کے بعد فرمانے لگے
کہ یہ سلسلہ کچھ چھوٹا موٹا نہیں ہے بلکہ خاصا بڑا ہے۔ اور یہ کہہ کر جو انھوں نے
اپنی خلعت ہٹا کر ایک سانپ جیسی چکنی اور گئو دُم قسم کی ایک آدھ گزی
چیز مجھے دکھائی تو میرے منہ سے مارے خوف کے چیخ نکل گئی ۔ مگر مرزا صاحب
نے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ آپ خوف زدہ نہ ہوں اور مجھے بھوت
پریت قسم کی کوئی چیز نہ تصوّر کریں میں مرزا غالب ہی ہوں ۔ اور میں طب کا
طالب علم کبھی رہا ہوں ۔ بسا اوقات بواسیر کے مسّے جب بڑھ جاتے ہیں تو کبھی
ایسی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ میں نے کہا مرزا صاحب کہیں ایسا تو نہیں ہے
کہ پیدائش کے وقت بچوں کے جو نال نکلی ہوتی ہے اور جسے کاٹ کر زمین میں
دفن کردیا جاتا ہے کہیں وہ نہ ہو؟ اس مرتبہ چونکہ آپ کو سائنس دانوں کی مدد
سے جس حالت میں آپ مرے تھے اسی حالت میں زندہ کرلیا گیا ہے اس لئے
ممکن ہے یہ وہی چیز ہو اور چونکہ بڑھاپے میں اور اس بے راہ روی کے زمانے
میں آپ کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے اس چیز نے اپنی راہ بدل دی ہو

ورنہ مسّا تو اتنی ہارس پاور کا نہیں ہوتا۔ بولے ہوسکتا ہے کہ آپ ہی کا خیال درست ہو۔ اس کے بعد میں نے کہا مرزا صاحب اگر زحمت نہ ہو تو اسے ایک مرتبہ پھر مجھے دکھا دیجئے تاکہ میں اندازہ کرسکوں کہ کہیں یہ باہر سے لگی ہوئی کوئی چیز تو نہیں ہے کیوں کہ ہماری قومی حکومت نے روسی سائنس دانوں کی مدد سے اس مرتبہ دوبارہ زندہ کرواکے آپ کو طلبا میں لکچر دینے کا کام بھی تو سپرد کیا تھا۔ ممکن ہے کہ آج کل کے طلبا کا جیسا کچھ مذاق ہے انھوں نے موقع پاکر یہ چیز آپ کے کرسی پر بیٹھتے وقت باہر سے لگا دی ہو۔ کیوں کہ وہ آج کل اپنے باپ دادا کے ساتھ ایسا ہی بھونڈا مذاق کرتے ہیں اور جب ہندی زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے گا تو جیسی زبان ہے ویسا ہی اس کے پڑھنے والوں کا مذاق بھی ہوگا اور اس مذاق کو ان کے یہاں مذاقِ عالیہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس پر مرزا صاحب نے کرسی سے ذرا اٹھ کر اور پیروں کے دونوں انگوٹھوں کے بل کھڑے ہوکر اس چیز کو جس کا بینڈے جیسا منھ تھا، میرے ہاتھ میں دے دیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بڑی آنت قسم کی چیز براہ راست باہر نکل آئی ہے میں نے اس بینڈے کے منھ کو ذرا دبایا تو اندر سے عجیب و غریب آواز نکل کر فضا میں یہ کہنی گونج گئی " ۱۹۷۲ء کے الیکشن میں کانگریس کو ووٹ دو"۔

یہ سن کر مرزا صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ان کا جسم کانپنے لگا اور وہ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ میں نے کہا مرزا صاحب گھبرانے اور پریشان ہونے کی بات نہیں، کیوں کہ جس طرح آپ کو سیاست کے تحت دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ کے جسم میں بھی ممکن ہے کہ کچھ سیاسی آلات پارٹی پروپگنڈا کے لئے پیوست کرا دیئے گئے ہوں تاکہ آپ کو سیاسی، ادبی، شعری اور خاندانی طور پر سیاست میں استعمال کر کے کانگریسی اپنا

اُلو سیدھا کر سکیں ۔ اس کے بعد دوسرے بڑے مُردوں کو تلاش کیا جائے جو عوام میں ہر دل عزیز رہ چکے ہیں ۔ چناں چہ ۲ر اکتوبر ۱۹۶۹ء تک آپ کے ادبی کارناموں کو نچوڑ کر مسلمانوں سے یہ کہہ کر ۱۹۷۲ء کے الیکشن میں ووٹ طلب کیے جائیں گے کہ ہم نے اُردو کے ایک بڑے شاعر کی صد سالہ برسی منا کر اُردو زبان کو زندہ کیا ہے پھر مہاتما جی کی صد سالہ برسی کا سلسلہ ۲ر اکتوبر ۱۹۶۹ء سے اکتوبر ۱۹۷۰ء تک چلایا جائے گا ۔

اور اس کے بعد پھر سکھ قوم کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے سکھ مذہب کے بانی اور مشہور درویش گورو نانک جی کو استعمال کر کے ۱۹۷۱ء تک سکھ قوم کو ہموار کیا جائے گا اور ۱۹۷۲ء میں ان کو بے وقوف بنا کر ان کے ووٹ حاصل کر لیے جائیں گے ۔ اس کے بعد میں نے مرزا صاحب کی اس چیز کو ان کے پاس لے جا کر جو ذرا زور سے دبایا تو خود مرزا صاحب کا ایک شعر اُس نلکی سے نکل کر فضا میں گونجنے لگا اور کائنات کا ذرہ ذرہ چلا اٹھا ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ مرزا صاحب اب جا کر آپ صحیح معنوں میں شاعر ہوتے ہیں ۔ کیوں کہ اب آپ کے جسم کے جس علاقے کو بھی دبایا جاتا ہے ، اُس سے اٹھ اٹھ کر اشعار فضا میں رقص کرنے لگتے ہیں ۔ مرزا صاحب نے کہا ۔ اچھا اب للہ مجھے کے سرے کو چھوڑ دیجیے کیوں کہ میں کھڑے کھڑے پسینے پسینے ہوا جا رہا ہوں ۔ میں نے کہا مرزا صاحب ابھی اس میں مجھے کچھ اور مادہ رینگتا ہوا محسوس ہو رہا ہے اور یہ کہہ کر جب میں نے درمیان سے اس مٹے کو ہاتھ سے دبایا تو پورا ایک جلوس ہاتھوں میں کاسے لیے کچکچا کر فضا میں نکل پڑا ، اس

جلوس کے آگے آگے کچھ ایسے لوگ دکھائی دئے جن کی شکلیں ہمارے ملک کے وزیروں سے ملتی جلتی تھیں اُن کے ہاتھ میں بڑے بڑے کاسے تھے اور وہ مشہور ادیبوں اور غالب کے نقادوں کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھے دائیں بائیں غالب کی مدح میں شعر پڑھتے اور غالب کے نام پر چندے کی ہانکے لگاتے فضا میں رواں دواں چلتے نظر آئے، وہ چلّا رہے تھے:

چندے چندے چندے
ہم ہیں پیٹ کے بندے

پیچھے سے کوئی دل جلا چلّا کر بولا ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

مرزا صاحب چونکہ کھڑے کھڑے پسینے پسینے ہو گئے تھے اور ہانپنے لگے تھے، اس لیئے میں نے مرزا صاحب کے مسّے کا سرا اُن کے حوالے کرتے ہوئے جو اُسے ذرا اور زور سے دبایا تو ساحر لدھیانوی کی نظم کا آخری شعر اُس میں سے کچھ زیر لب کہتا ہوا نکل کر بھاگا اور چار طرف سے آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں "وہ صبح کبھی تو آئے گی" اور ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔

اس جلوس میں جو اچھا خاصا بڑا تھا میں سات آٹھ ادیبوں اور شاعروں کو اچھی طرح پہچانتا تھا، سب سے آگے مالک رام صاحب تھے، اُن کے پیچھے خبیر بہوروی اور اس کے بعد غلام رسول مہر میاں شیخ اکرام، مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری، سردار جعفری، چودھری وجاہت علی سندیلوی، نسیم کرہانی، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور، قاضی عبدالودود، عتیق صدیقی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، امیر حسن نورانی۔ میں نے اُن سب سے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور مولانا عرشی سے پوچھا، حضرت! یہ آپ یہاں کہاں؟ بولے "ہم

سب یہاں ٹھہر درویش برجانِ درویش کی منزل میں ہیں۔ ابھی دباؤ پڑنے پر پل سے نکل پڑے اتنے میں مرزا صاحب نے جن کا منہ اتنے دیر کھڑے کھڑے بالکل سرخ ہو گیا تھا، اپنی پشت کو سہلانے لگے اور پھر وہ رفتہ رفتہ اپنی اصلی حالت میں آ گیا اور مرزا صاحب جب اپنی پوری قوت سے اس پر بیٹھے تو اس نے ایک سیٹی دی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مرزا صاحب ریل گاڑی کی شکل میں منتقل ہو گئے اور جھک جھک کرتے آسمان کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے آواز دی مرزا صاحب! مرزا صاحب ذرا رکیئے، مگر انہیں نہ رکنا تھا نہ رکے۔

مگر یہ خواب کئی دن تک میرے دل میں کچوکے دیتا رہا اور میں ماہرین غالبیات سے اس کی تعبیر پوچھنے کے لئے بے چین رہا، چنانچہ ایک دن حسن اتفاق سے مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری سے جو اس وقت غالبیات کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں ملا اور میں نے اس خواب کی تعبیر پوچھی، تو مولانا بڑی دیر تک غور و فکر کے بعد بولے کہ صاحب یہ خواب تو بڑا ہی عجیب و غریب ہے مگر غالب کے دیوان میں ایک شعر ہے، جس میں اس کا ایک دھندلا سا اشارہ ملتا ہے۔ میں نے کہا کون سا شعر؟ اس پر مولانا بولے، ایک جگہ پہ مرزا صاحب نے کہا ہے ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اس شعر کا مصرع ثانی قدرے محلِ نظر ہے۔ کہتے ہیں کہ آدمی لاکھ چاہے کہ وہ بندر سے انسان ہو جائے مگر وہ خود اپنے آپ کو نہیں بدل سکتا اب دیکھئے نا کہ قدرت نے پہلے تو دُم گھس گھسا کر تمام انسانوں کو بندر سے انسان بنا دیا

گرمّسا چھوٹ جانے کے بعد اب پھر میرے ساتھ وہی حرکت ہو رہی ہے۔ پھر وہ نکلنا شروع ہو گیا ہے۔ اس پکّی عمر میں مجھے بندر کی شکل میں تبدیل کیا جا رہا ہے اس لئے میں کہتا ہوں "آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا"۔
خدائے سخن میر تقی میرؔ بھی اس مضمون کو ایک شعر میں مجھ سے زیادہ بہتر طریقے پر کہہ گئے ہیں ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

میری دانست میں یہ شعر مرزا صاحب نے اُسی زمانے میں کہا ہوگا جب ان کے مسّا نکلنا شروع ہوا ہوگا، بالکل پکّا ہوگا۔ غالبؔ نے قدرت کے مقابلے میں اپنی کس درجہ بے بسی دکھائی ہے، مگر اب اس بات کی تحقیق کرنا ہوگی کہ یہ غزل مرزا صاحب نے کس زمانے میں کہی ہوگی۔ میری دانست میں یہ غزل انھوں نے اُس زمانے میں کہی ہوگی کہ جب انھوں نے باہر کا سفر ترک کر کے مستقل طور پر گھر پر رہنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترک سفر کی بھی یہی وجہ رہی ہو۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، مرزا صاحب نے کلکتہ سے واپسی کے بعد کوئی سفر نہیں کیا۔ اور کرتے بھی کیسے کیوں کہ مسّے کی موجودگی میں نہ تو وہ انگریزی حکام سے قرینے سے بیٹھ کر بات کرنے کے قابل تھے اور نہ ہی والیان ریاست کے پاس ان حالات میں جا کر باتیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ مسّے کی موجودگی رہ رہ کر اُنھیں کرسی سے اُچکنے پر مجبور کرتی تھی۔ اور یہ ایسی حرکت تھی جس پر ان کو خود قابو نہ تھا۔ لہٰذا مسّے کی نمو یا اُس کے پروان چڑھنے کی تاریخ اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب اس کی تحقیق

ہو جائے کہ یہ غزل مرزا صاحب نے جوانی میں کہی تھی یا عمر ڈھلنے پہ کہی تھی۔
عرشی صاحب کے بیان سے مسّے کے نکلنے کا ایک بھرپور پہلو نکلتا تو ہے
مگر اُن کے اس بیان نے تحقیق کی مزید راہیں کھول دی ہیں۔ اب مسّے
کے عدم وجود پر تحقیق کرنے کے بعد یہ معلوم کرنا ہوگا کہ مرزا صاحب کے کلام
میں یہ شعر جس غزل کا ہے وہ غزل مرزا صاحب نے کب کہی تھی۔ چناں چہ
اب مجھے صرف اتنا دریافت کرنا ہے کہ یہ غزل مرزا صاحب نے کن تاریخوں
میں لکھی تھی۔ اور میں اس سلسلے میں غور کرنے لگا کہ غالب کی زندگی میں
جو واقعات پیش آئے ہیں، عرشی صاحب کے بعد اُن کا سب سے بڑا
ماہر اور محقق کون ہے؟ چناں چہ اس کے بعد میں قاضی عبدالودود صاحب
کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔ قاضی
صاحب چوں کہ مرزا صاحب سے آج کل کسی قدر خفا ہیں۔ لہذا انھوں نے
فرمایا کہ مرزا صاحب اپنے دور کے بہت بڑے سارق تھے، اور اُن کا بیشتر
اُردو اور فارسی کا کلام، فارسی شعرا کے کلام کا سرقہ ہے، لہذا جس طرح
زندگی بھر وہ اپنی فارسی دانی پر نازاں رہے اور انھوں نے اپنے معاصرین
پر اپنی عظمت کا سکّہ جمانے کے لئے ایک ایرانی عبدالصمد کو اپنا استاد
گڑھ لیا اسی طرح ممکن ہے اُن کو اپنے دُم دار ہونے میں بھی کوئی عظمت اور
دوسروں پر فوقیت نظر آتی ہو۔ اور انھوں نے کسی کی دُم کا بھی سرقہ کرلیا
ہو۔ قاضی صاحب کے بعد میں نے کہا چلو چل کر عتیق صدیقی سے جو غالب
اکیڈمی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر دریافت کی
جائے، چناں چہ انھوں نے بھی فرمایا کہ مرزا صاحب کے مسّے پر تو مجھے بھی
شک ہے کیوں کہ جس وقت مرزا صاحب کو روسی سائنس دانوں نے

قبر میں زندہ کیا تھا تو میں اور مالک رام صاحب دونوں مرزا صاحب کے مزار کے پاس ہی موجود تھے اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ روسی سائنس دانوں میں بابا جان غفوراف نے مرزا صاحب کے دادا کی خلعت حکیم عبدالحمید صاحب کو پیش کرتے ہوئے اُن سے گزارش کی تھی کہ جس وقت مرزا صاحب قبر میں اٹھ کر بیٹھیں، اُس وقت یہ خلعت ان کو پیش کر دی جائے کیوں کہ وہ قبر میں برہنہ ہوں گے اور اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ یہ خلعت مرزا غالبؔ کے دادا کے وقت کی روس میں محفوظ تھی، چناں چہ جب مالک رام صاحب نے منہ پھیرے پھیرے مرزا صاحب کا قبر میں خلعت دی ہے تو میں نے خود دیکھا کہ مرزا صاحب نے بجائے دونوں ہاتھوں کو بڑھا کر خلعت لینے کے صرف اپنا بایاں ہاتھ نکال کر خلعت لی اور دوسرا ہاتھ نہ جانے کیوں ان کے عقب میں تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرا جنم لینے سے قبل قبر ہی میں مرزا صاحب کے ہاتھ نکلنا شروع ہو گیا تھا اور اس کی تصدیق خود مالک رام سے بھی کرائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد میں نے امیر حسن نورانی صاحب سے استفسار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ مرزا صاحب کے خطوط سے اس کا پتہ نہیں چلتا لیکن اس سلسلے میں آغا حیدر صاحب نے بی بیگم صاحب کے حوالے سے جو اُن کی گھریلو زندگی کا ذکر کیا ہے اُس میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ آخر عمر میں مرزا صاحب اعصابی تناؤ کا بھی شکار رہتے تھے ممکن ہے کہ اس اعصابی تناؤ سے اُن کا اشارہ ہتے کی طرف ہو۔ اس کے علاوہ چونکہ دلّی آنے کے بعد اُن کے تعلقات ارباب نشاط سے ہو گئے تھے، جس میں وہ ڈومنی بھی شامل تھی جس کے بارے میں مرزا صاحب نے جگہ جگہ

لکھا ہے کہ انھوں نے ایک ڈومنی کو بھی مار رکھا ہے اور چوں کہ یہ تعلقات ادھیڑ عمر میں ہوئے تھے اس لیئے خیال ہوتا ہے کہ جوانی ختم ہونے کے بعد بھی اُن کا خمیر پھولتا رہا ہوگا اور اُس نے عجب نہیں جو مُردار گوشت بن کر بعد میں لمبے مٹے کی شکل اختیار کرلی ہو۔

اس سلسلے میں ایک بات جو چودھری وجاہت علی سندیلوی نے بتائی وہ بھی ایک حد تک قرین قیاس ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ روسی سائنس دانوں نے مرزا صاحب کو عین اس وقت قبر میں زندہ کر دیا ہو جب قبر میں کوئی گوہ پہنچ گئی ہو اور وہ مرزا صاحب کی لاش میں پنجے گڑ دیئے گڑ دیئے مرگئی ہو۔ اور مردہ ہو کر اس نے لمبے مٹے کی شکل اختیار کر لی ہو، کیوں کہ مٹے کا ایک سرا نیولے کے منہ جیسا تھا۔ اس کے بعد میں نے جناب غلام رسول مہر سے خود جاکر اس خواب کا ذکر کرتے ہوئے عرشی صاحب اور دوسرے محققین کی راؤں کا ذکر کیا تو موصوف نے فرمایا کہ میں نے مرزا صاحب کے فارسی اور اردو کے کلام کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ مگر ان کے کسی شعر میں کوئی ایسا اشارہ نہیں
ایک جگہ ان کے خط میں ایک لفظ ایسا ضرور ملتا ہے جس سے اس امر کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے۔ خطوط میں جہاں جہاں اُنھوں نے اپنی بیماریوں کا ذکر کیا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۳ء میں پہلی بار وہ بواسیر کے مرض کا شکار ہوئے تھے۔ اس کے بعد انھیں آنت اُترنے کا مرض ہوگیا اور اس کے بعد کوئی عرب النسل بیماری ہوگئی، چناں چہ ۲۵ فروری ۱۸۵۳ء میں وہ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں" دو دن سے وجع الصدر رہا اور بہت بے چین ہوں"۔ ایک دوسرا خط جو ۴ مئی ۱۸۵۸ء کا ہے اس میں وہ انھیں

ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ " ذات الجنب " کا مرض معلوم ہوتا ہے، عربی میں 'جنب' طرف یا سمت کے معنوں میں آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پسلی کے مرض میں مبتلا رہے ہونگے بعض نسخوں میں " وجع الزنب " کا لفظ ملتا ہے اور عربی میں لفظ زنب کے معنی دُم کے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو وجع الزنب کے معنی دم کی تکلیف کے ہوتے ہیں۔ اور یہ چیز معلوم ہوتی ہے کہ ۱۸۵۸ء میں مرزا صاحب کے مرض الموت سے تقریباً دس گیارہ برس قبل سے شروع ہوا، مگر اس کے بعد اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا اگر یہ مان لیا جائے کہ اس مرض کی بنیاد ۱۸۵۸ء میں پڑی تھی تو کیا عجب ہے کہ اس دس سال میں پھل پھول کر وہ اچھی بھلی نیولے کی شکل اختیار کر گئی ہو اور اس میں ہوا کی پہنچ گئی ہو مگر جناب امیر حسن نورانی اور ڈاکٹر احتشام حسین ڈاکٹر محمد محسن اور آل احمد سرور صاحبان کا خیال ہے کہ یہ لفظ غلط چھپ گیا ہے اور صحیح لفظ جنب ہوگا جس کے معنی پلیوریسی کے ہیں مگر جب اس کے بعد بھی مجھے سیری نہیں ہوئی تو میرے دریافت کرنے پر اکرام صاحب نے فرمایا کہ میں نے مرزا صاحب کی زندگی سے متعلق جتنی مستند معلومات دلّی سے لے کر برٹش میوزیم کی لائبریری میں ہیں ان کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے اس لئے جہاں تک مرزا صاحب کی بیماریوں یا جسمانی امراض کا تعلق ہے، ان کا ذکر مرزا صاحب کے مندرجہ ذیل خطوط میں ملتا ہے۔

۱۔ میر سرفراز حسین ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء

۲۔ منشی شیونرائن ۳ مئی ۱۸۶۳ء

۳۔ منشی ہرگوپال تفتہ ۳ خطوط جو ۱۸۶۳ء میں ہی لکھے گئے، اس میں ایک پر ۲۲ جولائی ۱۸۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔

۴۔ علاء الدین خاں علائی ۱۸۶۳ء (۳ جولائی)

۵۔ تفضل حسین خاں ۱۸۶۳ء

۶۔ قاضی عبدالجلیل جنوں نومبر ۱۸۶۳ء

۷۔ غلام حسین قدر بلگرامی نومبر ۱۸۶۳ء

۸۔ عبدالغفور سرور کے ۲ خطوط، جس میں بیماری کا ذکر ہے مذکورہ بالا خطوط کو پڑھنے کے بعد اتنا پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب اپنی زندگی میں اوپری منزل کے امراض کے مقابلے میں زیادہ تر زیریں بیماریوں میں مبتلا رہے۔ اوپری منزل کے امراض میں یرقان ضعف بصارت، ضعف دل، ضعف معدہ، کا پتہ چلتا ہے مگر زیریں منزل کے امراض میں ماشاء اللہ کون سا ایسا مرض تھا جس میں مرزا صاحب نہ مبتلا رہے ہوں۔ چناں چہ پیچش، بواسیر، مرض بول، قبض، آتشک؛ ذیابیطس، پنڈلیوں اور پاؤں میں ورم، آنت اترنے کے امراض شامل ہیں۔ ان امراض کے علاوہ پھوڑے پھنسی جیسے امراض تو وہ تھے جن سے وہ پورے سال طبع آزمائی کرتے رہتے تھے اور اکثر و بیشتر بارہ بارہ پھوڑے اور پھنسیوں کے بلا شرکت غیرے مالک بنے رہتے تھے۔

آخر میں، میں خیر بہوروی صدر غالب اکیڈمی بنارس کی خدمت میں حاضر ہوا جناب خیر کی ذات گرامی دور حاضر میں ایک ایسی ذات ہے جنھوں نے ساری زندگی غالب پر اتنا کام کیا ہے کہ اب ان کی شکل بھی غالب سے بہت کچھ ملنے لگی ہے۔ اس مردہ پرست ہندوستان نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کی ان کی صلاحیتیں مستحق تھیں۔ میرے خیال میں مرزا غالب کے لباس کی پیمائش سے لیکر انکے جسم کی آرائش تک انکے اعضاء کی کمزوریوں کی جو تول ناپ ان کے پاس محفوظ ہے وہ ان کی گھر والی کی نظر سے کبھی نہ گزری

ہو گی میرا مقصد انکی ادبی کمزوریوں سے ہے۔ وہ مرزا غالب کی بہت سی صلاحیتوں کو
بھی زندگی بھر اپنے سینے سے لگائے رہے مثلاً یہ کہ مرزا غالب کے کوئی اولاد نرینہ نہ
تھی یہی صورت موصوف کے ساتھ ہے۔ جب میں مرزا غالب سے متعلق اپنا خواب
بیان کرنے اور اس کی تعبیر پوچھنے ان کے پاس پہنچا تو موصوف نہ جانے کس غوطہ
میں تھے میں نے سلام عرض کیا تو اس کے جواب میں فرمایا کہ جی نہیں مرزا صاحب
کی بیوی کا نام اسلام النساء نہیں امراؤ بیگم تھا۔ میں نے کہا میں سلام عرض کر رہا
ہوں، بولے کہہ تو رہا ہوں کہ ان کا نام امراؤ بیگم تھا۔ اس کے بعد ہوش میں آکر بولے
ارے بھائی معاف کیجئے گا میں سمجھا کہ آپ غالب کی رفیقۂ حیات کا نام اسلام النساء بتا
رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے جب ان سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو بولے کہ جہاں
تک اس مرض کا تعلق ہے وہ یقیناً مرزا صاحب کو ہوگا کیوں کہ جس روز انکا انتقال
ہونے والا تھا اور ان کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی ان کی عیادت کو گئے
ہیں ان کو اس سے تھوڑی دیر قبل ہوش آیا تھا مگر اس وقت ان کو اپنے لباس کا بھی ہوش
نہ تھا جسم پر پھوڑے پھنسی تھے جس کے سبب وہ صرف ایک باریک تہمند باندھے ہوئے
تھے اور وہ چیز جسے آپ دم سے تعبیر کرتے ہیں وہ بیٹھنے میں تکلیف پہنچا رہی تھی اور وہ
تکیے پر سر رکھے اوندھے لیٹے ہوئے تھے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو منجملہ دیگر امراض
کے اس کی بھی تکلیف تھی۔ اسی لیے وہ اپنے دوستوں کو لکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ انوار الدولہ
شفیق کے نام ۱۷ فروری ۱۸۶۸ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں "نہ مری سخت جانی کی قسم
کھائی ہے اگرچہ تندرست ہوں، ناتواں ہوں، حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا، اگر
اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں جتنی دیر میں قدآدم دیوار اٹھے"۔ اس خط سے اندازہ
ہوتا ہے کہ یہی وہ چیز ہوگی جس نے مرزا صاحب کو اٹھنے بیٹھنے سے معذور کر رکھا تھا اور بیٹھتے
وقت ان کو خاصا وقت دم کے برابر کرنے میں لگتا تھا۔

مٹ جائے گی جس دن مرے سجدوں کی حقیقت

نوٹ (یہ مضمون اُس وقت لکھا گیا تھا جب درمیانی مدت کے الکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور الیکشن جیتنے کے لئے مرزا غالب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھڑائی جارہی تھی)

روزنامہ اخبار تیج مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں "ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے" کے عنوان سے جو ایڈیٹوریل شائع ہوا ہے اس میں میرے ایک طنزیہ مضمون "غالب کا استعمال" پر جو نشتر بازی فرمائی گئی ہے اس کے لئے میں ایڈیٹر صاحب کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔

میرا یہ مضمون بیسویں صدی کے نومبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ فاضل ایڈیٹر صاحب نے اپنے مضمون میں ملک کے مشہور صحافی اقبال سنگھ چیلا پتی راؤ صاحب کے علاوہ پنڈت آنند نرائن ملا، خوشتر گرامی اور پنڈت سندر لال جیسے جیسے قابل لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، عربی کی ایک مثل ہے "الحق مُرّ" یعنی حق بات کڑوی ہے۔

ان حضرات کی باتیں جناب ایڈیٹر صاحب کو بے حد تلخ معلوم ہوئی ہیں اس وجہ سے کہ یہ سب حضرات بدنصیبی سے حق پرست واقع ہوئے ہیں اور ہمیشہ حق بات اس دور میں بھی زبان پر لے آتے ہیں جبکہ ؎

رپٹ لکھوائی ہے اغیار نے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مثلاً اقبال سنگھ کا کہنا ہے کہ جو نام نہاد کانگریسی حضرات مہاتما گاندھی کی صد سالہ برسی منانے جارہے ہیں ان کو مہاتما جی کی برسی منانے کا کوئی حق نہیں، کیوں کہ جب وہ مہاتما جی کی کسی بات پر عمل نہیں کرتے تو ان کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ وہ ان کی برسی منائیں۔ لہٰذا موجودہ دور کے نام نہاد کانگریسی سال بھر تک "مون برت" یعنی سال بھر تک کامل خاموشی اختیار کریں اور مہاتما جی کے بارے میں زبان سے کچھ نہ کہیں۔ اور اس کی تائید انگریزی کے مشہور صحافی چیلا پتی راؤ نے بھی کی ہے۔ اس کے بعد راقم الحروف پر اس جرم میں سب و شتم کی بارش کی گئی ہے کہ اس نے غالبؔ کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں اردو کی بقا کا ذکر کیوں کیا جس کو اس دور کا ہر کانگریسی باستثنائے چند شجرِ ممنوعہ قرار دیتے ہے ان مقتدر ہستیوں کے ساتھ میرا نام آنا درحقیقت میرے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔

اس کے بعد پنڈت سندر لال جی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"پنڈت سندر لال پچھلے عام انتخاب میں اپنے اصلی روپ میں آ گئے اور انھوں نے جا بجا تقریریں کیں۔ کہ چاہے کالے چور کو یا کتے کو ووٹ دے دینا لیکن کانگریس کو ووٹ نہ دینا۔ بہرحال دلّی میں انھیں کامیابی ہو گئی۔"

فاضل ایڈیٹر صاحب کی غالباً "اصلی روپ" سے یہ مراد ہے کہ پنڈت سندر لال جی نے کانگریس کو دلّی میں ناکام بنا کر جن سنگھ کو جتایا اور اپنے جن سنگھی ہونے کا ثبوت دے دیا۔ میرے خیال میں اگر اس وقت مہاتما جی زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی بات کہتے جو سندر لال جی نے موجودہ نام نہاد کانگریس کی شان میں کہی ہے بلکہ اس کو اس سے زیادہ سخت لہجے میں کہتے اور آپ انھیں بھی جن سنگھی کا لقب دینے میں پوری فیاضی سے کام لیتے کیوں کہ گاندھی جی کی زندگی میں ہی جب کانگریسیوں نے اپنے حدود سے

باہر پیر نکالنا شروع کئے تھے، تو اس وقت شاید غیب سے انھیں ہدایت ہوئی تھی کہ وہ کہہ دیں کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد کانگریس کو توڑ کر اُس کا کوئی دوسرا نام رکھ لو ورنہ نام نہاد کانگریسی کانگریس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوٹ مار شروع کر دیں گے، چنانچہ آج ہم اپنے گرد و پیش وہی حال دیکھ رہے ہیں جس کی اُس درویش صفت اور مردِ مومن نے پیشین گوئی کی تھی۔ اس وقت اگر آپ پنڈت سندرلال جی جیسے مردِ مجاہد اور نڈر انسان کو جن کی قربانیوں کے مقابلے میں آپ اپنے موجودہ نام نہاد کانگریسیوں میں سے کسی ایک کو بھی پیش نہیں کر سکتے، جن سنگھی کہہ سکتے ہیں۔ آنند نرائن ملّا جیسے حق گو اور حق پرست انسان کو اگر آپ اس جرم میں معتوب قرار دے سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی دیانت داری، وطن پرستی اور حق گوئی کے بل بوتے پر آپ کی موجودہ نام نہاد کانگریس کے ایک مے فروش کانگریسی امیدوار کو شکست دے کر پارلیمنٹ کی سیٹ جیت لی۔ اگر آپ خوشتر گرامی جیسے دیانت دار، حق گو، اردو پرست اور باطل شکن انسان کو ملک و قوم کا دشمن قرار دے سکتے ہیں، تو ان حضرات کے مقابلے میں راقم الحروف کس شمار و قطار میں ہے، اُس کو اگر آپ فرقہ پرست مسلم مجلس کا رکن یا پاکستان پسند انسان سمجھتے ہیں، تو راقم الحروف کو بخدا آپ سے کوئی شکایت نہیں ؎

ناروا کہیے ، ناسزا کہیے
کہیے کہیے مجھے بُرا کہیے

خوشتر گرامی، پنڈت سندرلال جی، آنند نرائن ملّا، اقبال سنگھ اور چلاپتی راؤ کا جرم صرف یہی تو ہے کہ وہ اِس بداعمالیوں کے دور میں حق بات زبان پر کیوں لائے؟ مگر میں جناب ایڈیٹر صاحب سے بصد احترام گزارش کروں گا کہ وہ ذرا اپنی کرسی چھوڑ کر اور باہر سڑک پہ منہ نکال کر سنیں تو ؎

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

آپ کو راقم الحروف اور اول الذکر تین حضرات کی باتیں اس وجہ سے بھی کڑوی لگی ہوں گی کہ یہ سب حضرات اردو کی بقا چاہتے ہیں، اُس کے خون میں لقمہ ڈبو کر کھانا نہیں جانتے اور نہ بغل میں چھری کٹاری اور منہ پہ رام رام کے قائل ہیں جس کا مسلک اس دور کے نام نہاد کانگریسیوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

اقبال سنگھ اور چیلا پتی راؤ وہ لوگ ہیں جو عوام کے ساتھ وہ کھیل نہیں کھیلتے جو چمگادڑ، چڑیوں اور پرندوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور جیسے نام نہاد کانگریسی کھیل رہے ہیں، یعنی ایک طرف تو وہ دانت دکھا کر اپنے آپ کو چوپایا بتاتے ہیں اور دوسری طرف پرندوں کو اپنے پر دکھا کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ پرند ہیں۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک شخص جو رات تک جن سنگھی تھا سویرے کانگریس کی صف میں شامل نہ کر لیا جاتا اور جس طرف نیچی ڈنڈی دیکھتا اسی طرف قلابازی نہ کھاتا ذرا ایمانداری سے یہ بتائیے کہ موجودہ کانگریس میں کتنے فی صدی حضرات وہ ہیں جو یہ کھیل نہیں کھیل رہے ہیں اور مرحوم کانگریس کے نام پر عوام کا خون نہیں چوس رہے ہیں اور وہ کون سی بداعمالیاں ہیں جن کے وہ سویرے سے شام تک مرتکب ہو کر اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل نہیں کرتے میں نے یا جن سنگھیوں نے اگر ان نام نہاد کانگریسیوں کو "تھری ناٹ تھری" کا خطاب دے دیا تو اس کا تو آپ کو شکر گزار ہونا چاہئے تھا کہ میں نے نام نہاد کانگریسیوں کی سنگین بداعمالیوں کے لئے ایک نہایت ہلکا پھلکا لفظ استعمال کیا۔ ذرا اُس جنتا سے پوچھئے جس کے ووٹوں کے بل بوتے پر یہ نام نہاد کانگریسی ماش کا آٹا لگائے مختلف عہدوں پر چپکے بیٹھے ہیں، وہ تو کانگریس کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں جن کو کوئی شریف آدمی اپنی زبان سے دُہرا بھی نہیں سکتا۔

راقم الحروف چونکہ ایک نیشنلسٹ مسلمان تھا اور ہے، اس لئے پتلی گردن دیکھ کر آپ نے وہی اوچھے ہتھیار اس کے خلاف بھی استعمال کئے اور وہی لقب عطا فرمایا جو آپ کے

جن سنگھی دوست اور خفیہ پیروکار رات دن دُہرایا کرتے ہیں۔ راقم الحروف کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ "پاکستان جانے کا ان کے نزدیک فرقہ پرستی اور اُردو کشی ایک حیلہ ہے"۔ یہ حیلہ کی بھی فاضل ایڈیٹر صاحب نے بہت کہی، گویا ان نام نہاد کانگریسیوں کا کردار اس سے بالاتر ہے۔

سنئے قبلہ! ابھی ایک تازہ واقعہ جناب کی خدمت میں اردو کشی کے سلسلے میں پیش کرتا ہوں جو آپ کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

یہ جو یوپی میں درمیانی مدت کے انتخابات فروری میں ہونے جا رہے ہیں اُس سلسلے میں سنا جاتا ہے کہ جب یوپی کے نام نہاد کانگریسیوں نے من حیث الجماعت ری پبلکن پارٹی سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ری پبلکن پارٹی نے اپنے بارہ نکات کانگریس کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا "کہ اگر یہ شرائط آپ کے لئے قابل قبول ہوں تو ہم ہر جوڑ توڑ کے لئے راضی ہیں تو آپ کی طرف سے کہا گیا کہ ان بارہ شرائط میں سے اگر آپ یوپی میں اُردو کو ثانوی زبان بنانے والی شرط نکال دیں تو ہم گلے گلے پانی آپ کے ساتھ اشتراک عمل کو تیار ہیں"۔ مگر اس پر ری پبلکن پارٹی کے چند افراد جن کے ضمیروں میں ایمان کی تھوڑی سی بھی جان باقی تھی اور آپ جیسے نہیں تھے وہ اس شرط کو نکالنے پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے، آج آپ اس زبان کے جس زبان کے آپ عملاً بدترین دشمن ہیں، شاعر کی صد سالہ برسی منانے کے لئے اِدھر اُدھر چندہ بٹورتے پھرتے ہیں اور دُنیا کو اس فریب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اُردو کے بہت بڑے خیر خواہ، اور علم بردار ہیں، ذرا دُنیا کے سامنے آپ ان حالات کو پیش کر کے پوچھیں تو، کہ وہ آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ دولت اور اقتدار کے پیچھے آپ نے اپنے ضمیروں کا بھی آپریشن کرا لیا ہے اور اب آپ کو نہ تو باپو کی مقدس ہدایات کا پاس ہے اور نہ ملک و قوم کی عزت کا ؎

باپو کے قول و فعل نہ عزت کا پاس ہے   مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

فاضل ایڈیٹر صاحب 'تیج' نے راقم الحروف کے مضمون کی شرح کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے فخرالدین علی احمد صاحب اور محترمہ حمیدہ سلطانہ کا نام بھی لیا ہے، ان کو بھی اس لوٹ مار میں شریک بتایا ہے۔ میں جناب فخرالدین علی احمد صاحب کا بیحد احترام کرتا ہوں اور اسی طرح میں حمیدہ سلطانہ صاحبہ کو بھی اُردو کا ایک مخلص کارکن اور بے لوث خادم سمجھتا ہوں جنھوں نے اپنی زندگی اُردو کے لئے وقف کر دی ہے اور دن رات اُس کی بقا کے لئے فکرمند و سرگرداں رہتی ہیں مگر جس نقار خانے میں وہ لب کشائی کرتی ہیں وہاں طوطی کی آواز سننے والا کون ہے ؟

عزت مآب فخرالدین علی احمد صاحب یا یونس سلیم صاحب یا گوپی ناتھ امن جے پرکاش نرائن، راج گوپال آچاریہ اور ونوبھاوے جیسے مخلص اور محب وطن روز روز نہیں پیدا ہوتے، لاکھوں ہزاروں میں صرف یہی گنتی کے چند رہ گئے ہیں جو آپ کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں۔

جس طرح گاندھی جی پنڈت جواہر لال نہرو کا نام لے کر ایک عرصے تک نام نہاد کانگریسی لوٹ مار کرتے رہے، اسی طرح آج ان گنے چنوں کا نام لے کر نام نہاد کانگریسی جنتا کا خون چوس رہے ہیں اور جب اس پر کوئی انگشت نمائی کرتا ہے تو نام نہاد کانگریسی ان حضرات کو اپنے میں شامل کر کے اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

جناب ایڈیٹر صاحب! اس وقت نام نہاد کانگریسیوں کا معاملہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ننگ خاندان اپنے بزرگوں اپنے نیک اعمال والدین اپنے دوسرے ہر دلعزیز بھائیوں کی دہائی دیکر اپنا قصور بخشوانے کی کوشش کرے اور کہے کہ دیکھئے چچا جان یا ابا جان آپ کے بیٹے یا بھتیجے کے ساتھ یہ زیادتی ہو رہی ہے ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر سوائے اس کے کہ باوا جان یا چچا جان خاموشی اختیار کر لیں اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔

اگر آپ ان کی بداعمالیوں کے خلاف حرف شکایت زبان پر لائیں تو آپ اسطرح

ان کو بھی پاکستانی خیالات کا حامل قرار دیں گے جس طرح کوئی جن سنگھی قرار دیتا ہے۔
اب ظاہر ہے کہ نہ تو مہاتما جی زندہ ہیں، جن کے نام پر نام نہاد کانگریسی بھیک مانگ
سکتے ہیں اور نہ پنڈت نہرو اور لال بہادر شاستری جیسے بے لوث اور محب وطن زندہ
ہیں جن کے نام پر یہ حضرات اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

لہٰذا انھوں نے اردو کے مرے ہوئے شاعروں کی طرف رخ کیا ہے اور ان کو
قبر سے نکال کر ان کی عظمت اور شہرت کے کاندھے پر بندوق چھوڑ رہے ہیں جس میں
سب سے پہلے مرزا اسداللہ خاں غالب کو چنا گیا ہے چنانچہ درمیانی مدت کے الکشن
جتانے اور اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے ان کو مرزا غالب جیسا عظیم شاعر
مل گیا ہے اب ان حضرات کو چاہیئے کہ وہ اپنے اس کام کو جاری رکھیں کیوں کہ اردو کے
بہت عظیم شاعر ابھی اپنی اپنی قبروں میں لیٹے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ دیکھیے
ہمارا نمبر کب آتا ہے اور کب ان کے کاندھے پر رکھ کر آپ بندوق چھوڑاتے ہیں۔

جناب اقبال سنگھ چیلا پتی راؤ نے کیا یہ بات غلط کہی کہ آپ مہاتما گاندھی
کی صد سالہ برسی نہ منائیں کیوں کہ وہ اپنے اعمال و کردار کے پیش نظر اس قابل
نہیں کہ ان کا مقدس نام تک ان کی زبان پر آئے، دراصل مہاتما جی کا نام ان کی
زبان پر آنا مہاتما جی کی انتہائی توہین ہے۔ اور اسی لئے انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ آپ پورے
سال بھر تک گاندھی جی کے معاملے میں بالکل خاموشی اختیار کرلیں۔ اتفاق سے اسی
سے ملتی جلتی بات میرے قلم سے بھی نکل گئی، جس سے آپ اس درجہ چراغ پا ہو گئے
کہ آپ فخر الدین علی احمد صاحب اور اندرا گاندھی سے فریاد پر اتر آئے مگر پہلے اندرا گاندھی
اور ان کے خاندان والوں اور فخر الدین علی احمد جیسا اپنا کردار تو پیش کیجئے اس کے بعد
ان سے فریاد کیجئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کا کردار اتنا بلند ہے کہ موجودہ کانگریس کے ساتھ

ان کا نام لینا بھی ان کی حد درجہ توہین ہے، ذرا کبھی جا کر اندرا گاندھی یا فخرالدین علی احمد سے علیحدہ مل کر دریافت تو کیجئے کہ وہ موجودہ کانگریسیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ کو تو چاہئے تھا کہ ان مقدس حضرات کا نام لینے سے پہلے کئی بار کلی کر لیتے، آپ سے میری مراد آپ نہیں ہیں بلکہ نام نہاد کانگریسی ہیں مگر آپ تو اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ آپ کو خود اپنے اعمال کا احساس باقی نہیں۔ پنڈت سندر لال کی بات آپ کو اس وجہ سے ناگوار گزری کہ اس میں ووٹ کے لین دین کا معاملہ شامل تھا، جس کے بل بوتے پر آپ پوری جنتا کو احمق بنائے ہوئے ہیں، اگر آپ کے ضمیر میں ایمانداری کی ایک ادنیٰ رمق بھی باقی ہے اور آپ غالب کی صد سالہ برسی ایمانداری سے منانے جا رہے ہیں اور اس شاعر کی زبان سے آپ کو ایک فی صدی بھی محبت یا عقیدت ہے تو آپ سب سے پہلے اس بات کا اعلان کریں کہ اردو کو ہم ہندوستان کی ثانوی زبان تسلیم کرتے ہیں اور اس کا اعلان آپ اس روز کریں جب آپ اس بدنصیب شاعر کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھڑانے جا رہے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی اعلان کریں کہ ہم اکبرآباد میں جو غالب کی جائے پیدائش ہے وہاں ایک اردو یونیورسٹی قائم کریں گے اور اردو کے متعلق جو آپ زبان سے فرماتے ہیں اس کو عملی شکل بھی دیں گے اور ان ۲۱ لاکھ دستخطوں کے ساتھ جو میمورنڈم اس سے قبل مرحوم صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اس پر عمل درآمد کروائیں گے، لیکن آپ ایسا کبھی نہیں کر سکتے کیونکہ آپ عثمانیہ یونیورسٹی کی جوبلی منانے میں مصروف ہیں جب آپ کی اس جوبلی منانے کی خبر راقم الحروف نے اخبار میں پڑھی تو اسے بڑی ہنسی آئی کیوں کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی چالیس پینتالیس سالہ زندگی میں علم و ادب کی جو خدمات کی تھیں وہ سب اسی زبان میں تھی جس کے آپ بدترین دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اب آٹھ دس سال قبل اس یونیورسٹی کی شدھی کرنے کے بعد اس کی خدمات جلیلہ کا پچاس سالہ جشن

منانے جا رہے ہیں۔

سبحان اللہ سبحان اللہ! دکھ سہیں بی فاختہ کوّے انڈے کھائیں۔

فتح سرکار کی ہوتی ہے قبضہ ان کا ہوتا ہے علم وادب کی خدمات اُردو زبان کرے اور اُس خدمت سے فائدہ جناب اُٹھائیں، عثمانیہ یونیورسٹی گویا جب سے قائم ہوئی تھی وہ ایسی ہی تھی جیسی کہ اب ہے غدارا جو کچھ آپ ملک اور قوم کے ساتھ یا عوام کے ساتھ کر رہے ہیں وہ کرتے رہئے، کیوں کہ اب آپ کے اعمال کا جائزہ لینے والا کوئی نہیں ہے ؎

جو گُنہ کیجئے ثواب ہے آج

مگر اس کا بھی خیال رہے کہ دُنیا والے اندھے نہیں ہیں اور انھوں نے نام نہاد کانگریسیوں کی طرح اپنے ضمیر دل کا آپریشن نہیں کرالیا ہے۔ آپ مجھے فرقہ پرست کہتے ہیں تو بڑے شوق سے کہئے لیکن افسوس ہے کہ آپ کی رگ و پے میں فرقہ پرستی اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ آپ کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے کیونکہ آپ فرقہ پرستی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اب میں آپ سے چند سوال پوچھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ ان کا سنبھل کر جواب دیں، کیوں صاحب؟

جس وقت ہم نے لکھنؤ میں ۱۹۳۷ء میں آزاد لیگ بنا کر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مسٹر جناح کو سیاہ جھنڈے دکھلائے تھے، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی، جس وقت لکھنؤ میں سیّد علی ظہیر صاحب کی کوٹھی پر مسٹر جناح کے سامنے ہم نے اپنے چودہ نکات پیش کرتے ہوئے اس کا مطالبہ کیا تھا کہ وہ مسلم لیگ سے لفظ "مسلم" نکال کر اس کا نام قوم پرست لیگ رکھ لیں، اس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟

جس وقت ۱۹۳۷ء میں حافظ محمد ابراہیم مرحوم کے الیکشن میں ہم نجیب آباد

گئے تھے اور مسلم لیگ کی قدم قدم پر گالیاں کھا رہے تھے اور ہماری ساری قوم ہم پر تھوک رہی تھی، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ جس وقت شیعہ سنی فسادات کے موقع پر لکھنؤ میں ہم اپنے دوست اور کرم فرما بابو موہن لال سکسینہ آنجہانی کے ساتھ ساتھ محلہ محلہ امن کے جلسے منعقد کر رہے تھے۔ اور فرقہ پرستی کے خلاف زہر اُگل رہے تھے، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ اُس وقت جب ہم لکھنؤ کے گلی کوچوں سے کانگریس کے چار آنے والے ممبر بنا رہے تھے جناب سی بی گپتا اور ان کے حواریین کے ساتھ در در کانگریس کے لئے چندے کی بھیک مانگ رہے تھے، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟

جس وقت کاکوری ڈکیتی کے اسیر چھوٹ کر لکھنؤ پہنچے تھے اور ہم ان کا پُرتپاک خیر مقدم کرنے میں پیش پیش تھے، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ جس وقت مسلم لیگ اپنے پورے شباب پر تھی اور ہم جگہ جگہ اس کی مخالفت میں تقریریں کرتے پھرتے تھے۔ اور پاکستان کی مجوزہ تشکیل کی بدترین الفاظ میں مذمت کر رہے تھے، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ جس وقت مسلم ہوٹلوں میں ہمارے پاس یا ہماری میز پر بیٹھ کر کھانا کھانا عام مسلمان اپنی توہین سمجھتے تھے، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ فیض آباد کی اسمبلی کی شہری نشست کے لئے ۱۹۴۵ء میں جو الیکشن ہوا تھا اس الیکشن میں باوجود سرکاری ملازم ہونے کے جس وقت ہم نے اپنا نام بدل کر اور اپنی سرکاری ملازمت کو روندتے ہوئے ترنگے جھنڈے لہرائے تھے اور مسلم لیگ کی فرقہ پرستی کی مذمت کرتے پھرتے تھے، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ اسی فیض آباد کے الیکشن میں ہماری جیپ پر محلہ ابو سرائے میں جس وقت لیگی مسلمانوں نے ڈھیلوں اور قرولیوں سے حملہ کر کے جب اسے چور چور کر دیا تھا اور ہمیں مار ڈالنے میں کوئی کسر

باقی نہیں رکھی تھی، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ جس وقت، ہم فیض آباد اور نجیب آباد میں مٹی کے کجوں میں چائے پی پی کر اور اُبلے ہوئے چاول اور چنے کی دال چاپ چاپ کر الیکشن لڑ رہے تھے اور لیگی حضرات پلاؤ اور شیر مالیں اُڑا اُڑا کر یہ مشہور کرتے پھر رہے تھے کہ ہم کانگریس کے تنخواہ دار ملازم ہیں اور ہندوؤں کی جوتیاں چاٹ رہے ہیں، اُس وقت ہماری فرقہ پرستی کہاں گئی ہوئی تھی؟ کیا اُس وقت ہم نے مسلمانوں کو سیاہ جھنڈے دکھائے تھے؟ کیا اُس وقت ہم نے مسلم لیگ کو سیاہ جھنڈے دکھائے تھے؟ کیا اُس وقت ہم نے قائدِ اعظم کو سیاہ جھنڈے دکھائے تھے؟ ہم نے اُس وقت بھی فرقہ پرستی کو سیاہ جھنڈے دکھائے تھے اور آج بھی دکھا رہے ہیں۔ اُس وقت بھی ہمارے سامنے محمود و ایاز کی تخصیص نہیں تھی اور آج بھی نہیں ہے۔ آج جب ہم نے اُسی فرقہ پرستی کی طرف اپنے جھنڈے کا رُخ موڑ دیا ہے تو آپ کے مرچیں کیوں لگتی ہیں!

یہ اُردو کُشی یہ فرقہ پرستی اور یہ لُوٹ مار جس کی آج ہم مذمت کر رہے ہیں اُسے آج آپ فرقہ پرستی کا نام دے رہے ہیں اور شبہ فرماتے ہیں کہ ہم مسلم جماعت میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ اور پاکستان جانے کے لئے پر تول رہے ہیں اور ہندو قوم کے ساتھ دشمنی پہ آمادہ ہیں۔

غضب خدا کا آج اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے اور آپ ہم کو فرقہ پرست قرار دے رہے ہیں ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

آپ چاہتے ہیں کہ آج ہم بھی اُن نام نہاد کانگریسیوں کے ساتھ لُوٹ مار میں شریک ہو جائیں جو پینترے بدل بدل کر جنتا کو دائیں بائیں لُوٹ رہے ہیں

آپ اگر پنڈت سندر لال جی کو جن سنگھی کہہ سکتے ہیں، اگر آپ پنڈت آنند نرائن ملا کو قوم و ملک کا دشمن قرار دے سکتے ہیں تو آپ بڑے شوق سے ہم کو "فرقہ پرست"، "پاکستان کا دوست" اور "اسلامی جماعت کا ہونے والا رکن قرار دیں" ہم اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے مگر آج نام نہاد کانگریسی جو ہر روز ایک نیا چولا بدل کر جنتا کی جیبوں پر ڈاکے مار رہے ہیں ان کی ہم کسی قیمت پر بھی تائید کرنے کو ہم تیار نہیں۔ ہم جو مرحوم کانگریس کے ہمنوا دہم پیالہ رہ چکے ہیں اور اس کے ہر درد دکھ میں برابر کے شریک رہ چکے ہیں حق و انصاف کا دامن ہرگز نہ چھوڑیں گے، آپ جانتے ہیں کہ گزشتہ ۲۲ سال میں جن آٹھ دس سو سے اوپر لرزہ خیز فسادات کے تیرہ و تاریک طوفان سے ہم گزرے ہیں اس پر اُف بھی نہ کریں تو یہ غیر ممکن ہے غضب خدا کا ہم اگر نام نہاد کانگریسیوں کی فرقہ پرستی، تنگ نظر، تعصب، ذخیرہ اندوزی اور مختلف چولوں میں لوٹ مار کو لوٹ مار کہیں تو ہم پاکستانی فرقہ پرست متعصب اور مسلم جماعت کے ہمنوا۔ اور آپ لوٹ مار کریں، فرقہ پرستی کا مظاہرہ کریں ہم کو گالیاں دیں تو آپ ملک و قوم کے دوست، وطن پرور اور بہت بڑے شریف۔

ہم آج بھی پاکستان کے ویسے ہی مخالف ہیں جیسے کل تھے۔ ہم آج بھی پاکستانی پروپیگنڈے کو جو ہمارے ملک و قوم کے خلاف ہوتا رہتا ہے، خون آلود نگاہوں سے دیکھتے ہیں ہم چونکہ گاندھی جی کے اصولوں کو ماننے والے ہیں۔ اس لئے ہم ان نام نہاد کانگریسیوں کی ریاکاری کا زہر اپنے حلق سے کسی قیمت پر اُتارنے کے لئے تیار نہیں۔ پھر پاکستان تو آپ ہی نے بنوایا نہ کہ ہم نے، ہم تو آخر دم تک مہاتما جی کی ہمنوائی کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ ہم پاکستان کو کسی حالت میں بھی برداشت نہ کریں گے۔ اب تقسیم قبول کرنے کے بعد آپ ہم کو حقارت

کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ جبکہ ہم جیسے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں ہمارا ظاہر باطن ایک ہے البتہ آپ اقتدار کے نشے میں سب کچھ بھول گئے۔

اُردو کے بارے میں جس دشمنی اور تنگ نظری کا ان نام نہاد کانگریسیوں نے ثبوت دیا ہے اُسے ہم تو ہم دوسری زبان والے بھی 'عبرت' کی نظر سے دیکھ رہے ہیں کیا تماشہ ہے کہ غالبؔ جس زبان میں شاعری کرتے تھے اُس زبان سے آپ کو اتنی نفرت کہ آپ اس کا نام سُننا تک گوارا نہ کریں اور دوسری طرف اُسی زبان کے شاعر کو دُنیا کا عظیم شاعر قرار دے کر دُنیا کو اس دھوکے میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں کہ آپ اُردو زبان کے بڑے ہمدرد بہت بڑے سرپرست اور بہت بڑے دوست ہیں۔ ہمارا شمار پہلے بھی سچے قوم پرست مسلمانوں میں تھا اور آج بھی ہم ویسے ہی قوم پرست، وطن دوست اور ملک و قوم کے خادم ہیں۔

اگر آپ بنگال کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکالنے میں سب سے پہلا ہاتھ انگریزوں کے گریبان تک کس کا بڑھا تھا؟ اور پلاسی کی لڑائی میں کون انگریزوں کے سامنے ستون بنکر کھڑا ہو گیا تھا؟ ۱۸۵۷ء کی دوسری جنگ آزادی میں بھی سب سے آگے بڑھ کر دار و رسن کو ہم نے نہیں تو کس نے چوما تھا؟... آزادیٔ وطن کی خاطر سب سے پہلے تن من دھن کی بازی کس نے لگائی تھی آپ نے یا ہم نے؟ آپ تو کہیں بہت بعد میں آکر اس میں شامل ہوئے ہیں۔

ذرا جنگ آزادی کے اُس محاذ کا نام تو لیجیے۔ جہاں ہم کفن بر دوش نظر نہ آئے ہوں۔ جہاں ہمارے آدمیوں نے مادرِ وطن کی آزادی کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر نہ رکھ لی ہوں، جہاں اپنے آپ کو قید و بند کے مصائب میں مبتلا نہ کیا ہو اور جہاں ہم پھانسیوں کے تختوں پر ہنستے اور مسکراتے نہ چڑھ گئے ہوں، جلیانوالہ باغ

کے ذرّوں سے پوچھئے کہ اس نے ہمارے کتنے ساتھیوں کی لاشوں کو اپنی آغوش میں تڑپتا ہوا دیکھا ہے؟ حسین احمد مدنی کی روح سے دریافت کیجئے کہ اس نے "مالٹا" میں آزادیٔ وطن کی راہ میں کن مصائب کو نہیں جھیلا اور کس کس طرح آزادیٔ وطن کی خاطر اپنے ہاتھوں میں کیلیں نہیں ٹھکوائیں پھر اُسی حسین احمد مدنی کے مدرسہ دیوبند پر چھاپہ مار کر آپ نے اس کی تلاشی لی اسے غدّاروں کا اڈّہ قرار دیا۔ ان جاں نثاروں کو حقیر و ذلیل کیا۔ ۱۹۴۲ء میں قلعہ احمد نگر کے اس مجاہد سے پوچھئے جس نے انگریزوں کے سامنے رہائی کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا اور اپنی چہیتی بیوی اور اپنی حقیقی بہن کا آزادیٔ وطن کی خاطر تنہا دم توڑنا گوارا کرلیا۔

برطانوی سامراج میں جن پھانسیوں کے تختوں پر حب الوطنی کے جرم میں شہیدانِ وطن کو پھانسیاں دی گئیں اُن تختوں سے دریافت کیجئے کہ کیا انھوں نے اشفاق اللہ کو مُسکراتے اور پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا؟

امپھال کے میدانوں اور برما کی گھاٹیوں سے پوچھئے کہ آزادیٔ وطن کی خاطر شہیدِ وطن سبھاش چندر بوس کی قیادت میں ہمارے کتنے ساتھیوں نے اپنے آپ کو دُشمن کی گولی کا نشانہ بنوایا؟ اور ان کے جسم سے نکلے ہوئے خون سے ہماری حب الوطنی اور ہماری وفاداری کی داستان سنیئے، پلاسی کی جنگ سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگ تک اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک انگریز دُشمنی کی وہ کون سی تحریک تھی جس میں ہم آپ کے برابر شریک نہیں رہے مگر آزاد ہونے کے بعد آپ نے ہماری ساری قربانیوں کو بھلا دیا اور اب آپ کو لے دیکر اگر کوئی بات یاد ہے تو صرف یہ:

"کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا مسلماں تھا"

آج نام نہاد کانگریسی ہم سے وفاداری کا حلف اُٹھواتے پھرتے ہیں

آپ کی دعوتیں ہوتی تھیں آپ کا قدم قدم پر احترام کیا جاتا تھا اور جس وقت ہم آپ کے دوش بدوش جیل جاتے تھے تو ہم کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ہم پر تھوکا جاتا تھا۔ اب بتایئے کہ ملک اور قوم کے وفادار آپ ہیں یا ہم۔

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

خدا کی شان کہ آج آپ ہم کو پاکستانی رجحانات کا حامل بتائیں فرقہ پرست کہیں اور حکومت کا غدّار قرار دیں۔ ذرا اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھیے کہ غدّار آپ ہیں یا ہم۔ وہ محسن کش جو آج ہم پر مُلازمتوں کے دروازے بند کرائیں ہم کو اُس حکومت کا دشمن قرار دیں جس کے کچھ ارکان کل تک ہمارے دوش بدوش آزادیٔ وطن کی جنگ میں شریک تھے۔ بڑے شریف، بڑے قوم پرست اور مُلک و قوم کے خادم کہلائیں، غضب خدا کا وہ جن کو ہم نے اپنا سمجھا تھا۔ جن کے پسینے کی جگہ ہم نے خون بہایا تھا۔ آج ہم ان کی بربادی کے درپے ہو جائیں گے ان کی بیخ کنی کریں گے ان کے خلاف زہر اُگلیں گے ؎

کیا اس لئے تقدیر نے چُنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

———— •●• ————

ہماری وفاداری کا ثبوت مانگتے ہیں۔ ہماری وفاداری کا ثبوت کشمیر کی گھاٹیوں اور وہاں کے میدانوں سے طلب کیجئے جنھوں نے بریگیڈیر عثمان کو آزادئ وطن کی راہ میں تڑپتے اور دم توڑتے دیکھا ہے۔ اور مادرِ وطن کی عزت و ناموس کو بچانے کے لئے اپنے کو قبائلیوں کی گولیوں کا نشانہ بنوایا تھا۔

کیا اشفاق اللہ خاں کے ہاتھوں میں جو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں آزادئ وطن کی خاطر پڑی تھیں اُن کی جھنکار آپ کو سُنائی پڑتی ہے؟ کیا عبدالحمید کی بیوہ اور اس کے بچّوں کی آوازیں آپ کو سُنائی پڑتی ہیں۔ نہیں سنائی پڑتی ہونگی بلکہ عجب نہیں کہ وہ آوازیں اور جھنکاریں آپ کو گراں گزرتی ہوں اس میں تعصب کی بُو آتی ہو۔ آج آپ ان نام نہاد کانگریسیوں کی حمایت فرما رہے ہیں جن کی آزادئ وطن کی راہ میں کبھی نکسیر تک نہیں پھوٹی اور جو ہماری قربانیوں پر خاک ڈال رہے ہیں ؎

یاد کرنا ہمارا بھول گئے

بھول جانا ہمارا یاد رہا

شاید اس کا آپ کو علم نہ ہوگا کہ محض کانگریس دوستی کی بنا پر ہم نے اپنے خاندان میں شدید اختلافات مول لئے ہماری شادی اور غمی میں ہمارے قریب ترین عزیزوں نے آمد و رفت ترک کر دی ان سے ہمارے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور انھوں نے اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادی ہمارے یہاں کرنے سے انکار کر دیا آپ کو یاد نہیں کہ جب آزادئ وطن کی تحریک کے سلسلے میں آپ جیل جاتے تھے تو آپ کے گلوں میں گجرے پڑے ہوتے تھے آپ کی رخصتی پر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوتے تھے اور جیل سے واپسی اور رہائی پر آپ کا پُرتپاک خیر مقدم ہوتا تھا۔

غالب اور ابوالکلام

"انیسویں اور بیسویں صدی میں دو ممتاز شخصیتیں ہمارے دیس کی مٹی سے اٹھیں، جو اس برصغیر کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکیں اور جریدۂ ہند پر اپنے دوام کی مہریں ثبت کیں — میرزا اسد اللہ خاں غالب اور محی الدین احمد ابوالکلام آزاد ہیں۔

"مولانا آزاد میرزا غالب کے قریبی پیش رو تھے۔ انھوں نے دقت نظر سے غالب کا مطالعہ کیا۔ اور اس حد تک انکے اثرات قبول کئے کہ آواگون کا کوئی قائل ہو تو اسے گمان ہو سکتا ہے کہ غالب ہی کی بیقرار روح نے ابوالکلام آزاد کے قالب میں دوبارہ جنم لیا تھا۔"

عتیق صدیقی نے، اسی خیال کے پیش نظر، غالب سے متعلق مولانا آزاد کی تمام تحریروں کو، مزید حواشی کے ساتھ، ایک کتاب کی لڑی میں پرو کر ایک مسلسل مربوط داستان کی شکل دے دی ہے۔

Rs. 15.00

مکتبہ شاہراہ، دہلی